# مضامینِ شرر

یعنی

## مولانا مولوی محمد عبد الحلیم صاحب شرر لکھنوی

مد ظلہ العالی

کے تمام شاعرانہ و عاشقانہ، محققانہ و فلسفیانہ، تاریخی و جغرافی، علمی و ادبی مضامین، دنیا کے مشہور اکابر اور نامور خاتونوں کے سوانح عمری اور کل متفرق تحریریں جن کی فاضل و محقق موصوف نے از سرِ نو نظر ثانی فرمائی ہے

جنھیں

سید مبارک علی شاہ گیلانی مولوی فاضل مزنگ لاہور نے چھپوایا

# تاریخی واقعات پر خیال آرائی

مصنفہ
مولینا مولوی محمد عبدالحلیم صاحب شرر مدظلہ

# فہرست مضامین شرر

## جلد (۶) ششم

# تاریخی واقعات پر خیال آرائی

# مضامین شرر جلد ششم

## تاریخی واقعات پر خیال آرائی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

بیدرد ہیں جو درد کسی کا نہیں رکھتے
ایسے بھی ہیں یارب کہ تمنا نہیں رکھتے

اصل تو یوں ہے۔ کہ ایسا کوئی نہیں جسے کسی کی آرزو نہ ہو۔ دلِ بیتاب جو رقصِ بسمل کا تماشہ دکھایا کرتا ہے۔ اس کی سیر دیکھنے والی یہ تمنائیں ہی ہیں۔ جس دل کو دیکھئے کسی نہ کسی امید کو پہلو میں لئے بیٹھا ہے۔ نیچرل سماں کی نیرنگیاں فقط آرزوؤں کے اختلاف سے ہیں۔ ہر آرزو حقیقت میں ایک نیا مزار رکھتی ہے۔ اسکا لطف کچھ اسی کو خوب معلوم ہوتا ہے۔ جس نے اپنی زندگی اس کی نذر کر دی۔ یہ معمولی ثبوت ہیں۔ کہ روز صبح کو دامنِ شمع پروانوں کا گنج شہیداں ہوتا ہے۔ اور بسترِ نازاں مرجھائے پھولوں کی حسرت گاہ ہوتا ہے۔ جنہوں نے اپنی تر و تازگی کسی کی پیاری نیند اور بے تکلفی کی کروٹوں پر قربان کر دی۔ مگر وہ موقع ستم ڈھا دیا کرتے ہیں۔ جہاں ہجوم آرزو نے کوئی غیر معمولی حسرتناک کرشمہ دکھایا ہو؎

یہ سچ ہے۔ کہ آرزو سے کوئی دل خالی نہیں۔ مگر اُن لوگوں کی بیصبرانہ آرزومندی کا
اثر عجب دلخراش سماں دکھا دیتا ہے۔ جن کے دل سے لگی ہو۔ کہ کسی ارمان کو نکال ہی
کے چھوڑیں۔ انبوہ عاشقاں کس بیتابی کے ساتھ اپنی زندگی کو ایک ہی کام میں صرف کر
رہا ہے۔ دردمندان قوم کس بیقراری و شوق سے ہر وقت اصلاح قوم ہی کی فکر میں پڑے
رہتے ہیں؟ اور سب کو جانے دیجئے۔ زاہدان شب زندہ دار نے چونکہ اپنے حوصلوں کو فقط
ایک ہی تمنا کے ساتھ وابستہ کر رکھا ہے۔ اسلیئے اُن کے طرز بیان میں کس قیامت کا اثر
ہے۔ زاہدان تردامن کس مخالفانہ سنگدلی کے ساتھ شریک محفل وعظ ہوتے ہیں۔ مگر دو
ایک کا دل پسیج ہی جاتا ہے۔ حقیقت میں جب آرزومندی کسی حسرتمندانہ پیرائے
میں ظاہر کی جاتی ہے۔ تو بہت کم لوگ ہوتے ہیں۔ جن سے ضبط ہو سکتا ہو۔ وہ نالہ
کشی کی جگر خراش صدائیں جو کسی بیکس اور بدنصیب بیوہ کے کلبۂ احزان سے آرہی
ہیں۔ کس درجہ موثر ہیں۔ کہ سننے والوں کا بے اختیار کلیجہ پھٹا جاتا ہے۔ وہ ناسمجھ اور
معصوم بچہ جوادروں کو دیکھکر اپنے باپ کی لاش کے سرہانے اسی معمولی طریقے سے
رو رہا ہے۔ جس طرح کبھی ضد پر آکر ناز برداروں کی گود میں مچل مچل کے رویا کرتا تھا
اس کے رونے کی آواز شرکائے حلقۂ ماتم کو اُس کے باپ کی جوانی کی موت بھی بھلائے
دیتی ہے +

جہاں تک غور کیا جائے۔ دنیا بے درد دل سے خالی معلوم ہوتی ہے۔ ایسا کوئی نہیں ہے
۔ اُسے بیکسوں کی آہ پر ترس نہ آجائے۔ مگر بعض حالات یقین دلا دیتے ہیں۔ کہ واقعی
بعض سنگدل بھی ایسے ہوتے ہیں۔ کہ کسی کی مایوسانہ صورت اُن پر کچھ اثر نہیں کرتی +
یہ جو قرآن میں آیا ہے۔ وَاِذَا الْمَوْءٗدَةُ سُئِلَتْ (جسوقت زندہ دفن کی گئی لڑکی کی نسبت
سوال کیا جائیگا) اس کا حال سرسری طور پر تو سب ہی کو معلوم ہے۔ مگر اُس اصلی سماں کی
کیفیت کسی کو نہ معلوم ہوگی۔ جب کوئی زندہ لڑکی خود اپنے باپ کے ہاتھ سے تہ خاک
کی جاتی ہو۔ جاہلیت کی رسموں میں جہاں اور سنگدلیاں تھیں۔ وہاں ایک یہ بھی تھی
عرب کا زمانہ جاہلیت تو تھا ہی۔ اس سے پہلے ہندوستان میں بھی ایسے بہت سے قسی القلب
موجود تھے۔ جنھوں نے اپنے لخت جگر کو خود اپنے ہاتھوں زبردستی خاک میں ملا دیا +
دیکھو یہ اُس سنگدلی کا ایک معمولی واقعہ ہے۔ جو کتنوں کو بیتاب کر دے گا۔

جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کے مقدس زمانے میں ایک شخص ایمان لایا۔ وہ بیٹھا ہوا تھا۔ باتوں باتوں میں ذکر آگیا۔ کہ لوگ کتنے بڑے سنگدل ہیں۔ کہ لڑکیوں کو زندہ دفن کر دیا کرتے ہیں۔ اس پر اس شخص نے ایک آہ سرد کھینچی۔ اور کہنے لگا۔ اوروں کا تذکرہ کرنے سے کیا حاصل۔ میں خود اپنا حال بیان کرتا ہوں۔ عزیزوں میں ایک عجب پیاری صورت کی لڑکی تھی۔ کہ نظر دوچار ہوتے ہی دل بے اختیار ہو گیا۔ اس کی ہمکناری کے لئے مجھے زیادہ مصیبت نہیں اٹھانا پڑی۔ چند ہی روز میں اس کے ساتھ شادی ہوگئی میری پیاری بی بی نے ایسی شکل و صورت پائی تھی۔ کہ میں اپنے اوپر آپ ناز کیا کرتا تھا اس بی بی سے پے در پے میری نو لڑکیاں ہوئیں۔ ان سب کو میں خود لے گیا۔ اور اپنے ہاتھ سے خاک میں زندہ دبا دیا۔ ان دنوں دل کچھ ایسا سخت تھا۔ کہ ان سب لڑکیوں پر مجھے ذرا بھی رحم نہ آیا۔ اور نذر نے کے طور پر سب کو میں نے نہ سپرد ہونے والی موت کے حوالے کر دیا۔ اتنا بیان کر کے وہ شخص بیتاب ہو گیا۔ اور کہنے لگا: "مگر ہائے دسویں کا معاملہ ایسا تھا۔ کہ آج تک اس کا زخم میرے دل پر موجود ہے۔ جب کبھی یاد کرتا ہوں بے اختیار دل بھر آتا ہے۔ اور طبیعت قابو میں نہیں رہتی۔ ان لڑکیوں کے زندہ دفن کرنے کے چند روز بعد میں نے تجارت کی غرض سے ایک سفر کیا۔ تیرہ چودہ برس کے بعد پھر وطن میں آیا۔ ایک روز اتفاقاً کسی دوست آشنا کے پاس سے گھر میں آیا۔ تو کیا دیکھتا ہوں۔ کہ ایک نہایت حسینہ و جمیلہ دوشیزہ لڑکی میری پیاری بی بی کے پاس بیٹھی ہوئی ہے۔ اس لڑکی کی صورت دیکھتے ہی بے اختیار میرے دل میں محبت پیدا ہو گئی۔ آخر ضبط نہ ہو سکا۔ اور میں نے اپنی بی بی سے پوچھا۔ یہ کون ہے۔ اس نے تھوڑی دیر تک پس و پیش کر کے کہا: "یہ تمہاری بیٹی ہے۔ جن دنوں تم سفر پر گئے تھے۔ ان دنوں میں حاملہ تھی۔ کچھ دن کے بعد لڑکی پیدا ہوئی۔ تمہارے خوف سے میں نے تمہیں اطلاع نہ کی۔ اور اب تک چھپائے رکھا۔ یہ سن کر میں دم بخود رہ گیا۔ اس لڑکی کو دیکھتا ہوں۔ تو صورت و شکل میں اپنی آپ نظیر تھی۔ سر سے پاؤں تک ہر قسم کے زیور سے آراستہ تھی۔ الغرض اس وقت میں خاموش ہو رہا۔ اور اس کے مانوس بنانے کی کوشش کرنے لگا۔ دو ہی چار روز میں وہ میرا دم بھرنے لگی۔ اور گویا میری صورت پر عاشق ہو گئی۔ اس وقت اس کا سن کوئی چودہ پندرہ برس کا ہوگا

چھ سات روز کے بعد ایک دن کچھ لالچ دلا کر میں نے اُسے اپنے ہمراہ لیا۔ کوہستان میں جا کر ایک گڑھے میں جسے میں نے پہلے ہی سے کھود رکھا تھا۔ ڈھکیل دیا۔ اور اوپر سے مٹی ڈالنے لگا۔ بس کیا کہوں۔ کہ وہ کیسا جگر خراش موقع تھا۔ یاد کرتا ہوں تو رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ صاحبو میری بیٹی برابر رونے کی آواز سے پکار پکار کر مجھ سے کہتی جاتی تھی۔ کہ "ابا جان کیا مجھے یہیں چھوڑ جاؤ گے؟" اور میں برابر مٹی ڈالتا جاتا تھا۔ اُس مٹی سے جب تک اُس کی مہین اور نازک آواز آتی رہی۔ میں خاک ڈالتا رہا یہاں تک کہ آواز آنا موقوف ہو گئی۔ و میں اپنے گھر چلا آیا۔ اُس وقت سے آج تک وہ صدمہ نہیں بھولا ہے۔ اور ہمیشہ یاد کر کے اپنی اُس سنگدلی پر رو لیا کرتا ہوں۔ یہ ایسا قیامت کا واقعہ ہے۔ کہ سننے والوں کے کلیجے میں بھی ناسور پڑ جاتا ہوگا۔ اس میں اتنا درد کس لئے ہے۔ اسو جہ سے کہ جو آرزوئیں اُس لڑکی کے ساتھ خاک میں ملائی گئیں اُن کے خاک میں ملنے کا سماں ایک نئی کیفیت سے دکھایا گیا ہے۔ اِن سنگدلیوں کے نمونے اب ڈھونڈے جائیں۔ تو کہیں نہ ملینگے۔ اس مہذب زمانے میں انصاف سے پوچھئے۔ تو اُس قسم کے سینے جن میں دردمندی کا بالکل اثر نہ پایا جاتا ہو کہیں نہ نظر آئینگے۔ اس سے زیادہ کیا ہوگا۔ کہ غلامی کی رسم بھی زمانے نے اُٹھا دی۔

واقعی ہمارے۔ یوں کا درد ان دنوں بڑے کام آ رہا ہے۔ محلے میں کوئی فاقے سے ہو تو جب تک اُسے نہ کھلائینگے مُنہ میں دانہ نہ جائے گا۔ کسی طرف سے رونے کی آواز سن لینگے تو بیتاب ہو جائینگے۔ جب تک دلدہی نہ کر لیں گے۔ چین نہ پڑے گا۔ قرب و جوار میں کوئی بیوہ ہوتی ہے۔ تو اُس کی خبر گیری کو کوئی نہ کوئی موجود ہی ہو جاتا ہے۔ شہر میں کسی غریب کے گھر میت پڑی ہوتی ہے۔ تو دو چار دردمند اُٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ اور جس طرح بن پڑتا ہے تجہیز و تکفین کی فکر کر دیتے ہیں۔ یہ سب کچھ ہے۔ مگر اُس موقعہ پر بڑی صراحت کے ساتھ ہمدردیوں کا ثبوت ہو جاتا ہے۔ جب مسجدوں کی سنسان اور رفتہ رفتہ صورتیں نظر آ جاتی ہیں۔ اور کوئی خبر لینے والا نہیں ملتا۔ قوم سے زیادہ کون ہمدردی کے قابل ہوگا۔ مگر افسوس اُس کی جانب سے سب بے پروا ہیں۔ ہر موقع پر کسی نہ کسی کو ترس آ جاتا ہے۔ مگر قوم کی حالت روز بروز گرتی جاتی ہے۔ اور کوئی دو آنسو بہانے والا نہیں۔ خدا ہماری قوم کو دل دردمند دے۔

# آہِ پُرتاثیر

کہتے ہیں جس وقت لشکرِ اسلام شام سے گذر کر حدودِ افریقہ میں داخل ہوا۔ اُس وقت اگرچہ مسلمانوں کی جانب سے سب سلطنتوں کو کھٹکا سا پیدا ہو گیا تھا۔ مگر مصریوں نے اُنکی بہادری اور استقلال کا امتحان بھی لیا۔ یہ سب ہی جانتے ہیں۔ کہ ساری سلطنت مصر اسی ایک امتحان کی نذر ہو گئی۔ مگر انصاف ہاتھ سے نہ دینا چاہیئے قبطی لوگ بھی اپنی مردانگی اور ثابت قدمی دکھانے میں ناکامیاب نہیں رہے۔ یہ وہ سلطنت تھی جس کے تحفوں اور ہدیوں نے ایک حیثیت سے اسلام کو اُس کا احسان مند بنا دیا تھا۔ یہ بات بھلا اسلام کو بھول سکتی تھی۔ کہ گذشتہ بادشاہ مصر نے اُن کے سچے پیغمبرؐ کی خدمت میں بہت سے ہدیے بھیجے تھے۔ مصر پر فوج کشی کرنے کے ابتدائی زمانہ میں عربوں کی وفادار تلوار بہت رُک رُک کے چلی۔ مگر جب معلوم ہو گیا۔ کہ وہ پہلا بادشاہ مصر پیوندِ زمین ہو گیا۔ اور عنانِ حکومت اب ایسے شخص کے ہاتھ میں ہے جس سے انہیں ذرا بھی اُمید نہ رکھنا چاہیئے۔ تو بے تکلف انہوں نے قدم بڑھایا۔ اور چند ہی روز میں فراعنہ کے جاہ و جلال پر گمنامی کے پردے پڑ گئے +

جس مورخ کی زبانی ہمیں مصر کی لڑائیوں کا حال معلوم ہوا۔ وہ نوبت کچھ بیان کرتا ہے۔ لیکن ہمیں یہاں ایک خاص واقعے سے غرض ہے۔ جو فریقہ کی آخری لڑائیوں میں بیان کیا گیا ہے۔ لشکرِ اسلام ایک عظیم الشان قلعے کا محاصرہ کیئے پڑا تھا اور روز فریقین میں لڑائی ہوتی تھی۔ اس قلعے کی عظمت فقط اسی قدر ظاہر کر دینے سے معلوم ہو جائیگی کہ عربوں کی وہ آزمودہ کار اور دھن کی سچی فوج جس نے شام و عراق اور روم و شام کے اعلٰے سے اعلٰے قلعے دو ہی چند حملوں میں مسمار کر دیئے تھے۔ اُسکو یہاں مہینوں مصیبتیں جھیلنا پڑیں۔ اہل قلعہ کو قلعے کے استحکام کے باعث اپنی اطمینانی حالت پر اتنا یقین تھا کہ قلعے پر ناز کرتے تھے۔ غرض روز کی معمولی لڑائی طول کھینچتی جاتی تھی۔ اور کوئی نتیجہ نہیں ظاہر ہوتا تھا +

انہیں قیامت خیز دنوں میں سے جو اُس قلعے کے محاصرے میں گذرے۔ ایک روز کا ذکر ہے۔ کہ قلعے والے باہر میدان میں نکل کر صفیں باندھے کھڑے تھے۔ ادھر لشکر اسلام کا

یہ شخص اپنے جوش و خروش کو دبائے دشمنوں کی صورت دیکھ رہا تھا۔ حاکم قلعہ گھوڑا بڑھا کر آیا۔ اور پکار پکار کے کہنے لگا۔ "اگر اپنی خیریت چاہتے ہو۔ تو جس طرف سے آئے ہو۔ اُسی طرف چلے جاؤ۔ یہ قلعہ اُن قلعوں میں نہیں ہے۔ جن سے تمہیں سابقہ پڑ چکا ہے۔ اور یہ وُہ فوجیں نہیں ہیں جنہیں تم نے کچا کر لیا ہے۔ ہزار برس بھی پڑے رہوگے۔ تو کچھ نہ ہوگا۔ کیا تمہیں نظر نہیں آتا۔ کہ کیسی مضبوط اور مستحکم دیواریں تمہارے حوصلوں کو روکے ہوئے ہیں" امیر لشکر اسلام شرحبیل بن حسنہ نے بڑھ کر کہا "خدا کے غضب سے ڈرو۔ اور ان دھوکے کی ٹٹیوں پر نہ اتراؤ۔ اگر حق و باطل کی کچھ تمیز ہے۔ تو اُس برگزیدہ دین کو قبول کرو۔ جسکے اصول تمہارے ان قلعوں سے کہیں زیادہ مضبوط ہیں۔ خدا کا غضب نازل ہوگا۔ تو یہ سب چیزیں رکھی رہ جائینگی۔ نہ قلعہ کام آئیگا نہ فوج سے کام نکلیگا" جواب ملا۔ "اگر کچھ دعوے ہے تو اس قلعہ کو فتح کر لو" کہا گیا "فتح کیسی اگر مشیّتِ ایزدی ہے۔ تو قلعے کی دیواریں خود بخود گر پڑتی ہیں" آواز آئی "دیکھا نہیں ہے۔ دعوےٰ ہے تو بسم اللہ۔ دیکھیں کس طرح دیواریں گر پڑتی ہیں۔ شرحبیل بن حسنہ نے ہاتھ اُٹھا کر اللہ جلّ شانہٗ کی طرف خطاب کر کے کہا "الٰہی اب تو تمرد حد سے گذرا جاتا ہے" ہنوز دعا پوری بھی نہیں ہوئی تھی۔ کہ قلعے کی دیواریں ٹوٹ ٹوٹ کر گر پڑیں۔ مالک قلعہ مبہوت ہو کر اچھی طرح دیکھنے بھی نہ پایا تھا۔ کہ لشکر اسلام سے صدائے تکبیر بلند ہوئی۔ اور کفار بھاگ نکلے +

یہ کیا تھا؟ نئی تعلیمیافتہ نسل کہیگی۔ کہ اَن نیچرل واقعہ ہے۔ شاید ہمدردی اسلام کے جدید مدعی بھی خلاف فطرت سمجھ کر مؤرخ پر مبالغے کا الزام لگائینگے۔ نہیں بیشک یہ سچا واقعہ ہے۔ کلام کا اثر فقط دل ہی نہیں پتھر پر بھی پڑ جاتا ہے۔ آیات قرانی کا اثر خود قران ہی بتا رہا ہے۔ کہ "لو انزلنا ہٰذا علیٰ جبل الخ" مایوسانہ نگاہ اور حسرت بھری آواز دونوں میں وُہ اثر ہے۔ جو تیر و سنان میں بھی نہیں۔ سنگدلوں پر کسی بات کا بہت کم اثر ہوتا ہے۔ مگر آہِ دلگداز کی آواز سنتے ہی بے اختیار کلیجہ پکڑ لیتے ہیں۔ زور الفاظ سے دل ہلا دینے والے اور مؤثر جملوں سے جوش دلا دینے والے تو بہت کم ہیں۔ کہ زبان کی تاثیر کا کسی کو یقین آئے۔ مگر ہندوستان کی بے کسی اور بے بسی اور قوم کی اس تباہ و برباد حالت نے ایسے مایوس القسمت بہت پیدا کر دئے ہیں۔ جو اپنے نالہ نیم شبی اور اپنی یاس بھری آواز سے ایک زمانے کو بیچین کر دیں۔ اور دکھا دیں۔ کہ الفاظ

میں قدرت نے کس قیامت کا اثر مخفی رکھا ہے۔ جذبات انسانی کا عالم عالم اسباب کے حدود کے باہر تک پھیلا ہوا ہے۔ اگرچہ ان جذبات کا ظہور کسی خاص وقت اور خاص موقع ہی پر ہوا کرتا ہے۔ نہ کسی خاص علم کے جاننے سے انہیں ترقی ہوتی ہے۔ اور نہ عشق کرنے سے ان کا اثر کچھ بڑھ جاتا ہے۔ مگر اتنا ضرور کہنا چاہیے۔ کہ ان کی تفتیش و تحقیق کچھ الہیات والوں ہی سے خوب بن پڑی ہے۔ وہ خوب سمجھ گئے ہیں۔ کہ جذبات انسانی کن موقعوں پر اپنا اثر ڈالتے ہیں۔ اور کس حد تک موثر ہیں۔

اس میں تو شک نہیں۔ کہ ہم اپنے جذبات سے ہی ترقی میں بھی مدد لے سکتے ہیں۔ ہم میں سے ہر ایک کی مایوسانہ حالت جب کبھی کبھی عزیزوں پر اثر کر جاتی ہے۔ تو کیا باہم ایک دوسرے پر نہ کرینگی؟

حسرت نصیبی میں جب دامنِ آرزو پکڑ کے رونے لگیں۔ مجال ہے۔ کہ دیکھنے والوں کو ترس نہ آجائے۔ حسرت بھری آواز کو اصل پوچھئے تو کسی کی نگاہِ ناز سے ایک قسم کی مشابہت ہے۔ یہ بھی اسی طرح سینکڑوں کو تڑپاتی ہوئی جاتی ہے جسطرح نظر غلط انداز بچپن طبیعت والوں کو بسمل کرتی جاتی ہے سب کچھ ہے۔ مگر ہمارے جذبات کچھ اثر نہیں دکھاتے +

افسوس! ہماری حسرت نصیبیاں ہی اس قسم کی نہیں ہیں۔ کہ ہماری زبان میں کچھ تاثیر پیدا ہو۔ یا یوں کہیں۔ کہ ہماری زبان ہی بند ہے۔ اپنی سیہ بختیاں ظاہر کریں تو کیونکر؟ واقعی ہماری زبان میں تاثیر نہیں ہے۔ ہمیں وہ الفاظ ہی نہیں ملتے جن کی مدد سے ہم اپنی حالت ظاہر کر سکیں۔ بس اس بے زبانی کی وجہ سے کسی بحر ال نصیب کی آرزوؤں کی طرح ہمارے جذبات کا دلوں ہی میں خون ہو جایا کرتا ہے +

اب تو ہمیں اس بات کی آرزو ہے۔ کہ اسی دعا میں کچھ اثر پیدا ہو۔ کہ اے پروردگار عالم ہماری زبانوں کو پورا موثر بنا دے!

## زمانے کی دلچسپیاں

ایک غریب الوطن بادیہ گرد مسافر نے ننگ حالی اور پریشان روزگاری کے ہاتھوں وطن مالوف کو چھوڑ کر کوہ و بیابان کی راہ لی تھی۔ اپنی غریب دکھیا مگر حورَوش بی بی کے ساتھ کسی پہاڑ پر چلا جاتا تھا۔ جہاں خارستانی زمین ان دونوں دردمندوں کا بچھونا تھی

اور سنگ خارا کی لمبی سلیں سر پر راحت تھی پتھروں کے تکیے تھے۔ اور چرخ جفا کار کا شامیانہ
ہر وقت کھنچا رہتا تھا۔ مایوسیاں ہمسفر تھیں۔ جنسے کبھی کبھی باتیں کر لینے کا موقعہ مل جایا کرتا تھا۔
حسرتیں پیاری انیس تھیں۔ جن سے دونوں پر درد دلوں کی اجڑی ہوئی منزلیں آباد رہا کرتی تھیں
قاعدہ ہے۔ کہ سفر میں دور سے کسی دوسرے صحرا نورد کی صورت نظر پڑتی ہے۔ تو دو
گھڑی دل ہی بہل جاتا ہے۔ مگر یہ آوارہ بخت ایسے تھے۔ کہ انھیں ان کڑی منزلوں میں
جو صورت نظر پڑتی وہ خوف کی تھی۔ جس سے اس ناشاد عورت کا کلیجا جو اپنے شوہر کے
سفر غربت کی شریک تھی۔ اور بھی دھڑکنے لگا تھا۔ مصیبت میں اکثر ایسا ہوتا ہے۔
کہ انسان لیٹا اور نیند آگئی۔ مگر پہاڑی رہزنی کرنے والی قوموں کا کھٹکا ایسا تھا۔ کہ
ان کی کبھی جھوٹوں بھی آنکھ نہ لگی۔ یہ سب تو تھا ہی۔ مگر کسی پہاڑ کے دامن میں جہاں
آبادی کا سیکڑوں میل پتہ نہ تھا۔ اس سراپا غم عورت کے درد زہ شروع ہوا۔ اور
ایک لڑکی پیدا ہوئی۔ گو اس کا حسن و جمال بے مثل تھا۔ مگر ایسے مقام پر پیدا ہوئی تھی۔ کہ ان پریشان
حال مسافروں پر اور مصیبت پڑ گئی۔ ایسے وقت میں اولاد کا ہونا بھی ستم ڈھا دیا کرتا ہے
باپ حیران کہ یا الٰہی اب کیا کروں۔ کہاں جاؤں۔ کس سے مدد مانگوں۔ منزلوں آدمزاد کا
نشان نہیں۔ اس سے بڑھ کر مصیبت اس بیکس عورت پر تھی۔ کہ دو قدم چلنے سے
بھی گئی۔ یہاں ٹھہرے تو خوف ہے۔ کہ قزاق لوگ آکر مار نہ ڈالیں۔ اگر چلنے کی ہمت کرے
تو چلا کس سے جاتا ہے۔ کسی نے کیا ٹھیک بات کہی ہے۔ کہ غم و الم میں اولاد بھی اجیرن
ہو جایا کرتی ہے۔ پھر الٹے کے خیالات۔ ماں نے کہا۔ یہ لڑکی ہماری مصیبت میں پیدا ہوئی
ہے۔ بڑی منحوس ہے۔ اس کا ساتھ رکھنا ٹھیک نہیں ہے۔ باپ کو بھی اپنی ہمدرد بی بی
کی یہ صلاح بہت پسند آئی۔ دونوں نے جی کڑا کر کے لڑکی کو کسی چٹان پر لٹا دیا۔ اور
آگے بڑھے۔ گو زمانہ بہت آگے بڑھ آیا تھا۔ مگر ان ضعیف الاعتقاد اور آوارہ گرد مسافروں
کی اس حرکت نے زمانہ جاہلیت کی وہ رسم یاد دلائی۔ جبکہ لڑکیاں زندہ دفن کر دی جایا
کرتی تھیں۔ یہ دونوں حسرت مند میاں بی بی عجب رنج و الم اور آوارگی کی حالت میں
تھے۔ مگر اب اس لڑکی سے بڑھ کر بیکس و بے بس کوئی نہیں جسے ماں باپ کے ایسے رحمدل
سر پرستوں کے ہاتھ سے یہ ظلم سہنا پڑا۔ ماں باپ نے اگرچہ ایک فوری تکلیف کے ہجوم سے
گھبرا کر یہ کارروائی کی تھی۔ مگر وہ فطری محبت کہیں جا سکتی ہے تھوڑی دور بڑھے ہونگے

کہ ماں سے نہ رہا گیا۔ بیتاب ہوگئی بے اختیار طبیعت بھر آئی کہ غلطاں ہماری پیاری لخت جگر لڑکی پر کیا گذری ہوگی۔ یہ فکر ایسی بڑھتی گئی۔ کہ باپ جس نے سفر کی مصیبتوں کے ہاتھوں مجبور ہو کر اس سنگدلی کو گوارا کیا تھا۔ الٹا پھرا۔ دیکھا کہ لڑکی زندہ ہے۔ اور اسی چٹان پر پڑی ہاتھ پاؤں مار رہی ہے۔ بے اختیار محبت سے گود میں اٹھالیا۔ اور بی بی کے پاس لے آیا۔ آخر یہ رائے ٹھہری۔ کہ جسطرح ہو سکے۔ اس لڑکی کو ساتھ لیتے چلیں۔ مگر جن لوگوں نے اس لڑکی کی ابتدائی حالت سنی ہوگی۔ اگر اسکے سوانح عمری کا پچھلا حصہ ملاحظہ کریں تو پردۂ زمانہ کی آڑ سے ایک عجیب و غریب دلچسپی نظر پڑیگی جس کو دیکھکر سب نقش حیرت ہو جائینگے یہی لڑکی اپنے شباب کے زمانے میں اپنے پہلے بہادر شوہر کے مار ڈالے جانے کے بعد ہندوستان کے ایک اولوالعزم شاہنشاہ کی ایسی معشوقہ بی بی تھی۔ کہ سکے تک میں اس کا نام پڑ گیا۔ یہ نور جہان بیگم تھی۔ جس نے جہانگیر بادشاہ کے پہلو میں بیٹھکر ملک پر حکومت کی۔ سمندر کی مدوجزر ان لوگوں کو جنہوں نے کبھی سمندر کی صورت نہیں دیکھی ہے۔ نہایت تعجب معلوم ہوتا ہے۔ مگر زمانے کا مدوجزر جسے معمولاً وہ اپنی آنکھوں سے اکثر دیکھا کرتے ہیں۔ اس سے کہیں بڑھا چڑھا ہوا ہے۔

مجھے ایک اور لڑکے کا بھی تذکرہ یاد آگیا سنا ہے۔ کہ کوئی جہاز ڈوب گیا تھا جہازوں کے ڈوبنے میں اکثر لوگ بچ بھی جایا کرتے ہیں۔ مگر یہ جہاز اپنے ساتھ سب لوگوں کو لے ڈوبا تھا۔ جان بچی تھی۔ تو صرف ایک جوان حاملہ عورت کی۔ جو کسی تختے کے سہارے پر ادھر ادھر سمندر میں کسی جزیرے یا خشکی کا پتہ ڈھونڈتی پھرتی تھی۔ اس حالت میں کہ موت سمندر شکل میں اسکی غیر معمولی مختصر لائف بوٹ کے ساتھ شوخیاں کر رہی تھی۔ اس کا وضع حمل ہوا۔ جو لڑکا پیدا ہوا تھا یہ تو کیا معلوم کہ تقدیر اس کے ساتھ کسطرح پیش آنیوالی تھی۔ مگر اتنا ضرور ہے کہ ایسے وقت دنیا میں آیا کہ اپنی ماں کو بھی دوبھر تھا۔ ظاہر اسباب تو یہی معلوم ہوتا تھا کہ زمانہ اس کا جانی دشمن ہے۔ کون بات تھی جس کی وجہ سے عشرت تودہ کنار۔ زندگی کی بھی امید کیجائے؟ اس سے بڑھکر ایک اور مصیبت جس سے زمانے کی موافقت کا بہت کچھ اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ سر پر آ پڑی جو شاید ناظرین کی امیدوں کو جو اس بچے کی زندگی کے متعلق ہیں۔ بالکل خاک میں ملا دیگی۔ وہ یہ کہ اسکی ماں کی زندگی پوری ہوگئی۔ اور اسکو اپنی وہ پیاری جان جو شاید دنیا کی تمام چیزوں سے عزیز تھی ۔ اسی ترتے ہوئے پڑے پر دنیا پڑی

مذہبی کتابوں میں اگر مبارک اور سچے ہادی کے کلام سے نقل کیا گیا ہے۔ تو یہ نہایت صحیح ہوگا
ملک الموت کو خود اس کی قبض روح پر بڑا افسوس ہوا۔ مگر کیا کرتا؟ حکم حاکم مرگ مفاجات
ب اس ڈوبے ہوئے جہاز کی یادگار یہی ایک بچہ تھا۔ مگر ناظرین کو حیرت ہو جائے گی۔ جب
یں گے۔ کہ شداد جسنے دنیا میں بہشت بنائی تھی۔ اسی لڑکے کا نام تھا۔

واقعی رفتار زمانہ نے یہ عجیب پُر آرزو نظام رکھا ہے۔ کہ ہزار نامرادی ہو۔ مگر آئندہ
نی کی امید کسی طرح دل سے نہیں جاتی۔

موسم خزاں کے اس یاس نصیب زمانے میں جبکہ جوانانِ چمن جنکے جوبنوں کو بادِ
لف کے جھونکوں کی دست درازیاں لوٹ چکتی ہیں۔ اپنے بگڑے بناؤں کی سیر دکھایا
تے ہیں۔ اور جبکہ سوکھے گرے پڑے پتے مقتل آرزو کی زیارت کرایا کرتے ہیں۔ اور جبکہ
ختوں کی خشک ٹہنیوں سے اُس حسرت نصیب بیوہ کی صورت کا نقشہ آنکھوں
ں پھر جایا کرتا ہے۔ جس کا سلا اسہاگ اور زیور غم واندوہ کی نظر ہو گیا ہو۔ دیکھنے والو
ے دل پر عجب حسرت ناک کیفیت طاری ہوتی ہے۔ مگر کچھ دنوں بعد جب کہ موسم بہار میں
ور عشرت سے غنچے اپنی ہنسی کو کسی طرح ضبط نہیں کر سکتے۔ اور جبکہ عروس بہار کا جوبن
پھٹا پڑتا ہے۔ اور جبکہ حسرتمندانِ خزاں کی آرزوؤں کے پورے ہونے کا موسم آجاتا
ہے۔ اُسوقت کی دلچسپی دیکھنے کے قابل ہوتی ہے۔ جان گردش زمانہ کی نیرنگیاں تھیں۔
ہوں نے کسی نہ کسی وقت دل آرزومند کی طرح خزاں کے دست تظلم کا جور سہے
وئے جوانانِ چمن کی امیدوں کی بات رکھ لی۔

اس میں تو کسی کو شک نہیں۔ کہ زمانہ آگے کو بڑھتا جاتا ہے۔ گو گردش کرتا ہے اور
م کو زیر و زبر کرتا ہے۔ مگر اسکے ساتھ ترقی بھی کرتا جاتا ہے۔ دوسرا دور پہلے دور سے کچھ
چھ اوپر چڑھا ہوا ضرور معلوم ہوتا ہے۔ اس گردش کی تحقیقات علم ہیأت والوں کی
حصے میں لکھدی گئی۔ جنہوں نے زمین کی رفتار کو بڑے غور کے ساتھ دریافت کیا ہے
خوب جانتے ہیں۔ کہ زمین فانوس خیال کی طرح ہر وقت چکر میں رہا کرتی ہے:

ہمارے ملک کے رئیسوں کیطرح چند بچوں کے رجو اُس موقعہ پر مصاحبوں کے لفظ
ے یاد کئے جاتے ہیں؛ اللہ کا لٹو ہے۔ جسے کونچا سمجھ کر آفتاب بزم قدرت کا تماشہ دیکھا کرتا
ہے۔ مگر اس کے ساتھ یہ نہیں۔ کہ کسی کج طبیعت والے کی طرح ایک ہی مقام کی ہو رہتی ہو

بلکہ ہر وقت آگے ہی بڑھتی رہتی ہے۔ بس یہ عالم ہے۔ کہ کسی پریشان قسمت وطن اوارہ کی طرح بھر تو چکر کھاتے کھاتے فانوس خیال ہو رہا ہے۔ اور پیروں میں ایسا چکر ہے۔ کہ ایک مقام پر نچلا بیٹھنا بھی دشوار ہے۔ گردش کی حالت میں کہیں عالم ایک پہلو پر رہ سکتا ہے لاکھ دلچسپیاں بڑھتی جاتی ہیں۔ اور دنیا ترقی کرتی جائے۔ مگر یہ نہیں ممکن۔ کہ مختلف حصے ہمیشہ ایک ہی نسبت کے ساتھ ترقی کریں۔ رفتار بخیر اور دور زمانہ سے تو یہ امر محال ہے۔ یہی امر تھا۔ جس کی آج تک سب تمنا کرتے آئے۔ اور اب بھی اسی آرزو کے سہارے پر جیتے ہیں۔ مگر یہ بات نہ ہونا تھی نہ ہوئی۔ اور نہ امید ہے۔ کہ کبھی ہو۔ دنیا کی دلبستگیوں میں حسن ایسی چیز ہے۔ جس پر سب کی نگاہ پڑا کرتی ہے۔ کون ہے۔ جو اس کی حالتوں پر غور نہیں کرتا رہتا۔ اس کے اختلافات غالباً سب کی نظروں میں سمائے ہونگے۔ بھلا سوچیں تو کہ وہ کیا عالم تھا۔ جب باغ عالم کسی ناشگفتہ کلی کی آرزو میں ہزاروں کی زندگی کٹتی تھی۔ شب و روز یہی کہتے گذرتی تھی

خدا انرا بت ناداں در از میں تو کرے ستم کے تو بھی ہو قابل خدا وہ دن تو کرے

چند ہی روز میں اگو وہ منتظروں پر پہاڑ گذرے ہوں اُس حسن عالم فریب نے زمانے کو اپنی جانب متوجہ کرنا شروع کیا اور پیچھے ناز برداریوں کی صورتیں دکھا کر دماغ کو اور عرش پر پہنچا دیا۔ یہ وقت زمانے کے تغیرات میں سے نہایت دلچسپی کا وقت تھا۔ مگر ہنوز اور لوگ تو درکنار خود اسی حسین کی آرزو اچھی طرح نہیں برآئی تھی۔ کہ شباب جاتا رہا۔ نہ وہ ناز رہے۔ نہ وہ ناز برداریاں رہیں۔ اس مقام پر سبھوں کو رفتار زمانہ کی نیرنگیاں ضرور یاد آگئی ہونگی۔ اور کیوں نہ یاد آتیں؟ یہ واقعہ ہی ایسا تھا۔ ہزار غفلت شعاری بے اعتباری زمانے کی جانب متوجہ ہونے دے۔ مگر اس محل پر انسان بے اختیار چونک پڑتا ہے۔ کہ طبیعت ہی اختیار میں نہیں رہتی

قومی شکائتیں بہت سنی جاتی ہیں۔ جن قوموں کو زمانے نے کسی وقت باغ عالم کی دلچسپیاں بڑی عیش و عشرت کے ساتھ دکھلا رکھی تھیں۔ اُن سے بڑی دلسوزی کے ساتھ صدائے نالہ و فریاد بلند ہو رہی ہے۔ مگر یہ کوئی تعجب کی بات نہیں۔ زمانے کی رفتار پر اگر غور کریں۔ تو انکی بڑی تسکین ہو جائیگی اُن سے پہلے سینکڑوں قومیں انکی طرح زمانے کے دست ستم سے مٹ گئیں۔ اور جو اب عروج پر ہیں کبھی زمانے کی

جفاکاریوں کی متحمل ہو رہی تھیں، غنیمت ہے۔ کہ قدرت نے بالکل مایوس نہیں کر دیا۔ ترقی کی امید ہر حال میں دل پر آرزو کے حوصلے بڑھاتی رہتی ہے۔ ہمارے لئے یہی بہت ہے۔

## ایک اگلا اسلامی بہادر

افریقہ کے گرم ریگستان اور ناپیدا کنار بیابان زمانے بھر میں مشہور ہیں یہی بر اعظم ہے جو اسوقت تک اپنی قدامت پر باقی ہے۔ اس ملک کے وسط میں پہنچ جانے کی آج تک مشکل سے کسی کو جرأت پڑتی ہے۔ وہاں کا گرم موسم اور وہاں کی تپتی ہوئی زمین ایسی چیزیں ہیں۔ جو بڑے بڑے حملہ آوروں اور سخت سے سخت جفاکشوں اور الوالعزموں کے حوصلے پست کر دیتی ہے۔ ہسٹری کے ورق اُلٹ ڈالئے۔ مگر دنیا کی بڑی بڑی مشہور قوموں سے کسی کو بھی اُس طرف رخ کرتے بھی نہ پایئے گا۔ اگر یہ کام پورا کیا ہے۔ تو اسلامی الوالعزم فاتحوں نے اس کام کے تکمیل میں تو بڑے بڑے جھگڑے پڑے ہیں۔ اور سخت سخت لڑائیاں ہوئی ہیں۔ مگر مجھے ایک خاص واقعہ سے غرض ہے۔ جو سب کے بعد پیش آیا تھا۔ عقبہ نامی ایک الوالعزم مسلمان دس ہزار عرب کی فوج سے شہر دمشق کو چھوڑ روانہ ہوا۔ یوں تو مسلمانوں میں سینکڑوں بلکہ ہزاروں سپہ سالار گذرے ہیں۔ جنکی تلوار کی چمک سرزمین عجم۔ شام۔ عراق اور مصر کو قیامت تک یاد رہیگی۔ مگر عقبہ بھی بلا کا بہادر اور جرار افسر تھا۔ یہ بہادر سواحل مصر پر قدم رکھتے ہی آگے روانہ ہوا۔ اور گویا اس دھن میں چلا۔ کہ دیکھیں یہ ریگستان آخر کہاں تک پھیلتے چلے گئے ہیں۔ نئے نئے ملکوں پر قبضہ کرنا اور بڑی بڑی لڑائیاں فتح کرنا پورے بر اعظم افریقہ کو طے کر گیا آخر زمین اُس کا ساتھ دینے سے تھک گئی۔ اور عالی ہمت عقبہ اندازاً چار ہزار میل کی مسافت طے کر کے اُس مقام پر پہنچا۔ جس جگہ زمین کا خاتمہ ہو گیا تھا۔ اور اٹلانٹک اوشن (بحر مغربی) کا پانی مغربی کنارۂ آسمان کو تھپیڑے دیتا نظر آتا تھا۔ سمندر کی صورت دیکھکر عقبہ کو مجبوراً اپنی الوالعزمیوں کی رفتار روکنا پڑی۔ مگر اُس دھن کے پکے مسلمان کو ایک بار اور جوش آگیا۔ گھوڑا سمندر میں ڈال دیا۔ آنکھ اٹھا کے آسمان کی طرف دیکھا۔ اور جوش میں آکر کہا "بار الہا! اگر یہ سمندر میرے راستے میں نہ پڑتا اور مجھے نہ روکتا۔ تو میں تیرے مقدس نام اور وحدانیت کی منادی کرتا۔ اُن نافرمان

قوموں کو جو تیرے سوا کسی اور معبود کی پرستش کرتی ہیں۔ تہ تیغ کرتا ہوا غیر معلوم
مغربی سلطنتوں تک چلا جاتا۔" اگرچہ مسلمانوں کے اور افسروں کے آگے اس کی چنداں
وقعت نہیں۔ مگر بقول گبن کے یہ بہادر سپہ سالار مسلمانوں کا سکندر تھا۔ اس پچھلی
کارروائی سے صاف معلوم ہوتا ہے۔ کہ کلمبس سے پہلے عقبہ نے امریکہ کو شوق اور
سرت کی نظر سے دیکھ لیا تھا۔ یا یوں کہنا چاہیئے۔ کہ اپنی فتحمندیوں کے لئے منتخب
کر رکھا تھا۔ غور کی جگہ ہے۔ کہ یہ نامور بہادر کتنا بڑا مستقل مزاج اور کیسا دھن کا
پکا تھا۔ اگر سمندر حائل نہ ہوتا۔ تو بیشک یہ پہلے امریکہ میں پہنچتا۔ اور پہلے ہی اس
سرزمین پر اپنا جھنڈا گاڑ دیتا۔ جرأت اور بہادری کے لحاظ سے مسلمانوں کی بڑی
عریف کی جاتی ہے۔ مگر ہمارے نزدیک اُن کی کامیابی کا اصلی سبب اُن کا
ستقلال تھا۔ وہ دھن کے پکے تھے۔ اور انکے میں خیال تھا۔ کہ جس امر کا ارادہ کیا
ائے۔ وہ جسطرح ہو سکے پورا ہی کر کے چھوڑا جائے۔ یہ اسی وجہ سے ہے۔ کہ
س ملک کے فتح کرنے پر جو افسر نامور کیا گیا۔ کبھی اُس کی تبدیلی کی نوبت
آئی۔ اور وہ ملک فتح ہو گیا۔ جس جوش سے سعد بن ابی وقاص حدود عجم
ں خالد ابن ولید شام اور روم میں اور عمرو بن العاص مصر میں داخل ہوئے
وئے تھے۔ اُسی جوش سے بہادر اور فتحمند عقبہ افریقہ کے بیابانوں میں
ھسا۔ اور چار ہزار میل کی مسافت نہایت سہولت سے طے کر گیا۔

ایسے ہی اولو العزموں کی کوششوں کا نتیجہ تھا۔ کہ ہنوز ہجرت کی
ہلی صدی تمام بھی نہیں ہونے پائی تھی۔ کہ ایک ہی سنہ میں ادھر
سپین میں اور ادھر دریائے گنگا کے کنارے اسلامی جھنڈا گاڑ دیا گیا

## بیان پُر درد سے گذری ہوئی اگلی کہانی ہے

پہر کا وقت ہے۔ آفتاب کی تیزی بالو کے ذروں اور سنگستانی چٹانوں میں بخوبی
رایت کر گئی ہے۔ شہر دمشق کو اسلامی قوم گھیرے ہوئے پڑی ہے۔ شہر سے دو
میل ہٹ کر شمال کے جانب ہنگامہ قیامت بپا ہے۔ بہت بڑی سخت
ائی ہو رہی ہے۔ ہرقل شہنشاہ روم نے ایک جرار اور تازہ دم فوج دمشق والوں

کی اعانت کے لئے روانہ کی ہے۔ یہ فوج دمشق کی شہر پناہ تک نہیں پونچنے پائی تھی
کہ مسلمانوں کی ایک مختصر فوج نے بڑھ کر فاصلے ہی پر روکا۔ اور اُسی جگہ اُس وقت
بازار گیرودار گرم ہے۔
الوالعزمیاں دکھلائی جاری ہیں۔ اور بہادریوں کا امتحان ہر شخص بڑے ذوق و شوق
سے بڑھ بڑھ کے دے رہا ہے۔ دونوں جانب پوری جرأت اور پورے حوصلے سے
کام لیا جا رہا ہے۔ نہ اِدھر ناامیدی ہے۔ نہ اُدھر خوف ہے۔ ہر طرف کے سپاہی
اپنی ہمت سے زیادہ جوش دکھا رہے ہیں۔ لڑتے ہیں۔ اور زخمی ہوتے ہیں۔ مارتے
ہیں۔ اور مرتے ہیں۔ مسلمانوں کے مشہور بہادر سپہ سالار خالدؓ برابر فوج کو اسلامی
جوش دلا دلا کر لڑاتے ہیں۔ اور صف دشمن میں ڈوب ڈوب کے نکلتے ہیں۔ اسلام
میں تو تمام بہادران اسلام ان کا نمونہ ہیں۔ مگر ایک خاص قسم کی بیچینی اور اضطراب
جو خالدؓ کی صورت سے عیاں ہے۔ اُس میں کوئی اُن کا شریک نہیں۔ خالدؓ کی
یہ بیتابی ترقی کرتی جاتی ہے۔ اور ساعت بساعت اُن کا جنگ آزمائی کا جوش
بڑھتا جاتا ہے۔ اب اُن کی یہ حالت ہے۔ کہ صف دشمن سے نکلے۔ اور ذرا دم بھی
نہ لینے پائے تھے۔ کہ پھر فوج اعدا میں غائب ہو گئے۔
خالدؓ یونہیں متواتر حملے کر رہے ہیں۔ کہ انہیں ایک کم عمر نوجوان نظر آیا۔ یہ
نوجوان نہایت ہی خوش رو اور نازک اندام شخص ہے۔ سر پر عمامہ بندھا ہوا ہے
عبائے عربی زیب بر ہے۔ عربی جاندار گھوڑا زیر ران ہے۔ اور پورے اسلحہ سے
سے آراستہ ہے۔ نوجوان اپنی شکل وصورت اور اپنے حسن وجمال کی وجہ سے معمول
سے زیادہ دلربا اور دلفریب ہے۔ مگر اس وقت اس جنگی لباس میں اُس کی دلربائیوں
کو بدرجہا زیادہ ترقی ہو گئی ہے۔ خالد نے نہایت حیرت اور استعجاب سے اس
نوعمر سپاہی کو دیکھا۔ بہت کوشش کی کہ پہچانیں۔ مگر نہ پہچان سکے۔ اسی عالم میں
خالد کے دلی جوش نے پھر ترقی کی۔ اور اس نوجوان کو چھوڑ کر غنیم کی فوج میں
گھس پڑے۔ حسین و نازک اندام سپاہی نے بھی خالد کے ساتھ ہی رومیوں
پر حملہ کیا۔ اور خالد کی طرح ایک ہی حملے میں وُہ بھی رومیوں کی صفوں کے اندر
تھا۔ خالد دشمن کی سب صفوں کو درہم وبرہم کرتے اُس پار نکل کے ٹھہرے۔ تو وُہ نوجوان

بھی وہیں تھا۔ خالدؓ کی حیرت دوبالا ہوگئی۔ مگر اپنے متحیر دل پر ضبط کیا۔ اور پھر رومیوں کی فوج پر پلٹ پڑے۔ اور اُن کے ساتھ ہی وہ نوجوان بھی پلٹا۔ اس دفعہ نوجوان نے خالد کی پیروی نہیں کی۔ بلکہ خالد رومیوں کی صفوں کو چیرتے ہوئے ایکطرف سے نکلے اور وہ دوسری طرف سے نکلا۔ اس دفعہ خالدؓ سے ضبط نہ ہوسکا۔ اُس نوجوان کی طرف متوجہ ہوئے۔ اور کہا "اے شخص خدا تجھ پر رحمت کرے۔ تو کون ہے۔

نوجوان نے یہ سوال سُن کر ٹالدیا۔ اور رُخ بدل کر دشمنوں پر حملہ کردیا۔ اور آناً فاناً نظر سے غائب ہوگیا۔ خالد کو اتنی تاب کہاں کہ منتظر کھڑے رہیں۔ انہوں نے بھی بے تکلف غنیم کی صفوں میں اپنے تئیں غائب کردیا۔ رومیوں کی فوج کے اُس طرف نکل کر دونوں ملے۔ خالد نے پھر وہی سوال کیا۔ مگر جواب میں اب بھی ناکامی ہوئی۔ اس مرتبہ پھر صفوف کفار کو درہم و برہم کرتے ہوئے دونوں باہر آئے۔ اور مسلمانوں کی جان فروش سپاہیوں کے جھرمٹ میں کھڑے ہوگئے۔ خالد اُس نوجوان کو سخت تعجب سے دیکھ رہے تھے۔ اور وہ نظر نیچی کئے دوسری طرف مُڑا ہوا کھڑا تھا۔

اب خالد کا استعجاب اس درجے کو پہونچ گیا تھا۔ کہ اُن میں ضبط و تحمّل کی بالکل طاقت نہ تھی۔ اُس نوجوان کی طرف بڑھے اپنے گھوڑے کی باگ اُس کی باگ سے ملادی اور کہا اے بہادر نوجوان تجھے اپنا نام بتانے سے کیوں انکار ہے! میں بہ حیثیت اسکے کہ مسلمانوں کے اس گروہ کا سردار ہوں۔ تجھے اپنا حال بتانے پر مجبور کرسکتا ہوں"

نوجوان نے نہایت شیریں اور مہین آواز اور زنانے لہجے میں آنکھیں نیچی کرکے جواب دیا "اے سردار میرا شمار زنان مسلمین میں ہے۔ میں ایک حسرت نصیب عورت ہوں" اتنا کہا۔ اور آنسو جاری ہوگئے۔

خالد نہایت حیرت زدہ ہوکر بولے "کیا! تم عورت ہو! — اچھا تو اس قدر غمگین کیوں ہو۔

**عورت** "ہائے کیوں کر صبر کروں۔ مجھ سے زیادہ بدنصیب کون ہوگا۔ دنیا میں میرا کوئی نہیں ہے۔ اے سردار میں بالکل اکیلی ہوں۔ صرف ایک بھائی ہے۔ افسوس اُس کا کہیں پتہ نہیں — یہ کہہ کے پھر رونے لگی۔

**خالد** "تمہارے بھائی کا کیا نام ہے۔ اور وہ کیونکر غائب ہوگئے؟"

**عورت** "اے سردار وہ رومیوں کی اسی فوج سے لڑتے لڑتے گم ہوگئے۔ آپ ہی نے تو اُن کو ان کافروں کے مقابلے کو پہلے بھیجا تھا۔ میں انہیں ڈھونڈتے ڈھونڈتے تھک گئی۔ میں نے اس فوج کا کوئی کونا تلاش کرنے کو نہیں چھوڑا۔ ہر طرف دیکھ آئی۔ ہر جگہ ڈھونڈھ آئی افسوس کسی طرح نہیں معلوم ہوتا۔ کہ وہ کیا ہوئے۔ رومیوں نے قید کیا ہوتا تب بھی تو پتا مل جاتا۔ اے ضرار اگر تم اس عالم کو سدھار گئے۔ تو یقین جانو۔ کہ تمہاری بہین کی زندگی بے مزا ہو گئی!" پھر تاب نہ آئی۔ اور منہ چھپا کے رونے لگی۔

**خالد**۔ "آہاہ تم ضرار کی بہن خولہ ہو! تم کو تو میں خوب جانتا ہوں۔ افسوس اے خولہ! ضرار کے گم ہو جانے سے تمہارے ساتھ کل مسلمان رنج میں پڑ گئے ہیں۔ ضرار وہ شخص تھے جن کو ہر مسلمان سچے دل سے دوست رکھتا ہے۔ اگر خدانخواستہ ضرار کو کسی قسم کا نقصان پہنچا۔ تو سارے مسلمانوں کے دل کو صدمہ پہنچیگا۔ اے خولہ خدا تمہاری ہمت اور تمہاری جرأت میں برکت دے۔ تم نے اُن کے تجسس میں نفس کشی کر کے ہر مسلمان کو اپنا ممنون احسان بنا لیا۔ گھبراؤ نہیں۔ انشاءاللہ ہم بہت جلد انہیں ڈھونڈھ نکالینگے" یہ کہتے وقت خالد بھی آبدیدہ ہو گئے۔

**خولہ**۔ "اے سردار آپ کا فرمانا بجا ہے۔ مگر میرے دل کو کیونکر تسلی ہو؟ میں نے رومیوں کی ساری فوج چھان ڈالی۔ ہر ہر صف اور ہر ہر نشان اور ہر ہر صلیب تک ضرار کو تلاش کرتی اور لڑتی ہوئی گئی۔ مگر کہیں پتہ نہ لگا۔ اب تو مجھ سے صبر نہیں ہو سکتا۔"

**خالد**۔ اے خولہ خدا تمہیں اس جہاد کی جزائے خیر دے۔ تمہاری طرح میں نے بھی رومیوں کا سارا لشکر ڈھونڈھ ڈالا۔ میں متحیر ہوں۔ کہ آخر وہ کیا ہوئے۔ اچھا ٹھہرو۔ دیکھو۔ اور ایک تدبیر کرتا ہوں۔ شاید کچھ پتہ لگ جائے۔ یہ کہہ کے رومیوں پر حملہ کیا۔ دو چار رومیوں کو جاتے ہی قتل کر ڈالا۔ اور ایک کو گھوڑے سے اُتار کر زندہ گرفتار کر لائے۔ رومیوں کے کچھ اور سواروں نے اپنے ساتھی کے بچانے کا ارادہ کیا۔ مگر اُدھر سے اور مسلمانوں نے بڑھ کے انہیں پسپا کر دیا۔ خالد اُس شخص کو لائے۔ اور اپنے مترجم کو بلا کے اُس سے باتیں شروع کیں۔

**خالد**۔ "تم کون ہو۔ اور تمہاری فوج کا سردار کون ہے۔"

**رومی**۔ صاحب میں ایک روم کا رہنے والا عیسائی ہوں۔ اور ہماری فوج کا سردار وردان ہے

وُہ بڑا بہادر شخص ہے۔ اور ہرقل نے اپنا معتمد علیہ سمجھ کر اُسے تمہارے مقابلے کو روانہ کیا ہے۔

**خالدؓ** "تم تمہارے ایک ساتھی کا حال بتا سکتے ہو۔ جو بڑا بہادر شخص ہے۔ اور جس نے پہلے ہی حملے میں تمہارے بہت سے آدمی قتل کر ڈالے تھے"

**رُومی** "یہ بالکل خلاف ہے۔ کہ اپنے سردار کا راز میں تم پر آشکارا کر دوں"۔

**خالدؓ** "تو شاید تم اپنی جان سے ہاتھ دھوتے ہو۔ اچھا تو اب تم سے پوچھا جاتا ہے کہ تم دین اسلام کو قبول کرو گے یا نہیں"

**رُومی** "تمہارا دین اختیار کرنا میرے لئے بہت بڑی ذلت کی بات ہے۔ میں مسلمان ہونیکے بہ نسبت جان دینا زیادہ پسند کرتا ہوں۔

اب قریب تھا۔ کہ رومی قتل کر ڈالا جائے۔ یکایک کچھ سوچ کے اُس نے پوچھا اچھا اگر میں تمہارے ساتھی کا پتہ بتا دوں تو تم مجھے چھوڑ دو گے!"

**خالدؓ** "بے شک اس صورت میں ہماری ذمہ واری میں آجاؤ گے"

**رُومی** "تو سُنیے۔ آپ کے ساتھی نے ہم پر بڑا سخت حملہ کیا۔ ہمارے سینکڑوں آدمی مار ڈالے۔ خود سردار وردان کو اُنکی بہادری پر حیرت ہو گئی تھی۔ تمہارے ساتھی نے آخر جلیان گرا دی۔ پھر سردار کے بیٹے حمران کے ایک کاری نیزہ مارا وہ نیزہ سینے پر پڑا اور پیٹھ توڑ کے نکل گیا۔ مگر جب انہوں نے اپنا نیزہ حمران کی پیٹھ سے نکالا۔ تو اُسکا پھل زرہ میں اُلجھ کے رہ گیا تھا۔ خالی لکڑی سے وُہ کیا کر سکتے تھے۔ اگرچہ بے قوت بھر لڑتے رہے۔ مگر آخر کو زندہ گرفتار کر لئے گئے۔ سردار وردان کو یقین تھا کہ تم لوگ اپنے ساتھی کو ضرور چھوڑا لو گے۔ اس لئے اُس نے دو سو سواروں کی حفاظت میں اُنھیں شہنشاہ ہرقل کے پاس بھیجدیا۔

ابھی تھوڑی دیر ہوئی۔ کہ وُہ لوگ اُنھیں لیکر ادھر روانہ ہوئے ہیں"

اتنا سُننا تھا۔ کہ خالد کے چہرے پر ایک مایوسی برسنے لگی۔ اور خولہ کا چہرہ بھی نااُمید ہو کے ہجوم سے یک بیک زرد پڑ گیا۔ اسوقت خولہ کے تمام کپڑے دشمن کے خون میں لتھڑے ہوئے تھے۔ جابجا خون کے لوتھڑے جم گئے تھے۔ سارا بدن سُرخ رنگ میں رنگا ہوا تھا۔ مگر چہرہ بالکل زرد ہو گیا۔ اور اُس پر سُرخی کی گویا کوئی چھینٹ بھی نہ پڑی تھی

رنتق نے بھی اب کلمہ پڑھا اور مسلمان ہو گیا۔ اہلِ اسلام نے ہر طرف سے اسکو مبارکباد دی اور ضرار کی رہائی کی تدبیریں سوچنے لگے۔

**خالدؓ** "اب کیا تدبیر کی جائے؟ اس معاملے میں ہمیں عجلت کرنا چاہیے۔"

**رافعؓ** (ایک پُرجوش اور بہادر مسلمان) اے سردار آپ دوسو مسلمان مجھے دیں۔ میں اُنکو لیکر ایسے راستے سے جاؤنگا۔ کہ رومیوں کے پہونچنے سے پہلے ہی اُنہیں راستے میں پالونگا۔ میں نے ملک شام میں بہت سفر کیا ہے۔ اور یہاں کے راستوں سے خوب واقف ہوں۔

**خالدؓ** "خدا تمہاری مدد کرے۔ اسی وقت روانہ ہو۔ یہ کہکے خالد نے نام لے لے کے مسلمانوں کو پکارنا شروع کیا۔

**خولہ**۔ اے سردار مجھے بھی اجازت دیجئے۔ کہ میں بھی رافع کے ساتھ جاؤں اور اپنے بھائی کے چھوڑانے میں مدد دوں۔"

**خالدؓ**۔ اچھا تم بھی جاؤ۔ میں تمہیں اجازت دیتا ہوں۔

غرض رافعؓ اور خولہ دونوں دوسو مسلمانوں کے گروہ کے ساتھ روانہ ہوئے رافعؓ ریگستان اور پہاڑوں کے درّوں میں ہوتے ہوئے جاتے تھے۔ کچھ دن رہے ایک مقام پر پہونچکے دیکھا۔ تو زمین پر گھوڑوں کے سُموں کے نشان نہ پائے۔ بہت خوش ہوئے اپنے ساتھیوں سے کہا۔ بڑی خوشی کا مقام ہے۔ کہ تم نے نزدیک ہی اپنا مقصد حاصل کر لیا۔ ابھی تک رومی یہاں سے نہیں گذرے ہیں۔ آتے ہی ہونگے۔ آؤ ہم تم (ایک طرف اشارہ کرکے) اس گھاٹی میں چھپ رہیں۔ یہ کہہ کے سب لوگ چھپکے بیٹھ رہے۔ اسوقت اُس جگہ کا سین دیکھنے کے قابل ہے۔ چاروں طرف پہاڑیوں اور گھاٹیوں کا سلسلہ پھیلا ہوا ہے۔ زمین کے چہرے پر بالو نے ایک چمکتا ہوا سفید پوڈر مل دیا ہے جسمیں جابجا ابرک کے ذرے دو گھڑی دن رہے کے آفتاب میں کسی کی افشاں کی طرح چمک رہے ہیں۔ بلند پہاڑ جو دوپہر کی گرمی میں زیادہ بلندی پر چڑھ گئے تھے۔ اب کرہ زمین سے بہت قریب ہو آئے ہیں۔ کھجوروں کے جھنڈ جابجا پھیلے ہوئے ہیں۔ اور اُن کے سائے مشرق کی جانب دُور دُور تک زمین کو میلا کرتے چلے گئے ہیں۔ آفتاب افق مغرب سے بہت قریب ہو گیا ہے۔ اور اُس کے نیچے نیچے لمبی کرنیں گویا اہلِ عرب کے نیزوں کی طرح پہاڑوں پر پیوست ہو گئی ہیں۔ ناگہاں سامنے کی گھاٹیوں سے ایک گرد بلند ہوئی۔ رافعؓ

اور اُن کے ہمراہی تیار ہو گئے اور رومیوں کے نزدیک پہنچنے کا انتظار کرنے لگے۔

اب رومیوں کے گھوڑوں کے ہنہنانے کی آوازیں آنے لگیں۔ دامانِ گرد چاک ہوا اور اُس میں سے رومی سوار نظر آئے۔ اُن کے خود اور اُن کی زرہیں آفتاب کی زردی مائل شعاعوں میں سنہری نظر آتی تھیں۔ اُن کے اسلحہ اُڑتی ہوئی گرد کی تیرگی میں بجلی کی طرح چمک رہے تھے۔ یونی ایک خاموشی کے ساتھ چلے آتے تھے۔ اور بیچ میں ضرارؓ ایک اونٹ پر بیٹھے بیتابی اور بیکسی کے عالم اور درد کے لہجے میں کچھ عربی پرسوز اشعار جھوم جھوم کے پڑھتے جاتے تھے۔ ضرارؓ کی آواز چاروں طرف کی پہاڑیوں سے ٹکراتی تھی۔ اور ناکام و نامراد واپس آتی تھی۔ آخر ضرارؓ نے ایک شعر پڑھا جس کا یہ مفہوم تھا۔ کہ کاش میری بہن خولہؓ یا میرے دوست خالدؓ اس میری آواز کو سن لیتے۔ اور ان پہاڑیوں کے اندر سے اُن کی آواز خوشخبری سناتی ہوئی میرے کان میں پہنچتی۔“ یہ شعر سن کر خولہؓ میں ضبط کی تاب نہ رہی۔ چلا کے کہہ اٹھیں ”اے بھائی خدا نے تمہاری سن لی۔ میں تمہاری بہن خولہؓ ہوں۔“ خولہؓ کی زبان سے ان الفاظ کا نکلنا تھا کہ رافعؓ اور اُن کے ہمراہیوں نے زور سے تکبیر کہی۔ اور حملہ کیا۔ اس آواز سے چاروں طرف کی پہاڑیاں گونج اٹھیں۔ اور پہاڑیوں سے بدرجہا زیادہ رومیوں کے دل میں لرزہ پڑ گیا۔“ مسلمانوں نے پہلے ہی حملے میں سب رومیوں کو قتل کر ڈالا۔ خولہؓ لپک کر اپنے بھائی کے لپٹ گئیں۔ اور کل مسلمانوں نے ضرارؓ کو رہائی کی مبارکباد دی۔ ضرارؓ نے ایک رومی کا نیزہ اٹھا لیا۔ اور کل مسلمانوں کے ہمراہ دمشق چلے گئے۔ وہاں خالد کے لشکر نے رومیوں کی فوج کو شکست دیدی۔ رومی بھاگے جاتے تھے۔ کیونکہ خالدؓ نے دور تک اُن کا تعاقب کیا۔ بھاگتے ہوؤں کو ادھر ضرارؓ اور رافعؓ اور خولہؓ نے قتل کرنا شروع کیا۔ اس تحریر کو مورخ کیا انگریزی اور کیا عرب سب متفق ہیں۔ کہ ضرارؓ اور خولہ دونوں بھائی بہن اس زمانے کی نہایت عمدہ اور بے مثل یادگار ہیں۔ اور زیادہ تر حیرت کی یہ بات ہے۔ کہ اس وقت جس وقت کا حال ہم نے بیان کیا۔ ضرارؓ کی عمر اٹھارہ برس کی تھی۔ اور خولہؓ کو ستر سوا سال تھا۔

## سفر کامیابی کی کنجی ہے

(فروری ۱۸۸۸ء)

ہم کسی اولوالعزم انسان کے نیک نام مسافر کی طرف سے خصوصیت دیکھ کر حیرت میں آجاتے

ہیں۔ جو ایک نہایت غریب گھرانے میں پیدا ہوا تھا۔ اُس کے خاندان کے تذکرے دلچسپی اور سربرآوردگی سے بالکل خالی ہے۔ بلکہ وہ خود ایک ایسا شخص ہوگیا۔ کہ اُسکے حالات کسی خاص خاندانی پارٹی کو وقعت اور عزت حاصل کرانے کی حد سے اس درجہ تک بڑھ گئے۔ کہ تمام روئے زمین کی آبادی ایک اعلےٰ درجے کی قوت بشری کو اس کی مضبوط ہمت اور اس کے بشاش چہرے سے ظاہر ہوتے دیکھکر اسے اپنا سرمایۂ افتخار سمجھنے لگی۔ اس کی کامیابیاں زمانے کو چونکا چونکا کر بتانے لگیں۔ کہ انسان کا حوصلہ ان چھوٹے اور کمزور ہاتھ پیروں پر ترقی دینے سے کس درجہ وسیع ہو سکتا ہے۔ ہمارا خیال ہے۔ کہ نیکنامی اور ساری دنیا کی عزت اور بزرگی کو اس کے قدموں سے بہت کچھ بدولی ہوگی۔ اور یہ بھی ہم دعوے کر کے کہہ سکتے ہیں۔ کہ جن استدلالات سے انسان تمام مافی الکون پر شریف اور واجب التعظیم ثابت کیا جاتا ہے۔ انہیں سے ایک اعلےٰ درجے کی مضبوط دلیل وہ بھی ہوگی۔ جو اس حوصلہ مند مسافر کی سوانحعمری سے استخراج کی گئی ہے۔ گو اس کے نقش قدم بھی بعد آنے والے ہجوم خلائق کے پیروں نے مٹا کر رکھدیئے۔ مگر ہنیں اس نے اپنا نقش قدم تواریخ کے ان مبارک صفحوں پر جمادیا ہے۔ جن پر زمانے کی عمر کا پورا حال لکھا جا چکا اور لکھا جاتا ہے اور ہمیشہ تک لکھا جائیگا۔ اور جو شہیدان قوم کے ایسے گنج شہیداں ہیں۔ جسمیں وہ ہمیشہ زندہ موجود رہینگے۔ اور نسل انسان کے عام لائق لوگ ان سے اپنی طبع آزمائی کی نظریں چُراتے رہینگے۔ اس اولوالعزم مسافر سے ہماری مراد کلمبس ہے۔ جس نے پہلے پہل امریکہ کا پتا لگایا تھا۔

یہ حوصلہ مند عالی ہمت شخص جس کی نسبت ہماری ہندوستانی اصطلاح کے موافق کہا جا سکتا ہے۔ کہ اس نے اپنے تئیں زمین کا گز بنا دیا تھا۔ بچپنے ہی سے سفر کا ایک شائق نہیں عاشق تھا۔ جب اس کا جہاز سمندر میں چلا جاتا تھا۔ اور لوگ راہ کے پانی اور خشکی کا سراغ لگنے سے مایوس ہوکر بدحواس ہو رہے تھے۔ اس وقت یہ مارے خوشی کے پھولا نہیں سماتا تھا۔ یہ دل ہی دل میں خدا کا شکریہ ادا کرتا تھا۔ کہ آج اس کی آرزو پوری ہوئی۔

ایشیا کے مغربی حصہ ملک عرب کی یہ ایک مثل مشہور ہے۔ کہ وہ کہا کرتے تھے السفر وسیلۃ الظفر۔ ان کا مقولہ گوکہ نہایت درجہ تک صحیح تھا۔ مگر اور کسی قوم نے سفر کے ذریعے سے

ایسی کامیابی نہ حاصل کی ہوگی جیسی کہ اُن لوگوں نے حاصل کی۔ اُن کے سفر عالم نے اس امر کی بہت بڑی نظیر ہوگئی۔ کہ انسان خواہ وہ کیسے ہی افلاس اور ذلت کی حالت میں ہو۔ مگر جب کہ وہ اولوالعزمی کے ساتھ سفر شروع کر دیتا ہے۔ اور غریب الوطنی کے تمام مصائب کو خندہ پیشانی کے ساتھ جھیل جاتا ہے۔ تو وہ نہایت بیش بہا کامیابی حاصل کرتا ہے"

اہل عرب کے سفر جس پریشان حالی میں ہوئے۔ ان کے مثل دنیا میں ہرگز نہ واقع ہونگے۔ پہلے پہل جس وقت وہ سواحل عرب کو طے کرنے نکلے تھے۔ اُس وقت ان کو دو دو روز میں ایک ایک خرما لغیب ہوتا تھا۔ جو اُن کا قوت تھا۔ جب بلاد شام پر وہ پہنچے تھے۔ ان کے پاس خیمہ ڈیرہ وغیرہ کے قسم سے کوئی سامان نہ تھا۔ تمام مصیبتیں انہوں نے اپنے سر پر لیں۔ برف کو وہ اپنے سروں پر روکتے تھے۔ جن قوموں کا مقابلہ تھا ان کو یہ ابتدائی خیال پیدا ہوگیا تھا۔ کہ یہ لوگ مصائب سفر کو اس بے سروسامانی کے ساتھ ہرگز نہ برداشت کر سکینگے۔ خصوص برف کے بالکل نہ متحمل ہو سکینگے۔ ہم کو ان سے مقابلہ کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے آسمانی بلائیں جو ہماری مددگار ہیں ان کے سروں پر نازل ہونگی۔ وہ جلد اُن کے قدم اُکھاڑ دینگی۔ یہ خود بخود بھاگ جاوینگے۔ مگر اس جفاکش قوم نے ہرگز اس کا خیال نہیں کیا۔ بلکہ نہایت استقلال، و محنت کے ساتھ چھ چھ مہینے تک اُن لوگوں کو گھیرے رہی۔ پچھلی لڑائی جو پاک شہر بیت المقدس کے واپس لینے کے لئے تمام اہل یورپ اور مسلمانوں سے ارض فلسطین پر ہوئی تھی۔ گو جس میں یورپین کو کامیابی نہیں ہوئی۔ مگر اُن کی ترقی کا پہلا زینہ وہی واقعہ تھا۔ کیونکہ یورپین مورخین خود معترف ہیں۔ کہ اس لڑائی کا یہ نتیجہ ہوا۔ کہ اہل یورپ ایشیا والوں سے ملے۔ اور اُن کو سفر کی عادت پڑی۔ اور تجارت کا سلسلہ بھی ان لوگوں میں شروع ہوگیا۔

ہمارا خیال ہے۔ کہ سفر کی خوبیاں اس سے بڑھ اور کسی طریقہ پر ہرگز نہیں بیان کی جا سکتیں۔ کیونکہ یہاں پر یہ بات وضاحت کے ساتھ ثابت ہوگئی۔ کہ سفر ایسی چیز ہے جس میں اگر ناکامی حاصل ہو۔ تو بھی کوئی نہ کوئی دلچسپ فائدہ ضرور ہاتھ لگتا ہے"

ہم اپنے ملک کو (جو ہم وطنوں کو ایسی ہی محبت کے ساتھ پسند ہے۔ کہ کبھی

اُس سے ترک کرنے کی جرأت نہیں رکھتے۔ اور کبھی ان کا جوشِ الفت سے بھرا ہوا
دل اُس کی مفارقت گوارا نہیں کرتا) ایک بہت بڑی دلگیر دولت فرض کرتے ہیں۔ جو
کبھی ہاتھ سے نہ دی جائے۔ مگر اس کے ساتھ ہی کہنا نہایت درجہ ضرور ہے۔ کہ
یہ دولت کن لوگوں کے ہاتھ میں رہی یقیناً یہ بیش قیمت اور قابل عزت بلکہ عزت
حاصل کرانے والی دولت ہمیشہ چند مسافروں کے ہاتھ میں رہی جو کبھی کبھی فتح کر کے
چلے گئے۔ اور اکثر اس کو اقامت گاہ قرار دیکر اسی جگہ سکونت پذیر ہو گئے۔ آرین مقدس
جماعت نے اس کو فتح کیا۔ اور اس کے حاکم ہو گئے۔ حکومت کے ساتھ انہوں نے اسے
وطن بھی بنالیا۔ پھر جب دوسرا دور شروع ہوا۔ اسلامی فاتح قوم نے ابتداً ایک بالکل
غیر مانوس ملک کی مسافرت اختیار کر کے اس دولت کو اپنے قبضہ میں کر لیا۔ کچھ دنوں
یہ لوگ مسافر ہی بن کر حاکم رہے۔ پھر یہیں سکونت پذیر ہو کر اس ملک کے باشندے
قرار پاگئے۔ اب تیسرا دور شروع ہوا۔ اور برٹش فاتحہ نے سب سے بڑا عظیم الشان
سفر اختیار کر کے اُس کو اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔ جو آجتک مسافر ہیں۔ اور جنہوں
نے ابھی تک ہندوستان کو اپنا وطن قرار دینے کے قابل قدامت نہیں حاصل
کی ہے۔ بہر تقدیر ہندوستان عموماً غیر قوموں ہی کا محکوم رہا کیا۔ بلکہ ہمیشہ بڑی عزت
کے ساتھ اُولو العزم اور عالی ہمت مسافروں کی مہمانی کرتا رہا۔ سب سے بڑھ کر
عجیب و غریب حیرت پیدا کرنے والا وہ خیال ہوگا۔ جو اب میں بیان کرونگا۔ اور
جو اس وقت ہندوستانیوں کے ذہن نشین ہے۔ اور ان کی حالت سے ظاہر
ہو رہا ہے۔ یہ لوگ جو سفر کو نہایت ہی بُرا اور غیر قابل قدر بلکہ بالکل بے فائدہ
خیال کرتے ہیں۔ جب اُس ملک کے باشندے ہیں۔ جو ہمیشہ مسافروں کو عزت
کے مسند پر جگہ دیا گیا ہے۔ تو ان سے بڑھکر کون حیرت انگیز قرار پا سکتا ہے
اگر اہل عرب وغیرہ جو سوائے ایک وقت کی ترقی آمیز پھیلاؤ کے ہمیشہ اپنے
ملک تک ہی رہا کئے۔ اور جن کے ملک نے غیر قوموں کو اپنے وہاں بہت کم جگہ دی
تو چنداں بعید نہیں۔ کیونکہ وہ ہمیشہ وطن دوستی اور اقامت وطن کے پابند رہے اگر
نکلے بھی تو وہی نکلے۔ کوئی دوسرا اُن کی سرزمین پر عزت کے ساتھ نہ آسکا۔ مگر ہمارے
اہل وطن آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں۔ کہ یہاں ہمیشہ وہی قومیں جو مسافر بن کر

آئی تھیں۔ بڑی عزت کے ساتھ ہیں۔ لیکن اس پر بھی وہ نہیں سمجھتے۔ کہ سفر کیسی بیش قیمت چیز ہے۔

مسلمان اگر اپنے اس دینی مرکز کی طرف رجوع کریں۔ جو ان کی شریعت کا مبدا ہے اور جس سے خدا کا مقدس قرآن مجید مراد ہے۔ تو ان کو بخوبی معلوم ہو جائیگا۔ کہ سفر کیسی نادر اور عمدہ چیز ہے۔ قرآن بتا رہا ہے۔ کہ "سیروا فی الارض" یعنی زمین کی سیر کرو۔ اصول شریعت پر اگر ہم غور کریں۔ تو شاید یہ آیت فی نفسہ اپنے ظاہری حکم سے ہم کو سفر کرنے کی اجازت نہیں دیگی۔ بلکہ سفر کرنے پر مجبور کر دیگی۔ یہ مسئلہ اصول فقہ کا مسلم ہے۔ کہ امر وجوب پر دلالت کرتا ہے۔ لہٰذا "سیر کرو" صیغہ امر کا بھی منشا قرار پائیگا۔ کہ سفر کرنا ہم پر واجب ہے۔ اور بغیر اس کے ہم گنہگار قرار پائینگے۔

ہم نے یہ پست ہمتی کو ترقی دینے والی بات ملک میں دیکھی ہے جس کا ظہور اکثر اوقات انہیں لوگوں کی جانب سے ہوا کرتا ہے۔ جو سفر کر چکے ہیں۔ اور ملک میں تجربہ کار کے لقب سے پکارے جاتے ہیں۔ وہ لوگ اپنی جفاکشی کی داد خواہی کے لئے نوجوانوں سے اکثر بیان کر چکے ہیں۔ کہ سفر میں بڑی تکلیفیں ہوتی ہیں۔ انسان طرح طرح کی مصیبتوں میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ خرابی یہ ہے۔ کہ وہ لوگ اسی پر کفایت نہیں کرتے ہیں۔ بلکہ نوجوان لوگوں کی جانب اکثر خطاب کر کے یہ بھی کہا کرتے ہیں۔ کہ سفر کی تکلیف آپ لوگ ہرگز نہیں اٹھا سکتے۔ آپ کی ناتجربہ کاری سے آپ لوگوں کو بڑے بڑے صدمے پہنچینگے۔

اس قسم کے امور عموماً نہایت درجہ زور دیکر بیان کئے جاتے ہیں۔ اور ان باتوں سے جو ہمارے ملک کے تجربہ کاروں سے سنی جاتی ہیں۔ عام نوجوانوں کے ولولوں اور جوشوں کو نقصان پہنچتا ہے۔ ہمارا خیال ہے۔ کہ یہ بالکل غلط خیالات ہیں۔ انسان جب سیر کرتا ہے۔ عام اس سے کہ وہ کسی رتبہ و درجہ کا ہو۔ اس کو ہزار تکلیفیں پہنچیں۔ ور لاکھ مشقتیں اٹھانا پڑیں۔ مگر وہ خواہ مخواہ اس کی برداشت کرنے پر مجبور کر دیا جاتا ہے۔ اگر کوئی شخص فخریہ بیان کرے۔ کہ میں سفر میں ایسی ایسی مصیبتوں کا متحمل ہوا۔ تو اس کی بہت بڑی غلط فہمی ہے۔ ہم دریافت کرتے ہیں۔ کہ اگر وہ شخص متحمل نہ ہوتا۔ تو کیا کرتا۔ انسان جیسے کوئی موجب مسافرت اختیار کرے گا۔ اس وقت اس کو تمام محنتیں اور مشقتیں نہایت اپنی پوری ہمت اور جرأت صرف کرنا پڑیگی۔ فی نفسہ سفر کرنا بہ نسبت انسان کیلئے

بے خبری کی چیز ہے۔ مسافر کی تکالیف کا متحمل ہونا اُس کی کوئی عزت کی علامت نہیں ہے
کیونکہ یہ اتفاقاً اُس پر آپڑی تھیں جن کی برداشت کرنے پر مجبور کردیا گیا - ہم اپنی
قوم سے اُمید کرتے ہیں۔ کہ وہ ایسی ہمت کو پسپا کرنے والی باتوں کا بالکل خیال نہ کریں
اور سفر کو اپنی ترقی کا ضرور مبدء سمجھیں۔ جس پر اُن کے دین اور اُن کے دنیاوی طرز
معاشرت کے اصول منحصر ہیں۔

## بغیر سبزہ نہ پوشد کسے مزار مرا
## کہ قبر پوش غریباں ہمیں گیاہ بس است

یورپ کے جادو نگار ویسٹ منسٹر ایبی کا سماں دکھانے میں ہمیشہ اپنی قوت صرف
کردیا کئے ہیں۔ اور حقیقت میں وہ ایسا ہی مقام ہے۔ ایسا مقام اور کہاں نظر آسکتا ہے
جہاں بہت بڑے بڑے اولوالعزم شاہزادے۔ شاہزادیاں مشہور ومعروف علما۔ نازک
خیال شعرا بہادر اور فتحمند سرداران فوج غرض ملک کے تمام نامور آرام کر رہے ہیں اور
قدردان ابنائے ملک نے اُن قبروں کو اُن کی حالتوں کا آئینہ بنا دیا ہو۔

اسلامی دین کے ترقی پذیر زمانے میں ہمیں ہر قسم کے باکمال نظر آتے ہیں۔ اُن کے نام
آسمان کے تاروں کی طرح تمام دنیا میں آجتک چمک رہے ہیں۔ جن کی روشنی کبھی نہ ماند پڑی
اور نہ پڑیگی۔ تاریخوں کے صفحات اُن کے حالات میں کبھی اجمال سے اور کبھی تفصیل سے بتا
دیا کرتے ہیں۔ مگر کوئی ایسا مقام شاید دنیا بھر میں نہ ملیگا۔ جو نامورانِ اسلام کا عام
خوابگاہ ہو۔ افسوس ہم ایسے ناقدردان ہیں۔ کہ ان کے دائمی خوابگاہوں کی بھی نگہداشت
نہ کرسکے۔ اسپین کی زمین پر تو غیر قوم کی سرد مہریوں نے ظلم کیا۔ مگر یہ بتایئے کہ دمشق کے سبزہ
زاروں میں اور خاک بغداد پر کون ظلم کرنے آیا تھا۔ جو قدیم پرورش اسلام کے ودیعت رکھے
ہوئے تبرکات یا یادگاریں اس طرح خاک میں مل گئیں۔ کہ آج ہم کسی نامور کا مدفن ڈھونڈنے
نکلیں۔ تو حسرت بھٹکاتی پھریگی۔ اور ناامیدی آخر تھکا کے بٹھا دیگی۔ اگر جستجو کریں۔ تو
بعض بعض مقامات میں کچھ ناموروں کا پتہ مل ہی جائیگا۔ مگر ہم میں کوئی ایسا بھی تو نہیں
جسے اپنے قدیم ناموروں سے ایسی محبت ہو۔ کہ انکے مرقدوں کو تلاش کرنے نکلے۔ اصل یہ ہے۔ کہ
یہ ہماری بے پروائی ہے۔ ورنہ اگر ہم ڈھونڈیں۔ تو بہتوں کا پتہ لگالیں:

انصاف سے پوچھیے ۔ تو شہر دہلی کا ہر قطعہ زمین ہمارے لیے وسٹ منسٹر ایبے ہے ۔ کوئی جائے ڈھونڈے اور عبرت کی نظر سے دیکھے ۔ تو معلوم ہو ۔ کہ کیسے کیسے باکمال اور اپنے اپنے زمانہ کے بے مثل اور بے نظیر مشاہیر دہلی کی خوش نصیب خاک میں آرام کر رہے ہیں ۔ میں نے اپنی زندگی میں دہلی کے کھنڈروں سے زیادہ عبرت ناک تماشا آج تک کہیں نہیں دیکھا ۔ دہلی ہی ہندوستان میں ایک ایسا شہر ہے جس میں انسان شہر پناہ کے پھاٹکوں سے نکلتے ہی شہر خاموشاں کی آبادی کی سیر کرنے لگتا ہے

جدید شہر شاہجہان آباد سے جنوب کی طرف تین چار میل پر خواجہ نظام الدین اولیا کا مشہور مقبرہ ہے ۔ اگرچہ وہ مقام اعتقادی عام مرجع کی وجہ سے حضرت نظام الدین اولیا ہی کی جانب منسوب کر دیا گیا ہے ۔ مگر عبرت کی نظر سے دیکھیے ۔ تو اس قرب و جوار میں گذشتہ صدیوں کے بڑے بڑے نامور آرام کر رہے ہیں ۔ خواجہ صاحب طاب ثراہ کے شمالی پہلو پر بلبل ہند اور نظم فارسی کے نامور موجد امیر خسرو ایک گنبد کے نیچے اپنے حجرے میں آرام کر رہے ہیں ۔ اور اسی صحن میں شمال کی طرف ذرا ہٹ کے دیکھیے ۔ تو مغلیہ خاندان کے شاہزادوں کی تربتیں نظر آئیں گی ۔ انہیں کے ضمن میں ایک سنگ مرمر کی خوشنما چار دیواری کے اندر مغلیہ شہنشاہی دہلی کا عالم شباب دیکھنے والے نیک نام فرمانروا شاہجہان بادشاہ کی بیٹی جہاں آرا بیگم کی قبر ہے ۔ قبر پر سنگ مرمر کا تعویذ بنا ہے ۔ تعویذ میں کھود کے ایک طولانی تیلا سا حوض نکالا گیا ہے ۔ جس میں ہری ہری دوب لگی ہے ۔ اور قبر کے سرہانے سنگ مرمر کا ترشا ہوا اور پالش کیا ہوا ایک تختہ نصب ہے ۔ جس پر یہ شعر اور عبارت کندہ ہے ۔

بغیر سبزہ نہ پوشد کسے مزار مرا — کہ قبر پوش غریباں ہمیں گیاہ بس است

"عاصیہ جہاں آرا بنت شاہجہان بادشاہ غازی ۔ مریدۂ خانوادۂ چشت"

لوگوں کے بیان سے معلوم ہوتا ہے ۔ کہ یہ شعر اسی عفت مآب خاتون کی نازک خیالی کا نمونہ ہے ۔ خواہ صحیح ہو یا غلط مگر انسان کی طبیعت پر اس قبر کی زیارت کر کے جیسا اور جس قدر اثر پڑتا ہے ۔ اور کہیں ممکن نہیں ۔ اس مرحومہ کی تربت پر نہ کوئی ایسا سامان ہے ۔ جو لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کرے ۔ نہ کوئی ایسی بڑی عمارت ہے ۔ جس سے اس کی شان و شوکت اور ثروت و حشمت کا اندازہ ہو سکے ۔ تنہا [illegible] ہے ۔ وہ صرف تھوڑی سی ہری ہری گھاس ہے جو تربت [illegible] جس کی طرف یہ [illegible] حسرت کی نگاہوں سے اشارہ کر رہا ہے ۔

ہاں یہ عفیفہ شاہزادی اس کے علاوہ ایک اور بھی یادگار چھوڑ گئی ہے ۔ جو بدقسمتی

کے صفحوں پر بھی ہو۔ مگر ہم تک تو صرف وہاں کے مجاوروں کے ذریعہ سے پہنچی ہے۔ وہ یہ کہ جب یہ
شاہزادی مرض موت میں مبتلا ہوئی۔ اور موت کا یقین آگیا۔ اس وقت اپنی کل جائداد (جو علیٰ
اختلاف الروایات تین کروڑ یا تین لاکھ تھی) کی نسبت وصیت کر دی۔ کہ جناب خواجہ صاحب
برد اللہ مضجعہ کے خدام پر وقف کر دیجائے۔ اس وقت شاہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر کے
ایسے حامی دین بادشاہ کا دور تھا۔ یہ کب ممکن تھا۔ کہ خلاف شرع کوئی کارروائی ہو سکے۔ عالمگیر
نے فیصلہ کیا۔ کہ وصیت صرف ایک ثلث پر جاری ہو سکتی ہے۔ لہذا مرحومہ کی ایک ثلث
جائداد تو حسب وصیت خواجہ صاحب کے مقبرے کی نظر کیجائے۔ اور دو ثلث ورثا پر تقسیم ہو
اگرچہ اس فیصلہ نے مرقد مبارک کے خدام کی بڑی دل شکنی کی ہوگی۔ مگر انصاف سے دیکھئے۔ تو
وہی ہوا جو حق تھا۔ اس فیاض اور عقیدتمند شاہزادی کی سیر چشمی اور دینی جوش اور عالمگیر کی
راستبازی اور سچی پابندی شریعت دونو باتوں کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ شاہزادی جہاں آرا
بیگم کی یہ یادگار بھی اگرچہ آب زر سے لکھنے کے قابل ہے۔ مگر دل پر اثر کرنے والی اور خوابگاہ
کی طرف سر انکلنے والے کے دل کو بے قابو کر کے مجسم عبرت کی تصویر دکھا دینے والی اس کی قبر
ہی ہے۔ میں نہیں کہہ سکتا ہوں۔ کہ جس وقت اس شہزادی کے دائمی خوابگاہ کی طرف میرا گذر
ہوتا ہے۔ میری کیا کیفیت تھی۔

اور کہیں جانے کی ضرورت نہیں۔ خود دہلی میں سینکڑوں ایسے عالی مرتبہ ناموروں کے
کے مزار موجود ہیں۔ جن کی شکستہ قبریں دیکھکے ان کی اگلی عظمت اور شان کا خیال کیجئے۔ تو خدا
جانے کن کن باتوں کا نقشہ آنکھوں کے سامنے پھر جائے۔ وہاں قریب ہی ایک سنگ مرمر کے
سفید عالیشان گنبد کے نیچے ہمایوں نہایت آرام اور سکوت سے آرام کر رہا ہے۔ ہمایوں
کے پہلو میں خاندان تیموریہ کے بہت سے فلک رتبہ بادشاہ بہت سے شاہزادے بہت
سی شاہزادیاں خواب استراحت میں ہیں۔ ہمایوں کا مقبرہ گویا ارکان و وارثان دولت مغلیہ کا
گنج شہیداں ہے۔ ہمایوں کے مقبرہ کی عالیشان عمارت جس پر انقلاب روزگار نے ایک
حیرت انگیز سکوت طاری کر دیا ہے۔ اس کے گرد کے باغ کی ویرانی اور کس مپرسی کی حالت
اور پھر یہ خیال کہ اس زمین میں کیسے کیسے جلیل القدر اور شان و شوکت کے بادشاہ دفن ہیں۔
اگرچہ یہ سب مل کے ایک عجیب طرح کی حسرت اور عبرت دل میں پیدا کر دیتے ہیں۔ مگر پھر
بھی انصاف کیجئے۔ تو جو عالم عبرت جہاں آرا بیگم کی مختصر قبر دیکھکے آنکھوں کے سامنے ہو جاتا

ہے۔ اور اُس قبر کے سرہانے یہ شعر پڑھ کے جو سامان یاس و عبرت نظر آجاتا ہے کہیں نہیں۔

جہاں آرا بیگم اپنے باپ کی لاڈلی بیٹی تھی۔ باپ کے تمام ذاتی کاروبار خاص اسی شاہزادی کے ہاتھ سے اجرا پاتے تھے۔ شاہجہان کو جو اعتماد اس بڑی چہیتی شاہزادی پر تھا کسی شاہزادے پر بھی نہ تھا۔ کوئی مفصل تاریخ ہے۔ تو معلوم ہو۔ کہ یہی شاہزادی کس ساز و سامان اور جاہ و حشم سے رہتی تھی۔ حسن و جمال میں بھی اپنے زمانے میں بے مثل مشہور تھی۔ اور دور دور شہرہ تھا۔ ہم گھڑی بھر کو اپنے تئیں اُس کے زمانے میں پہنچا دیں۔ تو اُس کا وہ دبدبہ اور اقبال نظر آجائے جس پر کسی عہد میں دہلی ناز کر رہی تھی۔

ہمیں خیال دکھاتا ہے۔ کہ جہاں آرا بیگم کی سکھپال کے ساتھ ہزارہا سوار اور پیادے برہنہ تلواریں لئے ہٹو بچو کرتے چلے جاتے ہیں۔ نقیب بول رہا ہے۔ اور فوجی طبل کی آواز آسمان کی سطح سے ٹکرا ٹکرا کر گونج رہی ہے۔ تمام ممالک محروسہ میں کوئی نہیں۔ جو ذرا بھی حکم سے سرتابی کر سکے۔ جن مکانوں میں رہتی ہے۔ جن کمروں میں سوتی ہے۔ یا جن باغوں کی سیر کرتی ہے اُن کے ساز و سامان کو دیکھ کر انسان کی عقل دنگ ہو جاتی ہے یا اب اُسی شاہزادی کو موت نے کچھ ایسا بے کس و بے بس اور سادہ مزاج بنا دیا ہے۔ اور طبیعت میں ایسی بے تکلفی پیدا کر دی ہے۔ کہ خاک پر لیٹی ہوئی ہے۔ وہ زریں لباس مخملیں فرش تو خیال سے جاتے رہے مگر ناز و نعم پروردہ ہونے یا نازنین ہونے یا شاہانہ نفاست مزاجی کی وجہ سے اپنے سکوت کی دائمی زندگی کی راحت کیلئے سر نکلنے والی سے کہہ رہی ہے "بغیر سبزہ نہ پوشد کسے مزار مرا۔ کہ قبر پوش غریباں ہمیں گیاہ بس است"۔ اس بے تکلفی کی کوئی انتہا بھی ہے؟

کوئی کہہ سکتا ہے۔ کہ شاہزادی کبھی سبزہ پر بیٹھی بھی تھی؟ کوئی نہیں کہہ سکتا۔ جس بزم میں اس کی زندگی گذرتی ہوگی۔ وہاں تک تو سبزہ کی رسائی بھی دشوار تھی۔ یا تو وہ زمانہ تھا کہ صرف اتنی بدگمانی پر کہ سبزہ کی پتیاں گرد آلود ہونگی۔ اس کی خوشگوار اور نظر فریب سبزی بھی آنکھوں سے گری جاتی تھی۔ اور یہ پاکیزہ طبیعت ملکہ اپنے پھول سے پاؤں رکھنا بھی عیب سمجھتی تھی۔ یا آج اُسی سبزے کو شوق و ذوق سے اپنی دائمی چادر بنے رہنے کی آرزو مند ہے حیرت ہے۔ کہ یہ خلاف مزاج آرزو کیونکر اس کے دل میں پیدا ہوئی۔ اس کا سبب (افسوس!) موت ہے! موت انسان کو بے بس کر دیتی ہے۔ کیسے کیسے اولوالعزم بادشاہ گذر چکے ہیں مگر آج

ون میں سے کتنے ہیں جن کے نام کا دنیا میں کہیں بھی پتہ چلتا ہو۔ جب موت کی سرد مہریاں ایسے ایسے نمونے پیش کر رہی ہیں۔ تو اگر یہ شاہی گودوں میں پلی ہوئی شاہزادی صرف اتنی ہی امیدوار ہے۔ کہ بس قبر کو سبزہ چھپائے رہے۔ تو کون تعجب کی بات ہے۔

میں نے اکثر قبروں پر صدہا کتابے دیکھے ہیں۔ ایسے بھی دیکھے ہیں۔ جن سے زیادہ سامان حسرت کہیں نہ ملیگا۔ مگر جو وجد کی کیفیت جہاں آرا بیگم کی قبر نے میرے دل میں پیدا کر دی وہ اور کہیں نہیں نظر آ سکتی۔ اکبر کے مقبرے کے گرد کے اشعار ایسے ہیں۔ کہ انسان کے خیال سے کبھی نکل جائیں۔ تغلق کے قلعہ اور مقبرے سے جس مٹی شان و شوکت کا سماں نظر آتا ہے۔ شاید اور کہیں کم نظر آئیگا۔ مگر جو کیفیت مندرجہ بالا شعر دل میں پیدا کر دیتا ہے وہ اور کہیں نہیں پیدا ہوتی۔ بے شک جہاں آرا بیگم کی قبر ہندوستان میں ایک دیکھنے کی چیز ہے۔ اور جنہیں ذوق سلیم ہو۔ وہ اگر نہ دیکھیں۔ تو اُن سے زیادہ ناقدر جنس اور کوئی ثابت نہ ہوگا۔

## جاہلیت کا شجاعانہ عشق (جولائی ۱۸۸۹ء)

عرب کی جرأت اور بہادری کے نمونے مورخین نے بہت دکھائے۔ پھر بھی بعض ایسے واقعات ہیں۔ جن کو سنکر اب بھی لوگوں کو ایک نئے قسم کی حیرت پیدا ہو جائیگی۔ اُن لوگوں میں دو باتیں قیامت کی تھیں۔ ایک شجاعت دوسرے وفاداری اور راستبازی جہاں خود شجاع تھے۔ وہاں کسی دوسرے بہادر کی قدردانی اور احسانمندی میں بھی انہوں نے اپنے آپ کو سب سے اعلےٰ اور افضل ثابت کر دیا ہے۔

ایک روز حضرت رسولؐ کے دوسرے جانشین حضرت فاروق رضی اللہ عنہٗ کے بے تکلف اور سادے دربار میں چند صحابہ جمع تھے۔ جنہیں تعلیم نبوت نے انتہا درجہ کا سادہ مزاج اور خداشناس بنا دیا تھا۔ انہیں میں ایک عمرو بن معدی کرب زبیدی بھی تھے عمرو بن معدی کرب بڑے مشہور شجاع اور نامی شہسوار تھے۔ اور لوگوں میں تو حضرت رسولؐ کی تعلیم نے جوش پیدا کر دیا تھا۔ مگر یہ ایسے شخص تھے۔ جن کی شجاعت و شہسواری کی جاہلیت میں بھی دھوم تھی۔ اور بعد ظہور نیر اسلام ایران اور شام و مصر کے اکثر میدانوں میں اُن کی تلوار کی چمک نے انہیں اوروں سے زیادہ ممتاز ثابت کر دیا تھا۔ اور سن رسیدگی اور تجربہ کاری کی وجہ سے اکثر صحابہ اُن کی تعظیم

کرتے تھے۔

باتوں باتوں میں حضرت عمر نے عمرو بن معدی کرب سے کہا "اکثر معاملات میں تمہارے تجربہ بڑھے ہوئے ہیں۔ بتاؤ اپنی زندگی میں تم نے سب سے زیادہ بزدل سب سے زیادہ مکار اور سب سے زیادہ شجاع کس کو پایا؟

عمرو بن معدی کرب کہنے لگے۔ مجھے بہت لوگوں سے ملنے کا اتفاق ہوا ہے۔ مگر واقعی بعض اتفاقات ایسے پیش آئے ہیں۔ کہ جب میں اپنے حالات پر غور کرتا ہوں سب سے پہلے وہی یاد آجاتے ہیں۔

ان دنوں میری زندگی تاخت و تاراج میں گذرا کرتی تھی۔ اور میرے خاندان کی اسی پر بسر تھی۔ علاوہ بریں میری شجاعت ایسی مشہور ہوگئی تھی۔ کہ میرا نام سن کے لوگوں کے حوصلے پست ہوجایا کرتے تھے۔ اور کسی کو مقابلہ کی جرأت نہ ہوتی تھی۔ اس وجہ سے اپنی ڈکیتیوں میں میں کامیاب بھی زیادہ تھا۔ ایک دن اسی غرض سے نکلا۔ اور کسی آنے جانے والے مسافر کی جستجو میں چلا جاتا تھا۔ کہ دیکھا۔ ایک جگہ ایک گھوڑا کھڑا ہے اور اسی کے برابر زمین پر نیزہ گڑا ہوا ہے۔ اور نیزہ کے قریب ہی ایک شخص زمین پر بیٹھا ہے۔ میں جھپٹ کے اس شخص کے قریب پہنچا۔ اور کہا "سنبھل جا کہ تیرا قاتل آپہونچا"۔ وہ پوچھنے لگا "اچھا یہ تو بتاؤ۔ تم کون ہو؟" میں نے کہا "عمرو بن معدی کرب زبیدی"۔ بس اتنا سننا تھا۔ کہ وہ شخص سہم کے زمین پر گر پڑا۔ دیکھا تو بیجان تھا۔ امیر المومنین۔ اس سے زیادہ کون بزدل ہوسکتا ہے؟ یہ شخص تو مجھے اپنی عمر میں سب سے زیادہ بزدل نظر آیا۔ اب جسے میں نے سب سے زیادہ مکار پایا۔ اس کا حال سنیئے۔

یونہی ڈکیتی کی نیت سے اور ایک بار چلا۔ جاتے جاتے ایک مقام پر دیکھا۔ کہ اسی طرح نیزہ گڑا ہے۔ گھوڑا بندھا ہوا ہے۔ اور کوئی شخص دور بیٹھا ہوا پیشاب کر رہا ہے۔ میں نے فوراً گھوڑے کو ایڑ بتائی۔ اور پاس جا کے اسی طرح ڈپٹ کے کہا "سنبھل جا کہ تیرا قاتل آپہنچا"۔

اس شخص نے میرا کچھ خیال نہ کیا بلکہ کہا "کیا سچ مچ مجھ سے لڑو گے؟"

میں "اب یہ سمجھ لے۔ کہ یہ تلوار تیرا کام تمام کیا چاہتی ہے۔"

وہ "ہوں۔ تمہارا نام کیا ہے؟"

**میں** "عمرو بن معدی کرب زبیدی"

**وہ** "آہا! تم ہو! مگر یہ انصاف نہیں ہے"

**میں** "کیوں"

**وہ** "میں پاپیادہ اور تم سوار اگر جرأت اور بہادری سے لڑنا چاہتے ہو۔ تو قسم کھاؤ۔ اور عہد کرو۔ کہ جب تک میں گھوڑے پر سوار نہ ہولوں۔ تم میرے مقابلے کا ارادہ نہ کرو گے۔

میں نے قسم کھائی۔ اور پختگی سے اقرار کیا۔ کہ جب تک تم سوار نہ ہو لو گے۔ ہرگز نہ لڑوں گا۔

یہ سن کر وہ شخص اٹھا۔ اور گھوڑے کے قریب آکر اطمینان سے بیٹھ گیا۔

**میں** "یہ کیا"

**وہ** "نہ گھوڑے پر سوار ہونگا۔ اور نہ لڑائی کی نوبت آئیگی۔ اگر تم خلاف عہد کرو گے۔ تو تمہیں خود ہی معلوم ہوگا۔ کہ بدعہدی کا کیا انجام ہے۔

اے امیر المومنین۔ مجھے سوا اس کے کچھ نہ بن پڑا۔ کہ اس کو چھوڑ کے میں نے اپنا راستہ لیا۔ اس شخص سے بڑھ کر کوئی مکار اور فقرہ باز آجتک میری نظر سے نہیں گذرا۔ اب اس کا حال سنئے۔ جس کی شجاعت آج تک میرے دل میں نقش ہے۔

اسی رہزنی کے لئے میں نے اور ایک دفعہ صحرا کی راہ لی۔ جاتے جاتے اس موقع پر پہنچ گیا۔ جہاں اکثر تاخت و تاراج کیا کرتا تھا۔ مگر مجھے کوئی مسافر کسی طرف نہ نظر آیا۔ اسی جستجو میں نے اپنا گھوڑا داہنے بائیں۔ دور تک دوڑایا۔ کہ شاید کوئی مل جائے۔ ناگہاں دیکھا کہ ایک خوبصورت اور خوش رو سبزہ آغاز نوجوان گھوڑے پر سوار ہے۔ اور میری طرف چلا آتا ہے۔ اس نوجوان سے زیادہ خوش جمال اور حسین کوئی شخص اس وقت تک میری نظر سے نہیں گذرا تھا۔ یہ خوش رو نوجوان یمامہ کی طرف سے آرہا تھا۔ قریب آکے اس نے سلام کیا اور میں نے جواب سلام دیا۔ اور پوچھا "تم کون ہو؟"

**وہ** "حارث بن سعد"

**میں** "ہوشیار۔ تیرا قاتل آپہونچا"

**وہ** "کمبخت تو کون ہے؟"

**میں** "عمرو بن معدی کرب زبیدی"

**وہ** "کوئی [illegible] ذلیل [illegible] ہے خدا کی صرف یہ سمجھ کے چھوڑے دیتا ہوں۔ کہ تجھ سے ذلیل شخص پر کیا نیزہ [illegible]" امیرالمومنین۔ یہ سن کے میں اپنے دل میں نہایت شرمندہ ہوا۔ اور [illegible] مجھ پر انتہا سے زیادہ گراں گذرا۔

**میں** "اب ان باتوں کو رہنے دے۔ اور سنبھل جا۔ کیونکہ نیزا قاتل میں آیا ہوں۔ میں قسم کھاتا ہوں کہ اب اس میدان سے ہم میں سے ایک ہی شخص زندہ بچ کے جا سکتا ہے"

**وہ**۔ "پھر کہتا ہوں۔ اپنی جان لیکے چلا جا۔ میں اس گھرانے سے ہوں جس میں سے کسی پر آج تک کوئی غالب نہیں آیا"

**میں**۔ "میں بھی ویسا ہی ہوں"

**وہ** "اچھا تو بتا۔ تجھے کیا منظور ہے؟ پہلے میں حملہ کروں۔ یا تو حملہ کریگا؟"

**میں**۔ "میں ہی حملہ کرتا ہوں سنبھل"

یہ کہہ کے میں نے نیزہ مارا اور مجھے یقین تھا کہ میرا نیزہ اس کی پیٹھ توڑ کے نکل گیا ہوگا مگر اپنے گھوڑے پر جھک کے اس نے اس خوبصورتی سے میرا وار خالی دیا۔ کہ مجھے حیرت ہوگئی اور فوراً اس نے اپنا نیزہ میرے سر پر پہنچ کے ہلکا سا کونچا دیا۔ اور کہا "اے عمرو۔ لے یہ پہلا وار ہے۔ اور اگر تجھ سے ذلیل شخص کو قتل کرنا میں اپنی ذلت نہ سمجھتا۔ تو بے شک قتل کر ڈالتا"

امیرالمومنین اس حملہ نے مجھے اور ذلیل کر دیا۔ اور اس وقت مجھے مرجانا زندگی سے زیادہ اچھا معلوم ہوتا تھا۔ اور اسی جھنجلاہٹ میں میں نے کہا۔ "خدا کی قسم یہ نہ ہوگا۔ کہ دونوں زندہ جائیں۔ ایک ہی شخص بچیگا" اس نے پھر پہلے ہی کی طرح پوچھا۔ "اب کیا منظور ہے۔ میں حملہ کروں۔ یا تم حملہ کروگے۔" میں نے وہی پہلا جواب دیکے حملہ کیا۔ اور اس مرتبہ مجھے پھر یقین آگیا۔ کہ میں نوجوان پر قابض ہوگیا۔ مگر اس نے بچ کے میرے سر میں دوسرا کونچا دیا اور کہا یہ دوسری ہوئی۔ اب میں ذلت کے دریا میں غرق ہوگیا۔ میں پھر سہ بارہ مقابلہ پر مستعد ہوا۔ اس دفعہ نیزہ خالی دیتے وقت اس نے ایسی جست کی۔ کہ گھوڑے کی پیٹھ پر نہ جم سکا۔ اور زمین پر آگیا۔ مگر میں اس کے قابو پانے کی قصد ہی میں تھا۔ کہ وہ جھپٹ کے اپنے گھوڑے پر سوار ہوگیا۔ اور نیزے سے میرے سر میں کونچا بتا کے جتا دیا یہ تیسری ہوئی۔ اور صرف ذلیل سمجھ کے تجھے چھوڑے دیتے ہوں

**میں**۔ "نہیں تو مجھے قتل ہی کر ڈال۔ [illegible] عرب کے سوار [illegible] کو میری [illegible] ذلت کی خبر پہنچے"

**وہ**:"اے عمرو گناہ تین ہی بار معاف کیا جاتا ہے۔ اب چوتھی بار میں غالب آیا۔ تو حقیقت میں قتل کر ڈالوں گا۔"

امیرالمومنین اس کے اِس جملہ سے میرے دل میں ایسی ہیبت پیدا ہوئی۔ کہ مجھے پھر مقابلہ کی جرأت نہ پڑی۔ آخر میں اس سے کہنے لگا

**میں**:"میری آپ سے ایک عرض ہے:"

**وہ**:"کیا؟"

**میں**:"میں آپ کے ساتھ رہنا چاہتا ہوں۔"

**وہ**:"نہیں۔ تم میرے ساتھ رہنے کے قابل نہیں ہو۔"

یہ امر مجھ پر اور ناگوار گذرا۔ مگر میں اس کی ہمراہی پر برابر اصرار کرتا رہا۔ آخر جھلا کے کہنے لگا۔ جانتے بھی ہو۔ میں کہاں جاتا ہوں۔

**میں**۔"خدا کی قسم مجھے بالکل خبر نہیں۔"

**وہ**:"میں موت کو اپنے آنکھوں سے سامنے دیکھ رہا ہوں۔ اور اُس کے مُنہ میں جاتا ہوں۔"

**میں**:"اچھا تو چلو۔"

اب ہم دونوں اُس مقام سے روانہ ہوئے۔ دن بھر چلے گئے۔ رات ہوئی۔ اور ہم برابر چلے جاتے تھے۔ جب تھوڑی رات بھی گذر گئی۔ تو ہم قبائل عرب میں سے ایک قبیلہ کے قریب پہنچے۔ وہاں نوجوان میری طرف دیکھکے کہنے لگا۔ اے عمرو وہ موت اس قبیلہ میں ہے۔ اب یا تو تم میرے گھوڑے کو روکو۔ میں اس قبیلہ میں جاکے اپنی مراد حاصل کر لاؤں۔ اور یا میں تمہارے گھوڑے کو روکے ہوں۔ تم جاکے میرا مطلب پورا کر لاؤ"

**میں**:"نہیں آپ ہی جائیے۔ کیونکہ میں بالکل ناواقف ہوں۔"

یہ سُن کے اُس نے اپنے گھوڑے کی باگ میری طرف اچھال کے پھینکدی اور چلا گیا امیرالمومنین اس وقت خدا کی قسم میں اُس کا سائیس بننے پر راضی ہو گیا۔ نوجوان جاتے جاتے ایک خیمہ میں گیا۔ اور اس میں سے ایک بڑی جمال نازنین لڑکی کو لئے ہوئے نکلا جس کے حسن و جمال، اور نزاکت و لطافت اور ناز و ادا نے مجھے دیوانہ بنا دیا۔ خلاصہ یہ کہ ان آنکھوں نے اس نازنین سے زیادہ حسین آج تک کسی کو نہیں دیکھا۔ نوجوان نے اُس نازنین کو ایک اونٹنی پر سوار کر دیا اور چلا کے مجھ سے کہنے لگا:"اے عمرو یا تو گھوڑوں اونٹنی

کی مہار لے کر چلوں۔ اور تم ادھر ادھر لوگوں کو دیکھتے اور میری حفاظت کرتے چلو۔ ورنہ تم مہار ہاتھ میں لو۔ اور میں تمہاری حفاظت کرتا چلوں"!

میں "میں اونٹنی کو لے کے چلوں گا۔ آپ میری حفاظت کرتے چلئے"

نوجوان نے اونٹنی کی مہار میرے ہاتھ میں دی۔ اور ہم سب روانہ ہوئے۔ یہاں تک کہ جاتے جاتے صبح ہو گئی۔ صبح کو نوجوان میری طرف متوجہ ہوا۔ اور کہنے لگا "عمرو"۔

میں "جناب"

وہ "ذرا پھر کے دیکھو۔ کوئی آتا تو نہیں ہے۔

میں نے دیکھا۔ تو چند شتر سوار لپکے چلے آتے تھے۔ اس نے کہا۔ مجھے کچھ شتر سوار آتے دکھائی دیتے ہیں۔

نوجوان۔ تو اب چلنے میں جلدی کرو" پھر خود ہی بولا "اچھا دیکھو تو کتنے ہیں"!

میں نے دیکھ کے کہا "صرف چار یا پانچ شخص ہیں۔

نوجوان "اچھا بڑھے ہوئے چلو۔ اور ٹھہر کے اونٹوں کے پاؤں کی آواز سننے لگا۔ آواز قریب ہی سنی۔ تو کہنے لگا "اے عمرو" تم راستہ چھوڑ دو۔ اور داہنی طرف جا کے ٹھہرو۔ گھوڑے اور اونٹ کا منہ راستے کی طرف کرو۔ اور پیٹھ اس طرف"!

میں نے ایسا ہی کیا۔ اور وہ خود بائیں طرف جا کے ٹھہرا۔ اتنے میں لوگ آ گئے۔ اب دیکھا۔ تو صرف تین آدمی تھے دو جوان اور ایک دیرینہ سال بوڑھا۔ بوڑھا لونڈی کا باپ تھا۔ اور جوان اس کے بھائی تھے۔ انہوں نے قریب آ کے سلام کیا۔ اور بوڑھے نے کہا "لڑکی ہمارے حوالے کر دو"!

نوجوان "یہ تو نہ ہوگا۔ اور نہ میں لڑکی کو اس لئے لایا ہوں۔

بوڑھے نے اپنے ایک بیٹے کی طرف اشارہ کیا۔ اور کہا تم مقابلہ کو نکلو۔ وہ نیزہ لئے ہوئے نکلا۔ نوجوان حارث نے رجز کے اشعار پڑھ کر حملہ کیا۔ اور ایسا نیزہ مارا کہ پیٹھ توڑ کے نکل گیا۔ اب بوڑھے نے اپنے دوسرے بیٹے کی طرف اشارہ کر کے کہا: اب تم جاؤ۔ کیونکہ اس ذلت کے بعد زندگی بیکار ہے۔ وہ شخص نکلا۔ اور اس کے نکلتے ہی حارث نے پھر حملہ کیا۔ اور ایک ہی وار میں اس کا کام بھی تمام کر دیا"

اب وہ ضعیف العمر شخص خود متوجہ ہوا۔ اور کہنے لگا " لڑکی ہمارے سپرد کر دو۔ اسی میں خیر ہے۔

**نوجوان**:" یہ ممکن نہیں۔ میں لڑکی کو دینے کے لئے نہیں لایا ہوں "

**ضعیف**:" اچھا۔ تم نے دونوں جوانوں کو تو مار لیا۔ اب میں ایک بوڑھا ضعیف رہ گیا ہوں۔ مجھ سے مقابلہ کرنا ہے۔ تو گھوڑے سے ہم دونوں اتر پڑیں اور آپس میں عہد کریں کہ ہم دونوں ایک وار کریں۔ جس کا وار پورا نہ پڑے۔ اور ایک ہی وار میں وہ حریف کا کام تمام کر سکے۔ تو اس کی جان حریف پر حلال ہو جائے۔ اگر میری ایک تلوار میں تیرا کام نہ تمام ہو تو تو مجھے مار ڈال۔ اور اگر تیری تلوار میرا کام نہ تمام کر دے۔ تو میں تجھے مار ڈالوں۔

**نوجوان**:" گھوڑے سے اتر کے بسم اللہ۔ آیئے میں اس شرط پر راضی ہوں۔

**ضعیف**:" نیزہ وار بچا ہے "

یہ کہہ کے نوجوان نے تلوار زور سے بلند کی اور ارادہ کیا۔ کہ اپنے سن رسیدہ حریف کے دو ٹکڑے کر ڈالے۔ ویسے ہی موقع پا کے بوڑھے شخص نے اپنا نیزہ نوجوان کے پیٹ میں مارا۔ نیزہ پڑتا تھا کہ نوجوان کی تلوار بڈھے کے سر پر پڑی۔ اور دونوں ایک ساتھ گر کے مر گئے۔ امیر المومنین ان لوگوں کی شجاعت دیکھ کے میرے ہوش اڑ گئے۔ اب خوش قسمتی سے دو گھوڑے اور کئی اونٹ میرے ہاتھ لگے۔ تمام اسباب یکجا کر کے میں نے اونٹوں پر لادا۔ اور اس نازنین کے اونٹ کی مہار پکڑ کے لے چلا

**نازنین**:" مجھے کہاں لے چلے؟ میں تمہارے لئے نہیں ہوں۔ اور نہ تم میرے قابل ہو "

**میں**:" اب اس وقت خاموش رہو۔ باتوں کا وقت نہیں ہے۔

**نازنین**:" نہیں۔ یہ نہیں ہو سکتا۔ اگر تم میرے شوہر بننا چاہتے ہو۔ تو ایک نیزہ اور ایک تلوار میرے ہاتھ میں دو۔ اگر تم مجھ پر غالب آ جاؤ۔ تو میں تمہاری ہوں۔ ورنہ میں تم کو قتل کر ڈالونگی

امیر المومنین اس کے خاندان کی مردانگی اور شجاعت کا میرے دل پر ایسا رعب طاری ہو گیا تھا۔ کہ مجھے سلحہ جنگ اس کے حوالے کرنیکی جرأت نہ ہوئی۔ اور میں نے بمجبوری ٹال کے کہا اچھا اب اس وقت چلی چلو۔

نازیلن "عجز ممکن ہے"۔ اتنا کہہ کے وہ تیز سے کود پڑی۔ اور لپک کے میرا نیزہ پکڑ لیا۔ اور جب تک میں سنبھلوں سنبھلوں۔ نیزہ میرے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ میں حیرت زدہ تھا کہ وہ نیزہ لے کے پیچھے ہٹی اور کہا "سنبھل"۔

امیر المومنین اگر میں پھرتی سے تلوار نہ نکال لوں۔ تو اس نے مار ہی ڈالا تھا۔ پہلے میرا ارادہ تھا۔ کہ اُس پر حملہ نہ کروں۔ مگر جب میں نے دیکھا۔ کہ وہ مجھے قتل ہی کیا چاہتی ہے۔ اور اُس کا نیزہ مجھ پر کئی بار اثر بھی کر چکا تھا۔ تب کوشش سے اور ہوشیاری سے مقابلہ کرنے لگا۔ بہتیرا بچایا۔ مگر وہ میرے قابو میں نہ آئی۔ آخر ایک تلوار ایسی پڑی کہ زخمی ہو کے گر پڑی۔ اور دم بھر میں دم توڑ کے جان دیدی۔

امیر المومنین اس بہادر اور وفادار لڑکی کی صورت مجھے کبھی نہ بھولے گی۔ اس کا پیارا خون آلودہ چہرہ جب میں خاک پر بیکسی سے پڑا ہوا دیکھتا تھا۔ دل کلیجہ پھٹنے لگتا تھا۔ اور اپنے نزدیک تو میں نے اس دوشیزہ فخر عرب اور شجاع لڑکی سے زیادہ بہادر آج تک دنیا میں کسی کو نہیں پایا"۔

## اگلی فیاضیاں

عباسیہ اور بنو امیہ دونوں خاندانوں کی خلافت میں کئی فرمان روا ایسے گذرے ہیں جن کی فیاضیاں زمانے میں ہمیشہ مشہور رہیں گی۔ در حقیقت اُن لوگوں کی فیاضیاں سُن کے حیرت ہو جاتی ہے۔ اگر ایسے نمونے ڈھونڈیے کہ کوئی محتاج اور مفلس شخص ایک گھڑی بھر میں صرف کسی کی فیاضی سے اتنا بڑا دولت مند ہو گیا۔ کہ دیگر امرا کا محسود ہو سکتا ہو۔ تو صرف مسلمانوں ہی کی قدیم تاریخ میں ملیں گے۔ خلفا کے درباروں میں جو فیاضیاں [illegible] نے خلافت ایسے [illegible] ہوئے [illegible]

ہارون رشید کے عہد میں خاندان برامکہ کا اقتدار بڑھ گیا تھا۔ اور گو وہ قدیم حکومت کے سیاہ و سفید کے مالک تھے۔ مگر رشید نے بچے زمانے ہی میں ایک بیجا ظلم سے دنیا کو اس فیاضی اور بہادر خاندان سے خالی کر دیا۔ مگر برامکہ نے اپنے عروج کے محدود زمانے میں جیسی فیاضیاں دکھائیں [illegible]

خاندان میں ایسی سخاوت کے نمونے نہیں دکھا سکے۔ عرب کے قدیم کارناموں میں برامکہ کی داد و دہش کے ہزاروں واقعات نظر آتے ہیں۔ مگر ہماری نظر سے اس وقت ایک ایسا واقعہ گذرا ہے۔ کہ بے اختیار جی چاہتا ہے۔ اپنے شائق احباب کو بھی سناویں۔

ہارون رشید کا ایک خادم بیان کرتا ہے۔ کہ ایک روز ہارون خلاف عادت اپنے کمرے میں تنہا آیا۔ میں نے دیکھا۔ تو صورت سے برہمی کے آثار نمایاں تھے۔ میں دست بستہ کھڑا ہو گیا۔ مجھ سے کہنے لگے۔ علی بن محمد اور دینار خادم کو اپنے ساتھ لو۔ اور تم تینوں اُس مقام پر جاؤ۔ جہاں برامکہ کے کھنڈر پڑے ہوئے ہیں۔ میں نے سُنا ہے کوئی ضعیف العمر شخص رات کو وہاں آتا ہے۔ پہلے خاندان برامکہ کی تعریف میں کچھ اشعار پڑھتا ہے۔ اور پھر زار و قطار رویا کرتا ہے۔ اور اُن کی مدح سرائی کے ساتھ اُن کے قاتلوں کی مذمت کیا کرتا ہے۔ تم لوگ وہاں چپکے بیٹھے رہو۔ جب وہ اپنا پورا کام کر چکے۔ اور صبح ہونے کو ہو۔ اُس شخص کو فوراً گرفتار کر لو۔ اور میرے پاس لا کے حاضر کرو"۔ یہ سُن کے میں نے عرض کیا۔ "بسر و چشم"۔ اسی وقت ان دونوں لوگوں کو ہمراہ لے کے برامکہ کے کھنڈروں پر پہونچا۔ ہم تینوں ایک جگہ آڑ میں بیٹھ رہے۔

تھوڑی دیر میں وہ شخص آیا۔ ایک نہایت ہی باوقار اور صاحب جلال ضعیف العمر شخص تھا۔ پہلے دو غلام آ کے ایک کرسی بچھا گئے۔ پھر وہ اُس کرسی پر بیٹھ گیا۔ درد کے لہجے میں برامکہ کی تعریف میں دو شعر پڑھ کے رونے لگا۔

وَلَمَّا رَأَيْتُ السَّيْفَ جَنْدَلَ جَعْفَراً — وَنَادَى مُنَادٍ لِلْخَلِيفَةِ فِي يَحْيَى
بَكَيْتُ عَلَى الدُّنْيَا وَزَادَ تَأَسُّفِي — عَلَيْهِمْ وَقُلْتُ الْآنَ لَا تَنْفَعُ الدُّنْيَا

(یعنی جب تلوار نے جعفر کا سر جدا کیا۔ اور خلیفہ رشید کے منادی نے وہ حکم سنا دیا۔ جو یحییٰ کے بارے میں صادر ہوا تھا۔ اُس وقت دُنیا کے حال پر میں رو دیا۔ اور اُن لوگوں (برامکہ) کے حال پر مجھے اور بھی تاسف ہوا۔ اور میں نے کہا۔ اب دنیا کسی کام کی نہیں رہی۔)

رات بھر تو ہمیں ہر ایک پر حسرت و افسوس کرتا رہا۔ اور صبح ہوتے اُٹھنے کو تھا۔ کہ ہم لوگوں نے جا کے گرفتار کر لیا۔ اور کہا چلو تمہیں امیر المومنین بلاتے ہیں"۔

امیرالمومنین کا نام سنتے ہی وہ شخص کانپنے لگا۔ اور خوشامد کرنے لگا۔ کہ اُسے نجات دی جائے مگر ہم لوگوں نے نہ مانا۔ آخر بڈھے نے مایوس ہوکے کہا۔ مجھے اتنا موقع دو۔ کہ اپنے گھر ہوتا ہوا چلوں۔ کیونکہ اب مجھے زندگی کی تو کسی طرح اُمید نہیں۔ اپنے عزیزوں کو کچھ وصیّت کرلوں۔

الغرض اُس کے گھر ہوتے ہوئے ہم اُسے ماموں کے پاس لے گئے۔ ماموں نے پوچھا۔ تم برامکہ کے کھنڈروں پر روز رات کو جاکے کیوں رویا کرتے ہو۔ تم پر اُن لوگوں کا کیا حق ہے؟"

**ضعیف العمر:** "امیرالمومنین۔ خاندان برامکہ کے مجھ پر بڑے بڑے احسان ہیں اتنے احسان جن سے میں کبھی سبکدوش نہیں ہو سکتا۔ اگر اجازت ہو۔ تو عرض کروں۔ کہ انہوں نے میرے ساتھ کیسا سلوک کیا ہے

**ماموں:** "بیان کرو"۔

**ضعیف العمر۔** امیرالمومنین میرا نام ہے منذر بن مغیرہ۔ اور میں اُن لوگوں کی نسل سے ہوں۔ جن پر زمانے نے ظلم کرکے تباہ کردیا۔ خانگی مصارف کی وجہ سے مجھ پر قرض بڑھتا گیا۔ اور کوئی آمدنی نہ تھی۔ جس سے ادائی کی صورت ہوتی۔ آخر مجبور ہوکے میں نے اپنے اور اپنے اہل و عیال کے کپڑے تک بیچ ڈالے۔ اور انتہا درجہ کا مفلس ہوگیا۔ وہ گھر بھی بک گیا جس میں رہتا تھا۔ جب یہ سب چیزیں ندارد ہوگئیں۔ تو اب میں کیوں کر بسر کرتا۔ فاقہ کشی بھی نہیں کی جاتی۔ اور یہ بھی نہیں بنتا۔ کہ انسان ہاتھ پاؤں کاٹ کے بیٹھ رہے۔ اتفاقاً میری یہ حالت دیکھکے کسی نے بتایا۔ تم خاندان برامکہ میں سے کسی کے پاس جاؤ۔ وہ غالباً کچھ نہ کچھ ضرور تمہاری کفالت کرینگے۔ میں دمشق میں تھا۔ اور اہل و عیال کا شمار سب ملا کے تیس سے کچھ زیادہ تھا۔ امیرالمومنین بس اب سب کو لے کے میں دمشق سے نکلا۔ اور بغداد کی راہ لی۔ اس زمانے میں ہم سب میں سے کسی کے پاس نہ کوئی ایسی چیز تھی۔ جس کو ہم بیچ ڈالتے۔ اور سفر میں کچھ سہارا ہوتا۔ غرض جوں توں کرکے میں بغداد میں آیا۔ یہاں ایک مسجد میں ہم سب آکے ٹھہر گئے۔ کپڑوں کا جوڑا میں نے رکھ لیا تھا۔ کہ اس کو پہن کے کسی کے پاس جا سکوں۔ اب یہاں آکے میں نے وہ کپڑے پہنے۔ اور سب کو مسجد میں چھوڑ کے برامکہ کا پتا پوچھتا ہوا چلا۔

ادھر اُدھر دیر تک سڑکوں پر بھٹکتا پھرا۔ آخر ایک کم حیثیت مسجد پر گذر ہوا۔ اُس کے دروازے پر دو خادم تھے۔ اور ایک طرف ایک سن رسیدہ شخص کھڑا ہوا تھا۔ اس کا لباس نہایت عمدہ اور مکلف تھا۔ اور مسجد کے اندر دیکھا۔ تو بہت سے لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔ میرے دل میں آئی۔ کہ انہیں لوگوں میں جا کے میں بھی بیٹھ جاؤں۔ دیکھوں کون لوگ ہیں۔ اور کیوں بیٹھے ہیں۔ شاید کچھ کام نکل جائے۔ اس ارادے سے اندر گیا اور چونکہ لوگوں سے آگے بڑھ گیا تھا۔ اس وجہ سے مجھے بڑی غیرت معلوم ہوئی۔ اور میری پیشانی سے پسینہ جاری ہو گیا۔ بہر تقدیر جرأت کر کے میں اُن لوگوں کے درمیان میں بیٹھ گیا۔ اتنے میں ایک خادم آیا۔ اور کہنے لگا۔ آپ سب صاحب تشریف لے چلیں یہ سن کے سب لوگ اُٹھ کھڑے ہوئے۔ اور میں بھی اُن کے ساتھ ساتھ چلا۔ یہ سب لوگ یحیٰی بن خالد برمکی کے مکان میں داخل ہوئے۔ اور میں بھی بے تکلف چلا گیا۔ یحیٰی باغ میں بیٹھا ہوا تھا۔ ہم سبھوں نے جاتے ہی سلام کیا۔ وہ ہم سبھوں کو شمار کرتا جاتا تھا۔ کل ایک سو ایک آدمی نکلے۔ اور بارہ آدمی اُس کے اعزا و اقارب میں سے اُس کے پاس بیٹھے ہوئے تھے۔ ہم سب بیٹھ گئے۔ چاروں طرف عالیشان محل بنے ہوئے تھے۔ ناگہاں ایک محل سے ایک حسین خوش رو نوجوان برآمد ہوا۔ یہ نوجوان سبزہ آغاز تھا۔ آگے آگے غلام سونے کے ٹیکے باندھے اور ہاتھوں میں سونے کی انگیٹھیاں لئے چلے آتے تھے۔ ہر ٹیکہ کا وزن ہزار مثقال سے کم نہ تھا۔ اور ہر ایک انگیٹھی میں ایک ایک ٹکڑا عود کا پڑا ہوا سُلگ رہا تھا۔ یہ نوجوان یحیٰی کے پہلو میں آ کے بیٹھ گیا۔ اب یحیٰی ہم لوگوں میں سے ایک ذی وقار شخص کی طرف متوجہ ہوا جس کی نسبت اب مجھے معلوم ہوا کہ قاضی تھا۔ اور کہنے لگا۔ قاضی صاحب آپ میرے اس بھتیجے کے ساتھ میری بیٹی عائشہ کا عقد کر دیجئے۔ قاضی نے خطبہ نکاح پڑھا۔ اور نکاح ہو گیا کل حاضرین شاہد قرار پائے۔ اس کے بعد ہر طرف سے لوگ ہم پر مشک و عنبر کے غلے پھینکنے لگے۔ امیر المومنین خدا کی قسم صرف میں نے اسی قدر لوٹے تھے۔ کہ میری آستینوں میں گنجائش نہ رہی

* عرب اور نیز سرزمین شام میں آستینیں بڑی بڑی ہوتی تھیں۔ اور جیب کا کام دیتی تھیں جس کو جو کچھ رکھنا ہوتا تھا۔ اپنی آستینوں میں رکھ لیا کرتا تھا۔

اس وقت یحییٰ کے پاس ہم اور اُس کے اعزا و اقارب ملا کے ایک سو تیرہ شخص تھے۔ ناگہاں ایک سو تیرہ خادم آئے۔ ہر خادم کے ہاتھ میں ایک چاندی کی صینی تھی۔ اور ہر صینی میں ہزار دینار رکھے ہوئے تھے۔ خادموں نے سب صینیاں ہم سبھوں کے سامنے لا کے رکھ دیں۔ اب میں نے دیکھا کہ قاضی اور کل حاضرین نے دینار تو اپنی آستینوں میں بھر لئے۔ اور صینیاں بغل میں دبالیں۔ اور ایک ایک کر کے اُٹھنے لگے۔ یہاں تک کہ سب اُٹھ گئے اور صرف میں باقی رہ گیا۔ اور مجھے کسی طرح صینی اور دینار لینے کی جرأت نہ ہوئی تھی۔ مجھے صینی کو ہاتھ لگانے میں تامل ہوا۔ تو خادم نے اشارے سے کہا "لے لو۔ نہ لینا گستاخی ہے۔ یہ دیکھ کے میں نے ڈرتے ڈرتے دینار اپنی آستین میں بھر لئے صینی اٹھا کے بغل میں دبائی۔ اور اُٹھ کے چلا۔ مگر خوف کے مارے میں بار بار پلٹ کے دیکھ لیتا تھا کہ کوئی آ کے چھین نہ لے۔ اسی وضع سے جاتے جاتے میں باغ سے گذر کے محل کے صحن میں پہنچا۔ یحییٰ میرے اس اضطراب کو دیکھ رہا تھا۔ اور اُس کا تعجب اس قدر ترقی کر گیا کہ اُس نے خادم کو حکم دیا۔ اس شخص کو بلا لاؤ۔ خادم مجھے دوڑ کے لے گیا۔ اور اُس کے سامنے لے جا کے کھڑا کر دیا۔"

یحییٰ "! یہ کیا ہے۔ کہ تم گھڑی گھڑی اِدھر اُدھر دیکھ لیا کرتے ہو"

میں نے اپنی ساری داستان یحییٰ کو سُنادی یحییٰ نے میرا حال سُنکے اپنے بیٹے موسیٰ کو بلوایا۔ اور اُس سے کہا "تو انہیں لے جاؤ۔ اور اپنے ہمراہ رکھو۔ یہ نہایت ہی غریب شخص ہیں۔ اپنے ذاتی اخلاق اور اپنی دولت سے ان کی دلجوئی کرو" موسیٰ میرا ہاتھ پکڑ کے اپنے ساتھ لے گیا۔ ایک نفیس مکان میں لے جا کے مجھے رکھا۔ اور میری نہایت ہی تعظیم و تکریم کی ایک دن اور ایک رات موسیٰ کے ساتھ میں نے نہایت ہی عیش و راحت میں بسر کی صبح کو موسیٰ نے اپنے بھائی عباس کو بلایا۔ اور کہا تم جانتے ہو۔ مجھے آج دربار میں جانا ہے۔ آج تم انہیں اپنے پاس رکھو یحییٰ نے حکم دیا ہے۔ کہ ان کے ساتھ عمدہ برتاؤ کیا جائے۔ اس روز ایک دن اور ایک رات یہاں اُسی عیش و عشرت میں بسر ہوئی۔ دوسرے روز تیسرے بھائی احمد نے اپنے گھر میں رکھا۔ یونہیں دس روز تک برامکہ میں سے روز ایک نیا شخص میرا متکفل ہوا۔ اور میں نے نہایت ہی لطف و راحت سے زندگی بسر کی۔ میں ایسی عشرتوں میں پڑ گیا کہ مجھے اپنے اہل و عیال

کی بالکل فکر نہیں رہی۔

گیارھویں روز ایک خادم آیا۔ اُس کے ہمراہ اور بھی بہت سے خدام تھے۔ آتے ہی مجھ سے کہنے لگے۔ تشریف لے چلئے۔" اس وقت مجھے اپنے اہل وعیال یاد آئے۔ اور میں رونے لگا۔ کہ آہ ان دعوتوں اور عشرتوں میں مَیں نے وہ دینار اور صینی بھی کھو دی۔ اب کیا کروں۔ اور اہل وعیال سے جاکے کیا کہونگا۔ مگر مجبوراً اُٹھا۔ اور اُس کے ہمراہ روانہ ہوا۔ یہ خادم مجھے ایک عالیشان محل کے قریب لیگیا۔ دروازے پر پردہ پڑا تھا۔ خادم پردہ ہٹا کے اندر لے گیا۔ پھر دوسرا دروازہ ملا۔ اور اُس کے پردہ کو ہٹا کے بھی ہم آگے بڑھے تیسرا دروازہ بھی یونہی طے کیا۔ جب میں چوتھے دروازے پر پہنچا۔ خادم نے بڑھکے پردہ پکڑ لیا۔ اندر سے عود اور مشک کی خوشبو کی لپٹیں آرہی تھیں۔ اور میرا دماغ معطر ہوگیا تھا۔ یہاں مجھے خادم نے اندر جانے سے روک کے کہا "مجھے حکم ہوا ہے۔ کہ آپکی تمام ضرورتیں میں پوری کردوں۔ آپ اس وقت جو ارشاد فرماوینگے۔ فوراً تعمیل ہوگی۔ میری زبان سے کچھ نہ نکلا۔ خادم نے میری وہ صینی اور وہ دینار جو اُس میں تھے۔ اور مشک و عنبر کے غلہ جو میں نے لوٹ کے جمع کئے تھے۔ سب نکال کے میرے حوالے کردئے۔ اس کے علاوہ دس ہزار دینار ایک لاکھ درہم اور ایک فرمان جس کی رو سے بطور معافی کے دو گاؤں میرے قبضے میں دئے گئے تھے۔ یہ سب سامان لاکے میرے سامنے رکھدیا میں حیرت زدہ ہوکے خادم کی صورت دیکھنے لگا۔ اُس نے فوراً پردہ اُٹھادیا۔ دیکھتا ہوں کہ ایک عالیشان قصر ہے جسکی رفعت تک میرا حوصلہ بھی ہرگز نہ پہنچ سکتا۔ اور اُس قصر میں میرے تمام اہل وعیال اور بال بچے حریر و اطلس کی قبائیں پہنے ادھر اُدھر ٹہل رہے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی مجھے معلوم ہوا۔ کہ یہ مکان مجھے رہنے کو دیا گیا ہے۔ امیر المومنین آپ بھی تصور کرسکتے ہیں۔ کہ اس وقت جوشِ مسرت میں میری کیا حالت ہوگئی ہوگی۔

اس کے بعد میں تیرہ برس تک برامکہ کے ساتھ اس قدر و منزلت سے رہا۔ کہ کوئی یہ بھی نہ جانتا تھا۔ کہ میں برامکہ سے ہوں۔ یا کوئی غیر شخص ہوں۔ آخر الامر جب برامکہ پر مصیبت آئی۔ اور رشید کے ہاتھوں ان کی قسمت میں جو لکھا تھا۔ وہ ظاہر ہوا۔ عمر بن سعد نے مجھ پر سختی کی۔ اور اُن گاؤں پر محصول باندھ دیا۔ اور اتنا محصول باندھا کہ اُن گاؤں سے اُس قدر نکاسی ہرگز نہیں ہوسکتی ہے۔ زیادتی محصول نے مجھے بھی مبتلائے آفت کردیا۔

اب میرا کوئی مربی نہ تھا۔ اور اس مصیبت کے عالم میں مجھے برامکہ کی فیاضیاں یاد آ آکے بیتاب کردیا کرتی تھیں صرف دل کی بھڑاس نکال ڈالنے کیلئے میں نے یہ معمول کرلیا۔ کہ آخر شب برامکہ کے گرے پڑے اور منہدم کھنڈروں پر جا کے روز رو لیا کرتا ہوں۔ اور اُن کے احسانات کو یاد کرتا ہوں۔

یہ سُن کے مامون نے عمرو بن سعد کو بلوایا۔ اور پوچھا۔ تم اس شخص کو جانتے ہو؟ اُس نے کہا۔ امیرالمومنین یہ برامکہ کے آوردوں میں سے ہے۔ اور دو گاؤں اس کی زمینداری میں ہیں۔

**مامون**۔ اُن گاؤں پر تم نے کیا محصول باندھا ہے؟ سعد نے بتایا۔ کہ اس قدر محصول لیا جاتا ہے۔ مامون نے حکم دیا۔ کہ محصول کی بابت ان سے تم نے جسقدر رقم آجتک وصول کی ہے۔ سب واپس کرو۔ اور آئندہ سے اُن گاؤں کا محصول معاف کردو۔ یہ گاؤں ہمیشہ اس پر اور اس کی نسل پر وقف رہیں؟ یہ سُن کر وہ ضعیف العمر شخص زار زار رونے لگا۔

**مامون**۔ اب کیا ہے ہم نے یہ احسان کیا۔ اور تم روتے ہو۔

**ضعیف العمر**۔ امیرالمومنین یہ بھی ایک برامکہ ہی کی فیاضی ہے۔ نہ اُن کے کھنڈروں پر آکے میں روتا۔ نہ امیرالمومنین کے دربار تک رسائی ہوتی۔ اور نہ اس انعام واکرام اور اس رحم کا مستحق قرار پاتا۔

اتنا سننا تھا۔ کہ مامون کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو جاری ہوگئے۔ اور کہنے لگا بیشک میں قسم کھاکے کہتا ہوں۔ کہ یہ بھی برامکہ ہی کی فیاضی ہے۔ اچھا جاؤ۔ اُن پر روؤ۔ اُن کا شکریہ ادا کرو۔ اُن کے حق کو پورا کرو۔ اور اُن کے احسانوں کو یاد کرو۔

## ایک تاریخی واقعہ

انسان کو اپنے بچپن کی بھولے پن کی باتیں باوجودیکہ ہر بات میں اُن سے نادانی اور ناسمجھی ظاہر ہوتی ہے۔ بہت ہی بھلی اور خوش آئندہ معلوم ہوتی ہیں۔ یہی وجہ ہے۔ کہ اکثر لوگوں کو قدیم زمانہ بت پرستی کی دیومالا اور اس عہد کی بے سروپا باتوں میں بہت کچھ مزا آتا ہے۔ اس لئے کہ وہ لغو اور بے سروپا باتیں اُس زمانہ کی ہیں۔ جبکہ نوع انسانی

یں جمع تھا۔ ایک سادگی اور اینلے پن کی ادا موجود تھی۔ نہ انسان کی واقفیت اسقدر وسیع تھی نہ اسکے تحریر میں اتنی پختگی پیدا ہوئی تھی۔ اسی قسم کے قصے کم و بیش ہر قوم اور ہر ملک کے لوگوں میں مشہور ہیں۔ جو آج تہذیب و ترقی کے بعد خشک مزاج مورخوں کو بالکل بے اصل اور لغو نظر آتے ہیں۔ لیکن اُن قصوں کو سراسر لغو اور بے اصل کہہ دینا بڑی غلطی ہے۔ اگر حقیقت بینی کی نظر سے دیکھئے تو انہیں کہانیوں کے اندر سے اصلی واقعات کا پتہ لگ جاتا ہے۔ اور اس کے ساتھ یہ بھی معلوم ہو جاتا ہے۔ کہ اس عہد کی سادہ مزاجی نے کہاں کہاں پر کیا حاشیہ چڑھایا ہے۔ اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ کہ یہ اگلی کہانیاں تاریخی واقعات کے زنگ آلود آئینے ہیں۔ ایسے ہی منتشر اور دھندلے آئینوں میں دیکھ دیکھ کے ہندوؤں کی پوری تاریخ حاصل کی گئی ہے۔

اسی قسم کا ایک دلچسپ قصہ ہم تاریخ تحفۃ الکرام سے نقل کر کے بیان کرتے ہیں جس سے سرزمین سندھ کے ہندو و مسلمانوں کے باہمی تعلقات کا پتہ چلتا ہے۔ حقیقت میں یہ صرف قصہ نہیں بلکہ ایک واقعہ ہے۔ جو ایک تاریخ سے نقل کیا گیا ہے۔ اس کے آثار اور نشان خود تحفۃ الکرام کے مصنف کے عہد تک سندھ میں موجود تھے۔ اور لوگوں کو اس کی صحت کا پورا پورا یقین تھا۔

راجہ ڈلورائے کے زمانہ میں سندھ کے ایک قدیم شہر بنام برادہ میں نانیا نام ایک برہمن رہتا تھا۔ جو ایک متوسط درجہ کی عزت و حرمت سے اپنی بی بی سُندر کے ساتھ زندگی بسر کیا کرتا تھا۔ دونوں میاں بی بی کو مدتہائے دراز کی اُمیدوں کے بعد خدا نے ایک لڑکی دی جس کا حسن و جمال آفتاب پر چشمک زنی کرتا تھا۔ بدنصیبی سے نجومیوں نے زائچہ بنا کے پیشین گوئی کی۔ کہ یہ لڑکی کسی مسلمان سے بیاہی جائیگی۔ ماں باپ کو یہ سُنکے نہایت صدمہ ہوا۔ اور عزت و آبرو کے خطرے نے اس قدر خوف دلایا۔ کہ ماں باپ نے اپنے اُس جگر گوشہ کو ایک چھوٹے سے صندوق میں بند کر کے دریا میں بہا دیا۔ تقدیر نے اُس صندوق کی حفاظت کی۔ اور موجیں بہا کے شہر بھمبور میں لے گئیں۔ یہاں ایک دھوبی رہتا تھا جس کا نام نہیا تھا۔ مگر عام طور پر لالہ کے لفظ سے یاد کیا جاتا تھا۔ اس دھوبی کے پانچ سو شاگرد دریا کے کنارے کپڑے دھویا کرتے تھے۔ اگرچہ یہ سب بیٹوں کی طرح اُس کی خدمت کو موجود تھے۔ مگر خدا نے حقیقت میں اولاد سے محروم رکھا تھا جس کی اُسے بڑی تمنا تھی۔ وہ صندوق بہتے بہتے جب یہاں پہنچا۔ تو لالہ کے کسی شاگرد کے ہاتھ پڑا۔ اور وہ اس صندوق کو اسیطرح بند اپنے مالک کے

سامنے اُٹھا لایا۔ لانہ نے جو صندوق کو کھولا۔ تو ایک چاند کے ٹکڑے کو اُس میں دیکھ کے متحیر ہو گیا فوراً نکال کے اپنے کلیجہ سے لگایا۔ چونکہ اُس کا چہرہ چاند کی طرح دمکتا تھا۔ اسی رعایت سے سسّی نام رکھا۔ اور اپنی بیٹی بنا کے پرورش کرنے لگا۔

سسّی جب اس طرح پرورش پا کے بڑی ہوئی۔ تو اُس کا حسن و جمال زمانہ کے لئے ایک فتنہ ہو گیا۔ جس کی نظر پڑی۔ دل و جان سے فریفتہ ہو گیا۔ ہر صحبت میں اُس کا تذکرہ ہونے لگا۔ اور مسافر اس کی یاد کو دل میں لے کے دور دراز ممالک میں پہنچے۔ الغرض اسطرح اُس کے حسن عالم فریب کی شہرت ہر طرف پھیل گئی۔ اور جا بجا لوگ اُس کے نادیدہ عاشق ہو گئے۔ اسی زمانے میں چند قافلے سندھ سے مکران کو روانہ ہوئے۔ جن کے پہنچتے ہی بعض تاجروں کے ذریعہ سے سسّی کے حُسن کی تعریف شہر کیچ کے امیر کے بیٹے پنوں کے گوش گذار ہوئی۔ پنوں یہ تذکرہ سنتے ہی دل و جان سے عاشق ہو گیا۔ اور جب کامیابی کی کوئی تدبیر نظر آئی۔ تو سوداگروں کا بھیس کر کے بے کسی سے کہے سُنے سندھ کو روانہ ہوا۔ بھنبھور میں پہنچ کے جب سسّی کی صورت دیکھی۔ تو اُس کا عشق دوچند ہو گیا مجبوراً پنوں کو سسّی کے حسن سے فائدہ اُٹھانے کیلئے یہ تدبیر کرنا پڑی کہ دھوبیوں کی صورت بنا کے سسّی کے باپ کے شاگردوں میں داخل ہو گیا۔ اور دریا کنارے روز جا کے کپڑے دھونے لگا۔ اس طریقہ سے پنوں کو یہ موقع مل گیا کہ سسّی سے روز ملا کرتا تھا۔ آخر دونوں طرف سے محبت نے جوش کیا۔ اور دونوں کے دل میں عشق کے شعلے مشتعل ہو گئے

یہاں ایک ستارن تھی۔ جو ان دونوں کی پاک محبت کو نہ دیکھ سکی۔ اسے حسد معلوم ہوا اور آخر اُس نے ایسی فتنہ پردازیاں کیں کہ پنوں کے دل میں سسّی کی طرف سے کچھ بدگمانی پیدا ہوئی جس پر سسّی نے آگ میں کود کے اپنی پاک دامنی کا ثبوت دیا۔ اور خالص سونے کی طرح آگ سے پاک و صاف نکل آئی۔ تھوڑے دنوں کے بعد سسّی کی پنوں کے ساتھ شادی ہو گئی۔ اور دونوں اسی شہر میں کامیابی و مقصد وری سے زندگی بسر کرنے لگے۔

جب یہ حالات امیر کیچ کو معلوم ہوئے۔ تو اُسے بیٹے کی اُس فریفتگی اور خود رفتگی پر نہایت طیش آیا۔ اُس نے چند آدمی روانہ کئے۔ کہ جس طرح بنے۔ پنوں کو بہ رضا و رغبت یا بہ جبر و اکراہ کشاں کشاں واپس لے آئیں۔ یہ لوگ گئے۔ اور خود پنوں کے گھر میں آ ٹھیرے۔ اور اسی کے مہمان ہوئے۔ لیکن رات کو جب کہ پنوں اور سسّی دونوں محو خواب تھے ان لوگوں نے پنوں کو سوتے ہی میں اونٹ کی پیٹھ پر ڈال کے رسیوں سے باندھا۔ سسّی کو ویسے ہی سوتا پڑا رہنے دیا۔ اور مکران

کی راہ لی۔ صبح کو جب سستی خواب ناز سے بیدار ہوئی تو پنوں کو غائب دیکھ کے رونے پیٹنے لگی۔ تمام کپڑے پھاڑ ڈالے۔ زیور اتار کے پھینک دیا۔ اور تن تنہا شوہر کی جستجو میں نکل کھڑی ہوئی۔ محبت نے پاؤں میں اتنی طاقت دیدی۔ کہ گھر سے بہت دور تک اُسی گم گشتہ کی تلاش میں قدم اُٹھائے چلی گئی کوئی چالیس کوس گئی ہوگی۔ کہ پاؤں نے جواب دیدیا۔ اور تشنگی کی یہ شدت ہوئی۔ کہ لق ودق بیاباں اور برہنہ پہاڑیوں میں گر کے زمین پر ایڑیاں رگڑنے لگی۔ اور بالکل نزع کا سا عالم طاری ہوگیا۔ خدا کی قدرت سے وہاں ایک پانی کا چشمہ نمودار ہوا۔ جس سے پانی پی کے سستی خوب سیراب ہوئی۔ سیاحوں کا بیان ہے۔ کہ وہ چشمہ آجتک اُسی جگہ پر موجود ہے۔ اور صحرانوردوں کے کلیجے ٹھنڈے کیا کرتا ہے اور ہر موسم میں موجود رہتا ہے۔ نہ گرمیاں اُسے خشک کرتی ہیں اور نہ بالو اسکے پانی کو جذب کرتی ہے کہتے ہیں۔ کہ یہ واقعات مصیبت سستی نے اُسی شب کو خواب میں دیکھ لئے تھے۔ جس رات وہ دلہن بنائی گئی تھی۔ اور اُس کے ہاتھ حنا آلود کئے گئے تھے۔ وہاں رسم تھی۔ کہ شب زفاف کو دلہنیں ایک مہندی کی ٹہنی ہاتھ میں لے کے سویا کرتی تھیں۔ سستی جو ٹہنی ہاتھ میں لیکے سوئی تھی۔ اُسے اُس نے محبت کی نشانی سمجھ کے حفاظت سے رکھ چھوڑا تھا۔ اس سفر غربت میں بھی وہ اس ٹہنی کو اپنے ساتھ لیتی گئی تھی۔ اس پہاڑی اور صحرا میں جب خدا نے اُسے سیراب کیا۔ تو اُس نے وہ ٹہنی اس چشمہ کے کنارے گاڑ دی تھی۔ خدا کی قدرت ہے۔ وہ ٹہنی وہاں جم گئی۔ وہی مہندی کی جھاڑی اُس چشمہ کے کنارے آجتک سستی کے خونچکان دل کو یاد دلا رہی ہے۔

تھوڑی دیر سستا کے سستی پھر آگے بڑھی۔ چھ ہی سات کوس چلنے پائی تھی۔ کہ پھر پیاس کا غلبہ ہوا۔ چہرہ کمہلا گیا۔ اور تھک کے بیٹھ گئی۔ اتفاقاً یہاں ایک گڈریا اپنی بکریاں چرا رہا تھا اُس نے جو سستی کی صورت دیکھی۔ تو بے اختیار ہوگیا۔ دیر تک مبہوت کھڑا دیکھتا رہا۔ آخر اُس نے تجویز کی۔ کہ سستی کو پکڑ لیجائے۔ اور قریب آکے کہنے لگا "چلو تم میرے ساتھ چلو۔ اور میری معشوقہ بنو"۔ سستی نے آہ کھینچ کے کہا "تم یہ کتنا بڑا ظلم کر رہے ہو۔ میں اپنی جان سے مر رہی ہوں اور تم ایسی ناجائز خواہش ظاہر کر کے میرا دل دُکھا رہے ہو"۔ گڈریے نے زیادہ اصرار کیا۔ اور کہا "یہ ممکن نہیں۔ کہ تم میری خواہش پوری نہ کرو"۔ تب سستی نے عاجز ہو کے کہا۔ "اچھا۔ اگر تم مجھے مجبور ہی کرتے ہو۔ تو کوئی ایسی تدبیر کرو۔ کہ میری جان میں تو جان آئے۔ کوئی ایسی چیز لا دو کہ ذرا حلق تر کر لوں۔ پیاس کے مارے دم نکلا جاتا ہے"۔ اتنا سنتے ہی گڈریا خوش خوش اپنے گلہ کی طرف دوڑا۔ کہ تھوڑا سا دودھ دوہ لائے گڈریے کے جاتے ہی سستی نے درگاہ الٰہی میں التجا کی۔ اپنے

معشوق کے پانے سے مایوس ہو چکی تھی۔ ظالم گڈریے کے ہاتھ سے مخلصی کی کوئی صورت نظر نہ آئی تھی۔ تنگ آ کے دعا کی۔ کہ بار الہا مجھے اس صحرائی دیو کے پنجہ سے نجات دے۔ اتنا کہنا تھا۔ کہ وہ چٹان جس پر بیٹھی ہوئی تھی۔ بیچ سے شق ہو گئی۔ اور سسی کو اپنی گود میں لیکر پھر بند ہو گئی۔ سسی تو لعل بے بہا کی طرح پتھر کے کلیجے میں جا چھپی۔ اور اُس کی ساڑھی کا آنچل اسکی بیکسی یاد دلانے کیلئے باہر نکلا رہ گیا۔ گڈریے نے جب واپس آ کے یہ حال دیکھا۔ تو اُسے بڑی عبرت ہوئی۔ اپنی زیادتی پر بہت پچھتایا۔ خدا کی درگاہ میں توبہ کی۔ اور اپنی ندامت مٹانے کے لئے اسی جگہ جہاں سسی پیوند کوہ ہوئی تھی مقبرہ بنا دیا۔

اب پنوں کا حال سنیئے۔ وہ ستم رسیدہ جب زنجیروں میں جکڑا ہوا اپنے باپ کے سامنے پہنچا۔ تو اُس کی بیتابی وحسرت ناکی اس شدت پر نظر آئی۔ کہ باپ کو بیٹے کے مر جانے کا اندیشہ ہو گیا۔ اور مجبوراً اُس نے پنوں کے بھائیوں کو بلا کے کہا۔ تم پنوں کو ساتھ لے کے سندھ جاؤ۔ اور جہاں ملے۔ اور جسطرح ممکن ہو۔ اسکی معشوقہ کو ساتھ لے آؤ۔ ان لوگوں کا ایک قافلہ پنوں کو ساتھ لے کے سندھ کی طرف روانہ ہوا۔ جب لوگ اُس مقام پر پہنچے۔ جہاں سسی زندہ دفن ہو گئی تھی۔ تو پنوں اُترا۔ اور کسی انسان کے تازہ نشان کو غور سے دیکھنے لگا۔ دل کے تعلقات کچھ ایسے بڑھے۔ کہ وہیں بیٹھ کے سوچنے لگا۔ اور بے اختیار اُس کی زبان سے نکلا۔

ابھی اس راہ سے کوئی گیا ہے کہے دیتی ہے شوخی نقش پا کی

ناگہاں وہی گڈریا نمودار ہوا۔ اور پنوں کے پاس آ کے جب دیکھا۔ کہ وہ ان آثار کا متجسس ہے۔ تو سسی کی ساری داستان کہہ سنائی۔ پنوں فوراً سمجھ گیا۔ کہ یقیناً یہ میری ہی معشوقہ کا تذکرہ ہے۔ اپنے ساتھیوں سے کہا۔ میں ذرا اس قبر کی زیارت کر آؤں۔ اس شہید عشق کی تربت پر مجھے فاتحہ ضرور پڑھنا چاہیئے۔ اتنا کہہ کے مقبرہ کے اندر گیا۔ اور قبر سے لپٹ کے دعا مانگنے لگا۔ کہ یا اللہ مجھے میری معشوقہ سے ملا دے۔ فوراً وہ چٹان پھر شق ہوئی۔ اور پنوں بھی اُس میں سما گیا۔

سرزمین سندھ میں اس حسن وعشق کے قصہ کی بے انتہا شہرت ہے۔ ان حسرت نصیب عشاق کا مقبرہ آج تک زیارتگاہ خاص وعام ہے۔ اگرچہ وہ ایک ایسے موقع پر ہے۔ جہاں اب اونٹ کا گذرنا نہایت دشوار ہے۔ اور منزلوں تک کہیں آبادی نہیں۔ لیکن لوگوں کو یقین ہے

کہ وہ دونوں محبت کے پتلے آج تک وہاں زندہ موجود ہیں۔ اور وصل کے مزے اڑا رہے ہیں۔ گو اس طرف سے کوئی راستہ نہیں گیا تاہم اگر کوئی بھولا بھٹکا آوارہ گرد آنکلتا ہے تو یہ پہاڑ کے سینہ میں سونے والے عشاق اُس کی خبر گیری کرتے ہیں۔ اور کسی از غیبی طریقہ سے کھانا پانی مل جاتا ہے۔

چنانچہ مشہور ہے۔ کہ اسماعیل نام کسی درویش متوطن ملتان نے ان عشاق کی قبروں کی زیارت کے شوق میں وہاں سے سفر کیا۔ اور ان کے مقبرے کے قریب پہنچ کے اونٹ کو دور ہی پر چھوڑ دیا۔ اور خود پہاڑ پر جا کر بیٹھ گیا۔ اور اس امید میں کہ ان عاشقوں کی صورت دیکھنا نصیب ہو تین دن تک فاقہ سے پڑا رہا۔ برابر روزے پر روزہ رکھا۔ اور ایک دانہ بھی مُنہ میں نہ جانے دیا۔ تیسرے دن ایک بڑھیا تھوڑی سی روٹی اور تھوڑا سا پانی لئے ہوئے آئی۔ اور کہنے لگی "بسم اللہ کھائیے۔" درویش نے کہا یہ نہیں ہوسکتا۔ میں جب تک سسی اور پنوں کی صورت نہ دیکھ لونگا۔ کھانا ہرگز نہ کھاؤں گا۔ اس پر وہ بڑھیا بولی "لو دیکھ لو میں ہی سسی ہوں۔ مگر خدا کے لئے پنوں کو دیکھنے کی خواہش نہ کرو۔ اس لئے کہ میں دنیا سے دغا اٹھا چکی ہوں۔ اب مجھے کسی کا اعتبار نہیں۔ یہ میرے عزیزوں اور دوستوں ہی کی مہربانی ہے۔ جو مجھے کوہسار اور ریگستان میں لائی۔" درویش نے جواب دیا "مجھے کیونکر یقین آئے۔ کہ تم ہی سسی ہو۔ وہ تو جوان خوبصورت دلربا اور دلفریب تھی۔ اور تم ایک بدصورت اور بدقطع بڑھیا ہو اُس کی صورت دیکھنے سے آنکھوں میں نور آتا ہوگا۔ اور تمہارا چہرہ دل میں نفرت پیدا کرتا ہے۔ اور جی چاہتا ہے۔ کہ آنکھیں بند کر لوں۔" اتنا کہہ کے جو درویش نے سر اٹھا کے دیکھا۔ تو وہ عورت جوان اور خوبصورت اور ویسی ہی حسین و نازنین تھی۔ جیسی کہ سنی گئی تھی۔ اپنی اصلی صورت دکھا کے سسی نے پھر درویش سے کہا "لو کھاؤ مجھے دیکھ لیا۔ اب کیا چاہتے ہو؟" درویش نے کہا۔ مجھے بھوکھوں مرجانا گوارہ ہے۔ اور یہ نہیں گوارہ کہ بے تم دونوں کو دیکھے کچھ کھاؤں۔ اس کو کیا کروں۔ کہ میں اس امر کا عہد کر چکا ہوں۔ اور قسم کھا کے آیا ہوں۔" یہ سُن کے پہلے تو سسی اصرار کرتی رہی۔ کہ اس خیال سے باز آؤ۔ مگر جب درویش نے کسی طرح نہ مانا۔ تو وہ قبر میں اتری اور اس کے اترتے ہی پنوں نے سر اٹھا کے اپنی صورت دکھائی۔ لیکن قبر میں ہی کھڑا رہا۔ صرف سر سے

کمر تک اُس کا جسم نظر آیا۔ اور وہ بھی اس طرح کہ سسّی اپنے دونوں ہاتھوں سے اُس کی کمر کو
مضبوط پکڑے ہوئی تھی۔ اس ڈر سے کہ کوئی پھر نہ چھین لے جائے۔

اُس قریب میں مشہور ہے۔ کہ اکثر آنے جانیوالوں نے دونوں عاشقوں کی صورت
دیکھی ہے۔ پنّوں اور سسّی کا عشق اہل سندھ میں اس قدر مقبول ہوا۔ کہ اُن کی قبر مدتوں
تک زیارت گاہ خاص و عام رہی۔ اور اکثر شعرا نے اُن کے جذبات عشق پر طبع آزمائی
کی۔ ان کے عشق کا حسرت خیز گیت سندھ کی صحبتوں میں غالباً آج بھی کہیں نہ کہیں
گایا جاتا ہوگا۔ میر معصوم بھکری نے اس قصہ کو اپنی مثنوی "حسن و ناز" میں موزوں کیا ہے
اس کے بعد پھر محمد شاہ بادشاہ دہلی کے عہد میں قاضی مرتضٰی سورتی متوطن قصبۂ کٹیانہ
نے دوبارہ موزوں کیا۔ یہ دونوں مثنویاں نہایت مقبول ہوئیں۔ اور سندھیوں
کے نوجوانوں کو مدتوں تک ان نظموں کی پُرغم بحر ہی رولاتی
رہی ہے۔

لفٹننٹ برٹن اور مسز پوسٹن نے اس قصہ کو انگریزی میں بھی بیان کیا ہے
انگریزی مصنفین اس قصہ کی اصلیت کے نہیں قائل ہیں۔ لیکن انصاف یہ ہے۔ کہ خلاف
قیاس حاشیے نکال کے اگر غور کیجئے۔ تو اصل قصہ کے صحیح ہونے میں شک نہیں
باقی رہتا۔

## وفائے عہد

بے وفائی اور وعدہ کر کے بھول جانا چاہے شعرا کے مذہب میں کسی دلربا نازنین
کے لیے جائز ہو۔ مگر حقیقت میں وفاداری ایک جوہر ہے۔ اور اخلاق انسانی کی سب سے
بڑھی چڑھی صفت جس کے پاس یہ جوہر نہیں۔ وہ انسانیت میں بہت ناقص ہے
اور اس قابل نہیں۔ کہ اخلاق و شائستگی کے دربار میں اُسے باریابی کی عزت دی جائے
اس وصف کو اگرچہ ہر قوم والے مانتے اور اس کی ضرورت و خوبی کو تسلیم کرتے ہیں۔
مگر بعض قوموں کے خصائص میں یہ صفت اس قدر عام ہے۔ اور ایسی اہمیت کے ساتھ
پائی جاتی ہے۔ کہ فلسفۂ اخلاق پر بحث کرنے والے یہ رائے قائم کرتے جاتے ہیں۔ کہ
ایک خاص وضع اور خاص بناوٹ کے دماغ میں یہ چیز ہوتی ہے۔ اور جن کے —

اس بناوٹ کے نہیں ہیں۔ اُن میں نہیں ہوتی عربوں کی تاریخ اور نیز اُن کی موجودہ حالت کا اگر لحاظ کیا جائے۔ تو پتہ چلتا ہے۔ کہ یہ صفت اُن میں کثرت سے اور اس قدر عام ہے۔ کہ اور قوموں میں نہیں۔ اس قسم کے واقعات کثرت سے مل سکتے ہیں۔ جیسا کہ یوم ذی وقار میں ظاہر ہوا۔ کہ نعمان بن منذر نے اپنے بال بچوں کو بنی شیبان کی حمایت میں چھوڑ کے جان دے دی۔ اس کے بعد دائے عجم خسرو پرویز نے عربوں کو ڈرایا دھمکایا۔ فوج کشی کی۔ لڑائیاں لڑا۔ دنیا تہ وبالا کر دی۔ کوئی دقیقہ نہیں اُٹھا رکھا۔ اور عربوں کے ہزاروں آدمی کٹ گئے۔ مگر یہ نہ ہو سکا کہ پرویز کا ہاتھ نعمان کے خاندان اور اُس کی اولاد تک پہونچا ہو۔

مگر اس سے زیادہ دلچسپ وُہ واقعات ہیں۔ جن میں انھوں نے باوجود اس کے کہ بے وفائی کر کے جان بچانا یا نفع اُٹھانا بخوبی ممکن تھا۔ لیکن انھوں نے بدعہدی کو ہرگز جائز نہ رکھا۔ اس کے متعلق ہم ایک اور قوم کا ایک واقعہ نقل کرتے ہیں۔ اور اُس کے بعد عربوں کا ایک واقعہ دکھائیں گے۔

گودا پر مدت سے پرتگیزوں کی حکومت ہے۔ وہاں ایک مرتبہ اُن کے بہادر اور فتحمند سردار ژیان دکاسترو کو رعایا سے دس ہزار روپیہ قرض لینے کی ضرورت ہوئی۔ عام قاعدہ ہے۔ کہ رعایا کو فوجی افسروں کا بہت کم اعتبار ہوا کرتا ہے۔ اور ژیان دکاسترو کے پاس کوئی ایسی چیز موجود نہ تھی۔ جسے ضمانت وکفالت کی حیثیت سے پیش کرتا۔ آخر اُس نے اپنی مونچھوں کا ایک بال توڑ کے رعایا کے سامنے پیش کیا۔ رعایا نے ایک بہادر آدمی کی طرف سے اس ضمانت کو فوراً قبول کر لیا۔ اور پوری رقم جمع کر کے اُس کے حوالے کر دی۔ ژیان دکاسترو نے بھی اپنی اس ضمانت کا پورا خیال رکھا۔ اور تھوڑے ہی زمانے کے بعد وہ رقم ادا کر کے اپنی مونچھ چھڑا لی۔

مگر ممکن ہے کہ اس موقع پر حکومت کے دباؤ نے بھی کچھ اثر دکھایا ہو۔ اس لئے کہ ژیان دکاسترو گودا والوں کا حاکم اور اُن کی قسمت کا مالک تھا۔ عربوں سے وفائے عہد کے جو حیرت انگیز واقعات ظاہر ہوئے ہیں۔ اور جس قسم کی چیزیں انھوں نے رہن میں دی ہیں۔ اور جیسے لوگوں کے سامنے پیش کی ہیں۔ وہ زیادہ قابل قدر ہیں اہل عرب ہی نہیں۔ ایرانیوں میں بھی "حاجب کی کمان" مشہور تھی۔ اور مدت ہائے دراز تک ایک دولت گراں بہا اور قدامت کا تبرک خیال کی گئی اس کا واقعہ یہ ہے

کہ ایک مرتبہ حضرت سرورِ کائنات صلعم کی بددعا سے ارض عرب میں قحط پڑ گیا تھا۔ اُس وقت حاجب بن زرارہ جو قبیلہ بنی تمیم کا ایک بزرگ شخص تھا۔ اپنے قبیلہ والوں کے ساتھ وطن چھوڑ کے قلمرو ایران میں چلا گیا۔ اور کسرائے عجم سے درخواست کی۔ کہ ہم لوگوں کو اپنے شہر کے ایک کونے میں پڑے رہنے کی اجازت دیجئے۔ کسرےٰ نے اُسے معہ اُس کے ہمراہیوں کے سامنے بلوا کے کہا۔ "تم لوگ ہمیشہ کے لوٹتے مارتے والے اور متمرد و سرکش ہو۔ تمہارا کیا اعتبار کیا جا سکتا ہے؟ اگر تمہیں اجازت دے دی جائے۔ تو ہر طرف فساد اور ہنگامے مچادوگے۔ اور ہماری رعایا کو ستاؤگے۔"

یہ سنتے ہی حاجب اپنی قوم میں سے آگے بڑھا۔ اور عرض کیا۔ "حضور میں ضمانت کرتا ہوں کہ ان لوگوں سے ایسی گستاخی نہ ہوگی۔" کسرےٰ نے کہا۔ "مانا کہ تم ان کی ضمانت کرتے ہو۔ مگر خود تمہارا ضامن کون ہے؟ تم لڑ بھڑ کے اور لوٹ مار کے بھاگ گئے۔ تو میں کیا کروں گا؟" اس کے جواب میں حاجب نے نہایت ہی جوش و متانت سے آگے جا کے اپنی کمان بادشاہ کے سامنے رکھ دی۔ اور بولا "میری ضامن یہ ہے۔"

یہ دیکھتے ہی تمام اہلِ دربار نے قہقہہ لگایا۔ اور دل میں یہ کہنے لگے۔ "کہ اس وحشی اور بادیہ نشین عرب کو یہ بھی نہیں معلوم کہ اس کی ذلیل کمان کی قیمت کیا ہے۔ اور وہ بھی بادشاہ کی نظر میں۔" مگر راستبازی کی یہ سادی اور پُرجوش حرکت تاجدار ایران کے دل پر اثر کر گئی۔ اس نے قہقہہ لگانے والوں کو جھڑک کے خاموش کیا۔ اور کہا۔ اس کا لحاظ نہ کرو کہ اس کمان کی قدر و قیمت تمہارے نزدیک کیا ہے۔ بلکہ یہ دیکھو۔ کہ خود اس کے دل میں اس کی کتنی قدر ہے۔ خدا کی قسم اگر دل میں دغا یا ابھی کھوٹ ہوتی۔ تو یہ اس کمان کو نہ پیش کرتا۔" پھر حاجب سے کہا۔ میں تمہاری اس ضمانت کو قبول کرتا ہوں۔ اور اسے اور اُس کی قوم کو شہر میں رہنے کی اجازت دیدی۔

اس کے بعد جب عرب میں ہر طرف دینِ اسلام پھیل گیا۔ کل قبائلِ عرب نے علمِ اسلام کے آگے سر جھکا دیا۔ اور حاجب بن زرارہ دنیا سے رخصت ہوگیا تھا۔ تو اُس کا بیٹا عطارد بن حاجب دربارِ کسرےٰ میں گیا۔ اور کہا۔ "اب ہم سب لوگ پھر اپنے وہاں واپس جانا چاہتے ہیں۔ لہذا میرے والد کی کمان مجھے عطا ہو جائے۔" کسرےٰ نے فوراً وہ منگوا کے اُس کے حوالے کی۔ اور اسے ایک نہایت ہی بھاری

اور قیمتی خلعت سے سرفراز کیا۔ اس طرح بنی تمیم درائے عجم سے معاملت ختم کر کے عرب میں آئے۔ اور بارگاہ نبوت میں حاضر ہوئے۔ اور عطارد حضرت سرور کائنات صلعم کے ہاتھ پر بیعت کر کے ایمان لایا۔ اور اُس کسرے کے عطا کئے ہوئے خلعت کو نذرانہ کے طریق سے آپ کے سامنے پیش کیا۔ مگر آپ نے اُس کے لینے سے انکار کیا۔ تب اُس نے اُسے چار ہزار دینار پر ایک یہودی کے ہاتھ بیچ ڈالا لیکن اُس کمان کو اپنی خاندانی فضیلت کی یادگار خیال کر کے نہایت ہی عزت اور قدر و منزلت کے ساتھ رکھا۔ جو مدت ہائے دراز تک اُس کے خاندان میں باقی تھی اور اس کے تقریباً تین سو برس بعد علامہ ابن قتیبہ لکھتے ہیں۔ کہ جعفر بن عمیر بن عطارد بن حاجب کی اولاد کے پاس موجود تھی

## وفائے عہد

ہم گذشتہ دلگداز میں وفائے عہد کے دو دلچسپ واقعات نقل کر چکے ہیں۔ اُس مضمون کے لکھنے کے بعد ہم کتاب "اعلام الناس" کی سیر کر رہے تھے۔ کہ اُن واقعات سے بھی زیادہ دلچسپ اور موثر ایک واقعہ ہماری نظر سے گذرا۔ جسے ہم اپنے سراپا شوق ناظرین کے سامنے بھی پیش کئے دیتے ہیں۔

ایک دن حضرت عمر فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کا سادہ دربار خلافت گرم تھا۔ اکابر صحابہ موجود تھے۔ اور مختلف معاملات پیش ہو ہو کے طے ہو رہے تھے کہ ناگہاں ایک خوش رو نوجوان کو دو اور خوبصورت نوجوان پکڑے ہوئے لائے۔ اور فریاد کی کہ "یا امیر المومنین۔ اس ظالم سے ہمارا حق دلوائیے۔ اس لئے کہ اس نے ہمارے بوڑھے باپ کو مار ڈالا۔ حضرت فاروق نے اس نوجوان کی طرف دیکھ کے فرمایا: "ان دونوں کا دعوے تو تو سُن چکا۔ اب بتا تیرا کیا جواب ہے؟" اُس نے نہایت ہی فصاحت و بلاغت سے پورا واقعہ بیان کیا۔ جس کا خلاصہ یہ تھا کہ ہاں مجھ سے یہ جرم ہوا ہے۔ اور میں نے ایک پتھر کھینچ کے مارا جسکی ضرب سے وہ مرگیا ہے۔ حضرت فاروق نے فرمایا۔ "تو تجھے اعتراف ہے۔ لہذا اب قصاص کا عمل لازمی ہوگیا۔ اور اس کے عوض تجھے اپنی جان دینی ہوگی"۔ نوجوان نے سر جھکا کے عرض

کیا۔ مجھے امام کے حکم اور شریعت اسلام کے فتوے کے ماننے میں کوئی عذر نہیں لیکن ایک بات کی درخواست ہے۔" ارشاد ہوا! "وہ کیا؟" عرض کیا "میرا ایک چھوٹا نابالغ بھائی ہے۔ جس کے لئے والد مرحوم نے کچھ سونا چھوڑا تھا۔ اور میرے سپرد کیا تھا۔ کہ بالغ ہو۔ تو اُس کے حوالے کر دوں۔ میں نے اُس سونے کو ایک جگہ زمین میں دفن کر دیا۔ اور اُس کا حال سوا میرے کسی کو نہیں معلوم ہے۔ اگر وہ سونا اُس کو نہ پہنچا۔ تو قیامت کے دن میں ذمہ دار ہونگا۔ اس لئے اتنا چاہتا ہوں کہ تین دن کے لئے ضمانت پر چھوڑ دیا جاؤں" جناب فاروق نے اس بارے میں سر جھکا کے ذرا غور فرمایا۔ اور پھر سر اُٹھا کے ارشاد فرمایا "اچھا کون ضمانت کرتا ہے۔ کہ تو تین دن کے بعد تکمیل قصاص کے لئے چلا آئیگا" فاروق اعظم کے اس ارشاد فیض بنیاد پر اُس نوجوان نے چاروں طرف دیکھا۔ حاضرین مجلس کے چہروں پر ایک سرسری نظر ڈالی۔ اور پھر ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ کی طرف اشارہ کر کے عرض کیا۔ "وہ میری ضمانت کرینگے"۔ حضرت فاروق نے پوچھا "ابوذر تم ضمانت کرتے ہو؟" انھوں نے فرمایا "بے شک میں ضمانت کرتا ہوں۔ کہ یہ نوجوان تین دن میں آکے حاضر ہو جائیگا"۔ یہ ایسے جلیل القدر صحابی کی ضمانت تھی۔ کہ حضرت فاروق بھی راضی ہو گئے۔ اُن دونوں مدعی نوجوانوں نے بھی اپنی رضامندی ظاہر کی اور وہ شخص چھوڑ دیا گیا۔

اب تیسرا دن تھا۔ حضرت فاروق کا دربار بدستور قائم ہوا۔ تمام جلیل القدر صحابہ جمع ہوئے۔ وہ دونوں نوعمر مدعی بھی آئے۔ حضرت ابوذر بھی تشریف لائے۔ اور مجرم کا انتظار کیا جانے لگا۔ اب وقت گذرتا جاتا ہے۔ اور اُس کا پتہ نہیں۔ صحابہ میں ابوذر کی نسبت تشویش پیدا ہو چلی ہے دونوں مدعیوں نے بڑھ کے کہا "اے ابوذر ہمارا مجرم کہاں ہے؟" انھوں نے کمال استقلال و ثابت قدمی سے جواب دیا "اگر تینوں دن گذر گئے۔ اور وہ نہ آیا۔ تو خدا کی قسم میں اپنی ضمانت پوری کروں گا"۔ عدالت فاروقی بھی جوش میں آئی حضرت فاروق سنبھل بیٹھے اور فرمایا "اگر وہ نہ آیا۔ تو ابوذر کی نسبت وہی کاروائی کی جائیگی جس کی شریعت اسلامیہ متقاضی ہوگی"۔ یہ سنتے ہی صحابہ میں کھلبل پڑ گئی۔ بعضے آبدیدہ ہو گئے۔ اور بعض کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ مجبور ہو کے لوگوں نے دونوں مدعیوں سے کہنا شروع کیا۔ کہ "تم خون بہا قبول کر لو"۔ انھوں نے

قطعی انکار کیا کہ ہم تو خون کے بدلے خون ہی چاہتے ہیں۔ غرض لوگ اسی پریشانی میں تھے کہ ناگہاں وہ مجرم نوجوان نمودار ہوا۔ مگر اس حالت سے کہ پسینے میں ڈوبا تھا۔ اور سانس پھولی ہوئی تھی۔ وہ آتے ہی حضرت فاروق کے سامنے آیا۔ خندہ جبینی سے سلام کیا۔ اور عرض کیا۔ میں نے اُس بچے کو اُس کے ماموں کے سپرد کر دیا۔ اور اُس کی جائداد انہیں بتادی۔ اب آپ جو خدا و رسول کا حکم ہو بجا لائیں" اب حضرت ابوذر نے فرمایا "امیر المومنین خدا کی قسم میں جانتا بھی نہ تھا کہ یہ کون ہے۔ اور کہاں کے رہنے والا ہے۔ اور نہ آج سے پہلے کبھی اس کی صورت دیکھی تھی۔ مگر اور سب کو چھوڑ کے اُس نے مجھے اپنا ضامن بنایا۔ تو مجھے انکار کرنا مروت کے خلاف معلوم ہوا۔ اور اس کے بشرے نے یقین دلایا۔ کہ یہ شخص اپنے عہد میں سچا ہوگا۔ اس لئے ضمانت کرلی۔ اُس کے آپہونچنے سے حاضرین میں ایسا غیر معمولی جوش پیدا ہو گیا تھا۔ کہ دونوں مدعی نوجوانوں نے خوشی میں آکے عرض کیا۔ "امیر المومنین ہم نے اپنے باپ کا خون معاف کیا" سب طرف سے ایک نعرۂ مسرت بلند ہوا۔ اور حضرت فاروق کا چہرہ مارے خوشی کے چمکنے لگا۔ اور فرمایا "مدعی نوجوانو۔ تمہارے باپ کی خون بہا میں بیت المال سے ادا کر دوں گا۔ اور تم اپنی نیک نفسی کے ساتھ فائدہ بھی اُٹھاؤ گے" انھوں نے عرض کیا۔ امیر المومنین ہم اس حق کو خالص خدا کی خوشنودی کے لئے معاف کر چکے۔ لہذا اب ہمیں کچھ لینے کا حق نہیں ہے۔ اور نہ لیں گے۔ غرض اس عجیب و غریب وفائے عہد کا واقعہ اس خوشی و مسرت پر ختم ہوا۔

## عدو شود سبب خیر گر خدا خواہد

کہتے ہیں۔ کہ سلیمان بن عبدالملک جب خلیفہ ہوا۔ تو محمد بن یزید نام ایک شخص کو والی عراق بنا کے بھیجا۔ اور حکم دیا۔ کہ وہاں جاتے ہی جتنے قیدی ہوں۔ سب کو چھوڑ دینا۔ اس لئے کہ حجاج بن یوسف کی سخت گیریوں نے صدہا لوگوں کو اسیر بلا کر رکھا تھا۔ محمد بن یزید نے آتے ہی احکام خلافت کی تعمیل کی۔ اور پہلے والی یزید بن ابی مسلم پر بہت جور و تشدد کیا۔ چند روز بعد جب خلیفہ سلیمان کی موت نے سریر خلافت کو خالی کیا۔ اور یزید بن عبدالملک اریکہ آرائے سلطنت ہوا۔ تو اُس نے یزید بن

ابی مسلم کو افریقہ کا گورنر مقرر کیا۔ جہاں کی گورنری کی باگ اس سے پیشتر محمد بن یزید کے ہاتھ میں تھی۔ محمد مذکور نے جب یزید بن ابی مسلم کے آنے کی خبر سُنی۔ تو مارے خوف کے اُس کے پہونچنے سے پہلے ہی بھاگ کے روپوش ہوگیا۔ اور یزید نے پہونچتے ہی اُس کی تلاش شروع کی۔ آخر وہ گرفتار ہو کے لایا گیا۔ اور جسوقت یزید بن مسلم کے سامنے پیش کیا گیا ہے۔ رمضان کا مہینہ تھا۔ افطار کا وقت قریب تھا۔ اور یزید کے ہاتھ میں انگور کا گچھا تھا۔ کہ اذان ہوتے ہی اُسے کھائے۔ محمد بن یزید کی صورت دیکھتے ہی بولا "محمد تم پر قابو پانے کی دعا مجھے مدت دراز تک مانگنی پڑی" محمد نے کہا "اور میں بھی مدت سے دعا مانگ رہا ہوں۔ کہ خدا مجھے آپ کے ہاتھ سے امان دلوائے" سُنتے ہی یزید نے کہا "امان! خدا کی قسم ندونگا۔ اور اگر ملک الموت نے بھی ارادہ کیا۔ کہ میرا وار پڑنے سے پہلے تمہاری جان نکال لے تو میں یہ انگور کھانا چھوڑ دوں گا۔ اور کوشش کروں گا۔ کہ عزرائیل کا ہاتھ پڑنے سے پہلے ہی تمہارا کام تمام کردوں" اسکے بعد یزید کے حکم سے اُس کی مشکیں بندھ گیئں۔ قتل گاہ میں لاکے بٹھا دیا گیا۔ اور جلاد سر کاٹنے کے لئے تلوار لے کے کھڑا ہو گیا۔ اتنے میں مؤذن نے اذان دی۔ اور یزید ابن ابی مسلم وہ انگور کا خوشہ رکابی میں رکھ کے نماز پڑھنے کو گیا۔ اتفاقاً اہل افریقہ اُس کے دشمن ہو رہے تھے۔ نماز میں سجدے سے سر اُٹھایا تھا۔ کہ کسی بیباک دشمن نے ایک ایسا گرز مارا۔ کہ ایک ہی بار میں اُس کا کام تمام کردیا۔ فوراً شور و غل ہوا۔ لوگوں کو معلوم ہوا۔ کہ والی افریقہ مار ڈالا گیا۔ اور جلاد نے جو کھڑا تلوار تول رہا تھا۔ محمد بن یزید کی مشکیں کھولدیں اور کہا۔ اب آپ آزاد ہیں۔ جہاں چاہیے۔ جائیے۔ وہ انگور کا خوشہ رکھا رہ گیا۔ اور فرشتۂ موت نے ایک آن کے آن میں اس بات کا ثبوت دیدیا۔ کہ وہ سبقت کر سکتا ہے۔ یا وہ جو گھڑی بھر کے لئے خداوند جل وعلیٰ کو بھول گیا تھا۔ یہیں سے نظر آتا ہے۔ کہ خدا کی قوت سب پر غالب ہے۔ اور اُس کی مرضی کے خلاف ایک ذرہ حرکت نہیں کر سکتا۔

اس سے بھی زیادہ حیرت انگیز نمونہ مشیت ایزدی کے غالب آنے

کا یہ ہے۔ کہ سلاطین آل حمدان میں سے ملک الناصر روح فرسا مرض قولنج میں مبتلا ہوا۔ تمام اطبا نے دولت حاضر ہوئے۔ اور اپنی تدبیروں میں کوئی بات اُٹھا نہ رکھی۔ مگر بادشاہ کو نفع نہ ہونا تھا نہ ہوا۔ آخر اطبا عاجز آ کے ڈرے کہ ایسا نہ ہو۔ بادشاہ ہماری یہ کمزوری دیکھ کے اور ہم سے بدعقیدہ ہو کے ہمارے آزار کے درپے ہو جائے۔ چنانچہ سب نے اپنی جان بچانے کے لئے یہ تدبیر سوچی۔ کہ بادشاہ کا کام ہی تمام کر دیں۔ اس کام کے لئے اُنھوں نے ایک شخص کو مقرر کیا۔ جو خنجر کپڑوں میں چھپائے ہوئے محل میں چھپ رہا۔ ملک الناصر ایوان شاہی کے ایک حصّہ سے دوسرے میں جا رہا تھا۔ اور ایک دہلیز پر قدم رکھا تھا۔ کہ اُس شخص نے نکل کے حملہ کیا۔ اور ناف کے نیچے خنجر بھونک دیا۔ خنجر سے معاء قولون چاک ہو گئی جس میں سدّوں کے رُک جانے سے مرض پیدا ہوا تھا۔ فوراً تمام مادۂ فاسد اور سدّے نکل گئے۔ اور قولنج کی جان گزا تکلیف سے ملک الناصر کو نجات مل گئی۔ باقی رہا زخم وہ چند ہی روز میں جراحوں کی ہنرمندی سے اچھا ہو گیا۔

سچ کہتے ہیں ؎ عدو شود سبب خیر گر خدا خواہد۔ وہی دشمنی جو زندگی کا چراغ گُل کرنے کے لئے کی گئی تھی۔ زندگی بخش ثابت ہوئی۔ اور جو حربہ جان لینے کے لئے کیا گیا تھا۔ اُسی نے جان بچا دی۔

## خاتونانِ عرب کی عفت

یہ بات خاص عربوں میں ہے۔ کہ لڑکیاں اگرچہ بظاہر بیباک نظر آتی ہیں۔ اور بے تکلفی میں اس قسم کی باتیں کہہ جاتی ہیں۔ جو ہندوستان میں انتہا درجہ کی بے شرمی اور بے حرمتی کا نمونہ خیال کی جائیں لیکن اس کے ساتھ ہی عفیفہ اور پاک دامن ہوتی ہیں۔ شعرائے عرب شریف زادیوں پر اظہار عشق کرتے تھے۔ اپنی نظموں میں معشوقہ کا نام لے کے بیان کرتے تھے۔ کہ فلاں تاریخ شب کو میں اُس کی خوابگاہ میں گیا۔ اُس سے یہ باتیں ہوئیں۔ اور وہ مجھ سے

آغوشِ شوق کھول کے یوں ملی لیکن اس پر بھی اُن کے چالِ چلن پر حرف نہیں آتا تھا۔ دو ایک شاعروں کو ایسی جرأت بھی ہو گئی کہ چور کی طرح معشوق سے ملے۔ خلوت میں اُس کے ساتھ بیٹھے۔ اظہارِ شوق کیا۔ کھل مل کے باتیں کیں۔ اور بغیر اس کے کہ بدکاری کا خیال بھی دل میں گذرے واپس چلے آئے۔

اس قسم کے صدہا واقعات ہیں۔ جو دیگر اقوام و ممالک میں حیرت و تعجب سے دیکھے جائینگے۔ لیکن اہلِ عرب میں وُہ معمولی باتیں تھیں۔ اور ایسی نہیں۔ کہ اُن پر بدگمانی کی جائے۔ منجملہ اُن کے بنی قضاعہ کا ایک یہ واقعہ ہے۔ جس کا بیان کرنا ہمارے ناظرین کے لئے لطف سے خالی نہ ہوگا۔

بنی قضاعہ میں ایک شریف و صاحب اثر شخص تھا۔ خدا نے اُسے سات بیٹے دئے تھے۔ جن میں سے ایک نہایت ہی حقیر و کمرو اور شکل و شمائل میں نہایت ذلیل تھا۔ خاندان کی یہ خدمت اُسکے سپرد تھی۔ کہ اونٹ چرایا کرتا۔ اور ایسا معلوم ہوتا۔ کہ گویا گھر کا غلام ہے۔ اتفاقاً ایک اونٹ بھاگ گیا۔ بھائیوں نے کہا جاؤ اُسے ڈھونڈ لاؤ۔ اُس نے کہا "اکیلا میں ہی ہوں۔ تم نہ جاؤ؟" باپ نے یہ جواب سُن کے کہا "ابے جاتا ہے کہ نہیں! ذرا بھی دم مارا تو اسی وقت مار کے ڈال دونگا۔" مار کا ڈر بُرا ہوتا ہے۔ آپ مجبوراً اونٹ کو تلاش کرتے ہوئے گھر سے نکلے۔ سردی کا موسم تھا۔ بھوکے پیاسے اور جاڑے کی شدت سے کانپتے ہوئے صحرا نوردی کر رہے تھے۔ کہ شام کو بدویوں کے ایک خیمہ کے پاس پہنچے۔ جس میں ایک نیک بڑھیا اپنی حسین و پری جمال بیٹی کے پاس بیٹھی ہوئی تھی۔ بڑھیا نے ترس کھا کے کھلایا پلایا اور ٹھہرالیا۔ جب بڑھیا کام کاج کے لئے وہاں سے ہٹی۔ تو لڑکی نے آپ کی عجیب صورت دیکھ کے بنانا اور مسخرہ پن کرنا شروع کیا کہنے لگی "میں نے تم سے اچھا خوبصورت اور بانکا جوان آج تک نہیں دیکھا تھا۔ ایک کام کرو۔ جب رات کو سب سوجائیں۔ تو تم چپکے سے اُٹھ کے میری خوابگاہ میں چلے آنا۔ اُس وقت ہم تم اطمینان سے باتیں کریں گے" آپ سمجھ گئے۔ کہ بنائی ہے۔ بولے "مجھے معاف کیجئے۔ بنائیے نہیں"۔ اتنے میں لڑکی کا باپ اور اُس کے سات جوانمرد و تہمتن بیٹے آگئے۔ سب نے کھایا پیا۔ اور خیمہ کے سامنے زیر سما سو گئے۔ جب سب سو گ

غافل ہو گئے۔ تو شیطان نے آپ کو انگلی دکھائی۔ اگرچہ جانتے تھے۔ کہ لڑکی نے صرف بنایا تھا۔ مگر دل نے نہ مانا چپکے سے آ اٹھے۔ دبے پاؤں خیمے کے اندر گئے۔ اور لڑکی کو تنہا اور غافل پاکے آہستہ سے جگایا۔ اُس نے آنکھ کھولتے ہی پوچھا "کون؟" بولے میں ہی ہوں تمہارا غریب الوطن مہمان"۔ چین بہ جبیں ہوکے اُس نے کہا "کیوں شامت آئی ہے؟ نکل یہاں سے اور دُور ہو۔ گھبرا کے پلٹے۔ ڈرے اور سہمے ہوئے چپکے چلے آتے تھے۔ کہ کتا جو خیمہ کے پاس رہتا تھا۔ بھونکتا ہوا جھپٹا۔ آپ نے اپنی لکڑی سے ہزار ہٹایا۔ مگر وہ بھلا کب مانتا تھا۔ لپک کے آپ کا دامن پکڑ ہی لیا۔ اب اُسے آپ اپنی طرف کھینچ رہے تھے۔ اور وہ اپنی طرف کھینچ رہا تھا اس کشمکش میں آپ نے ایک دفعہ زور کر کے پیچھے کھینچا تو اڑ اڑا دھڑ ام کر کے ایک اندھے کنوئیں میں جا رہے۔ جو پیچھے تھا۔ اور ساتھ ہی وہ کتا بھی دامن کے ساتھ کھینچ کے کوئیں میں آ رہا۔

دھماکے کی آواز اُس حسین و پری جمال دوشیزہ کے کان میں گئی۔ تو خدا ترسی سے اُٹھی۔ اور کنوئیں کی جگت پر آکے کہا "خدا کی قسم جی تو یہ چاہتا ہے۔ کہ اِسی کنوئیں کو تیری قبر بنا دوں۔ لیکن خدا سے ڈر کے تیری جان بچاتی ہوں" یہ کہہ کے اُس نے رسّی ڈالی۔ اور کہا اسے پکڑ لے۔ اوپر تک کھینچ کے لائی تھی۔ کہ طاقت نے جواب دیدیا اور ایسے قدم اُکھڑ ائے۔ کہ خود بھی کنوئیں میں جا رہی۔

اب صبح ہوئی۔ اور لوگوں نے حیرت سے دیکھا۔ کہ لڑکی خیمہ سے غائب ہے ادھر اُدھر ڈھونڈنا شروع کیا۔ یہاں تک کہ معلوم ہوا۔ لڑکی وہ نوعمر مہمان اور کتا تینوں کنوئیں میں ہیں۔ غیرت و حمیت جوش میں آئی۔ اور باپ بھائی سب کے سب ننگی تلواریں اور پتھروں کے بڑے بڑے چھار لیکے جھپٹے۔ کہ دونوں کا کام تمام کر دیں۔ مگر خدا نے باپ کے دل میں رحم ڈال دیا۔ کہ اُس نے سب کو روکا۔ اور کہا "مجھے اپنی بیٹی پر بدگمانی نہیں۔ اس کی پاکدامنی ایسی نہیں۔ کہ بُرا گمان کیا جا سکے" پھر رسیاں ڈال کے سب کو کنوئیں سے نکالا اور نکالتے ہی بدصورت اور بد تمیز مہمان سے کہا "خدا کی قسم میں جانتا ہوں کہ میری لڑکی پارسا اور بیگناہ ہے۔ لیکن یہ واقعہ ایسا پیش آگیا۔ کہ سارے عرب

میں رسوائی ہوگی۔ اور کوئی اُسے اپنے عقد میں نہ لے گا۔ تم جو تمہارے پاس اتنا سرمایہ ہے۔ کہ بی بی کی خبرگیری کر سکو۔ اگر اس کی اُمید دلاؤ۔ تو اس لڑکی کے ساتھ تمہارا نکاح پڑھا دوں۔ یوں میں بدنامی سے بچونگا۔ اور تمہاری آرزو پوری ہو جائیگی۔ ان بیچارے کو جان کے لالے پڑے ہوئے تھے۔ منتظر تھے کہ کب سر اڑایا جائیگا۔ یکایک یہ خلاف توقع سوال سُنا تو بے تحاشا کہہ اُٹھے کہ مجھ میں سوا بھلائی کے کوئی خرابی نہیں۔ اور مجھ سے زیادہ نیک شوہر چراغ لے کے ڈھونڈیئے گا۔ تو بھی نہ ملیگا۔ یہ سُن کے وہ خوش ہوا۔ اور پچاس اونٹ۔ ایک لونڈی اور ایک غلام کے مہر پر اپنی لڑکی اُن کے عقد میں دیدی۔

اب آپ کے جوش مسرت کی کوئی انتہا نہ تھی۔ وہ بھاگا ہوا اونٹ تو خدا جانے کہاں گیا۔ آپ خوش خوش اپنے گھر گئے۔ اور باپ سے ساری سرگذشت بیان کی جس خاندان میں شادی ہوئی تھی۔ چونکہ وہ معزز و محترم اور شریف تھا۔ باپ نے بھی خوشی کے ساتھ قبول کیا۔ مہر کی چیزیں دے کے گئے۔ اور بہو کو رخصت کرا لایا۔

اس کے بعد مدت تک آپ صحرائے عرب میں زندہ رہے۔ مسافر اور سیاح آپ کے یہاں آکے مہمان ٹھہرتے۔ آپ کی بدصورتی اور آپ کی بی بی کی زیبائی اور رعنائی کو دیکھ کے حیران ہوتے۔ اور آپ اپنی یہ آپ بیتی انہیں سُنا سُنا کے اُنھیں خوش اور مطمئن کر دیا کرتے تھے۔

## ایک چھوٹے ذرّے کی سرگذشت

میں اپنے تنگ و تاریک کلبۂ احزان میں بیٹھا ہوا تھا۔ دماغ شکستہ جسم کے ٹوٹے پٹارے میں بند تھا۔ اور خیال فضائے عالم کے ناپیدا کنار میدان میں اُڑتا پھرتا تھا۔ خیال کے راہوار پر سوار ہو کے میں نے گشت شروع کی تو کرات فلکی کے پاس جا پہنچا۔ اور دیکھنے لگا۔ کہ کتنے بڑے بڑے اور کیسے کیسے عظیم الشان کرے کس سرعت اور سبک روی کے ساتھ چکر لگاتے پھرتے ہیں۔ اور کس طرح اپنی دھن میں لگے ہوئے ہیں۔ کہ ایک پل کے لئے بھی قرار نہیں لیتے۔ پھر ان کرات کی کثرت اور اُن کے ہجوم و ازدحام پر نظر پڑی

اور دل حیرت زدہ گھبرا کے بول اُٹھا۔ کہ "میدان تخلیق ایسے ہی لاکھوں کروڑوں کروڑوں سے بھرا ہوا ہے۔ جن میں سے ہر ایک بجائے خود ایک عالم ہے۔ اور ہم ان سب کی کُنہ حقیقت ان کے حالات و اطوار اور ان کے اغراض تخلیق سے کس قدر ناواقف ہیں"!

اپنا عجز اور اپنی بے حقیقتی یاد آ نا تھی۔ کہ خیال سب طرف سے پھر پھرا کے اور کروروں پدموں میل کی مسافت طے کر کے پھر اپنے اُسی کلبۂ احزان میں واپس آیا اور اپنی حقیقت دریافت کرنے میں مشغول ہوا۔ مگر طلسم قدرت کے محافظ فرشتوں نے روکا اور ڈانٹ کے کہا "بس آگے قدم نہ بڑھانا۔ سب سے بڑا طلسم خود تیرا نفس ہے جسے تو ہرگز نہیں سمجھ سکتا"! سیاح خیال اس قدرتی ڈانٹ پر سہما۔ اور ٹھٹھک کے کھڑا ہو گیا۔ گھبرا کے بھاگنا چاہتا تھا۔ کہ چھت میں ایک ننھا سا سوراخ نظر پڑا جس میں سے شعاع آفتاب نے اندر آ کے زمین پر دھوپ کی ایک نورانی چتی بنا دی تھی۔ اُس چتّی سے چھت کے سوراخ تک نور کی ایک روشن سلاخ دکھائی دی جس میں لاکھوں ننھے ننھے ذرّے اُسی طرح اُڑتے اور ایک دوسرے سے ٹکراتے پھرتے تھے۔ جس طرح فضائے عالم کے زبردست اور عظیم الشان کرے اُڑ رہے ہیں۔ اور سب سے زیادہ لطف کی بات یہ تھی۔ کہ جب ہم بھی دھوپ میں آ گئے۔ تو یہ ذرّات نظر سے غائب ہو گئے۔ جیسے کہ دن کے اجرام فلکی ہمارے سامنے سے غائب ہو جاتے ہیں۔ اور جب ہم اُس کلبۂ احزان کی تیرگی میں جا بیٹھے۔ تو وہ پھر چمک اُٹھے۔ جیسے کہ رات کو تارے جگمگا اُٹھتے ہیں۔

ذرّات کی اس نیرنگی اور اُن کی چمک دمک نے دیر تک محو حیرت رکھا۔ پھر دل نے کہا "کیا عجب کہ ذرّات ارضی کے اس عالم اصغر سے کُرات سماوی کے عالم اکبر کا کچھ انکشاف ہو سکے"! اور فلسفیانہ غور و غوض کے لئے سر جھکانے کو تھا۔ کہ ناگہاں انہیں ناچتے اور چمکتے ہوئے ذرّوں میں سے ایک نے آواز دی "تو اور ہماری حقیقت پا سکے! انسان کی عقل ناقص اور یہ دعوے! یہ بے دست و پائی اور اُس کے ساتھ یہ مجنونانہ حوصلہ! جا اپنا کام کر۔ اور قدرت نے جس کام میں لگا دیا ہے اُسی میں لگا رہ!۔ تو اس لئے نہیں پیدا ہوا ہے۔ کہ ہمارے حرکات و سکنات کا تماشا دیکھے

یا ہماری حقیقت معلوم کرے۔ اس بازی گاہِ قدرت کا تماشہ دیکھنے والا کوئی اور ہی ہے۔ ہم اور تو سب ایک ایکٹر ہیں۔ اور اپنا اپنا پارٹ ادا کر رہے ہیں۔" میں نے اُسے گویا پا کے التجا کی کہ "اپنا کچھ حال تو بیان کر۔" برافروختہ ہو کے بولا۔ "اپنا فرضِ منصبی ادا کرنے والوں کو داستان گوئی کی فرصت نہیں یہ بے فکری و غفلت انسان ہی کو مبارک رہے۔ عالمِ تخلیق کے ہر ہر ذرّے سے سبق لے۔ کہ منشاء قدرت اور اغراضِ تخلیق پورے کرنے میں کس خموشی کے ساتھ مصروف ہے۔ جسے دیکھیگا اس حالت میں پائے گا۔ کہ خاموش ہے اور اپنا کام کر رہا ہے۔ مگر سب کے خلاف ایک تو ہے کہ اپنے کام سے غافل ہے۔ اور فضول بک بک کر رہا ہے۔" میں نے پوچھا اچھا یہی بتا۔ کہ تو کہاں جا رہا ہے؟ اور کیوں جاتا ہے۔

اس کا اُس نے لاپروائی سے یہ جواب دیا۔ کہ "یہاں کام کی دھن میں کبھی ادھر توجہ ہی نہیں کی۔ کہ ہمیں کیا کرنا ہے۔ اور کیا کر رہے ہیں! کدھر جانا ہے اور کہاں جا کے دم لینگے۔ جس کام میں اُس خلاقِ مطلق نے لگا دیا ہے لگے ہوئے ہیں۔ جہاں لے جائیگا جائینگے۔ اور جہاں پہونچائے گا پہونچ جائینگے۔ ہم تو اپنے مالک کے بے عذر و بے زبان خدمتگار ہیں۔ تیری طرح ہمیں چنان چنیں اور کیوں اور کس واسطے نہیں آتی۔"

تب میں نے لاجواب ہو کے عاجزی سے کہا: "اچھا اپنی آئندہ حالت اور اپنے اغراض اور ارادے نہیں بتاتا۔ تو خدا کے لئے کچھ گذشتہ سرگذشت ہی بتا۔"

تنک مزاجی سے بولا۔ "یہ کبھی کسے یاد ہے! کبھی فرصت سے بیٹھنے کا موقع ہی نہیں ملا۔ کہ اپنی زندگی کے اگلے کارناموں پر غور کرتا۔ نہ یہاں کوئی دفتر ہے۔ نہ کوئی تاریخ لیکن خیر تو خدا کا واسطہ دلاتا ہے۔ تو جو کچھ یاد آتا ہے بتائے دیتا ہوں۔" یہ کہہ کے اُس نے اپنی سرگذشت سُنانا شروع کی۔ اور بولا:-

"سُن۔ جب صفحۂ دُنیا حیوانی زندگی سے خالی تھا۔ اور صرف عالمِ عناصر کے باہمی تصرفات نظر آتے تھے۔ اُن دنوں آج ہی کل کی طرح میں ایک ذرّہ خاک کی وضع سے ہوا میں اُڑتا۔ اور عرصۂ ہستی کی سیر کرتا پھرتا تھا۔ قدرت نے آخر ایک پہاڑ پر

پہنچایا۔ جہاں میں چند روز میں ایک بڑی بھاری چٹان کے جسم حجری میں شامل ہوگیا۔ اس پر کارگاہ قدرت نے ایک درخت اُگایا جس کی قوت نامیہ نے مجھے اپنی طرف کھینچا۔ اور اب میں جسم نباتی کا جز تھا۔ لیکن تغیرات نے کسی ایک حالت پر ٹھہرنے نہ دیا۔ کبھی جنگل میں آگ لگتی۔ اور میں زبانۂ آتش بن کے چمکتا۔ کبھی سیلاب آتا۔ اور میں پانی کی موجوں کے ساتھ بہتا۔ کبھی بادِ سموم چلتی اور میں ریگ رواں کے ساتھ دوڑتا پھرتا۔

اب حیوانی زندگی کی تخلیق ہوئی۔ میں نے نئی مہیب صورتیں دیکھیں۔ اور پھڑک پھڑک کے ہوا میں اُڑا۔ مگر صناعِ قدرت نے پکڑ کے خلقت کے اس نئے کارخانے میں مجھے بھی لگا دیا۔ چنانچہ میرا گذر حیوانی اجسام میں ہوا۔ اب میں وحوش کی وحشت ناک صورتوں میں نمایاں ہو کے لڑتا تھا۔ کبھی مارتا تھا۔ اور کبھی مارا جاتا تھا۔ کبھی شیر ببر بن کے مویشیوں پر جھپٹتا تھا۔ اور کبھی مویشی بن کے اپنے زبردست حریف سے بھاگتا تھا کبھی اژدہا بن کے زمین پر رینگتا تھا۔ اور کبھی طائر بن کے ہوا میں اُڑتا تھا۔ بازی گاہ قدرت کا یہ دوسرا کھیل ختم نہیں ہوا تھا۔ کہ خدا نے انسان کی بنیاد ڈالی۔ اس دلچسپ قصہ میں سے صرف اس قدر مجھے یاد ہے کہ پہلے پہل جب فرشتے عزرائیل کو لے کے آسمان کی طرف اُڑے ہیں۔ تو ان کے اُڑنے کی ہوا سے ایک درخت کی ٹہنیاں ہل گئی تھیں۔ اور انہیں ٹہنیوں کی ایک پھننگی میں ان دنوں میں تھا۔ پھر اس کے بعد جب حضرت آدم جنت سے پھینکے گئے۔ اور زمین پر آکے گرے ہیں۔ تو ان کے گرنے سے جو خاک اُڑی تھی تو اس کے ذرات میں یہ خاکسار بھی موجود تھا۔ کئی بار میں اس آگ میں چنگاری بن کے چمکا جس پر جناب حوا نے روٹیاں پکائی تھیں۔ اور کئی مرتبہ ان گیہوں میں شریک تھا جن کے آٹے سے روٹیاں پکتیں۔

یوں مختلف دفعتوں میں رہنے کے بعد میں اس خون میں شریک تھا۔ جو قابیل کی گنہگاری کے وقت ہابیل کے جسم سے بہ کے زمین پر گرا۔ کیا کہوں کہ میں نے کیا کیا رنگ دیکھے ہیں۔ جب آدمی گھونسوں اور تھپیڑوں سے لڑتے تھے۔ تو میں اکثر ان کی مٹھیوں میں ہوتا۔ جب وہ ایک دوسرے کی طرف ڈھیلوں اور پتھروں کو پھینک پھینک کے لڑتے۔ تو میں بھی ان کے پھینکے ہوئے ڈھیلوں میں ہوتا۔ جب وہ

ڈنڈوں اور موگریوں سے مجادلہ کرتے۔ تو میں کئی بدن کی موگریوں میں شامل تھا۔ اور بعدازاں جب انھوں نے لوہے کے آلات واسلحہ سے کام لینا شروع کیا۔ تو میں کبھی کسان کے ہل میں تھا۔ اور کبھی سپاہی کے تبر میں۔ کبھی کسی نیزے کا پھل تھا۔ اور کبھی کسی تیر کا پیکاں۔

حضرت ادریسؑ نے جس سوئی سے پہلے پہل سیا اُس کی نوک میں ہی تھا۔ حضرت نوحؑ نے جس لکڑی سے کشتی بنائی۔ اُس کا ایک جزو میں بھی تھا۔ اب باد تند کا ایک جھونکا مجھے اڑا کے سرزمین فارس میں لے آیا۔ جہاں میں جام جمشید کی مٹی میں گوندھا گیا۔ اور وہ جام بنا جس سے جمشید کا نام روشن ہے۔ فریدوں کا زمانہ آیا۔ تو میں اُس کے علم اقبال کا ایک پھریرا بنا۔ اور چند روز بعد خاک میں مل گیا۔ کیکاؤس کے اُس کھٹولے میں تھا جس پہ بیٹھ کے قوی بال عقابوں کی مدد سے وہ آسمان کی طرف اڑا تھا۔

اب پھر ہوا اور پانی کی مدد سے میں نے اقصائے عالم کی سیر کی۔ بابل میں پہونچ کے بعل کی مورت میں شامل ہوا۔ اور اُس قدر گلخن نار کی کیفیت دیکھا کرتا تھا جس میں کبھی ہزارہا اسیران ستم پابزنجیر چڑھائے اور جلا کے خاک کئے جاتے تھے۔ اور کبھی کوئی پری رخسار دوشیزہ دیوتا کے نذرانہ کے لئے لا کے جلائی اور اُس کی پیاری صورت خاک میں ملائی جاتی تھی۔

اب باد تکوین مجھے یہاں سے بھی اُڑا لے گئی۔ اور فینیقیوں کے ایک تاجرانہ قافلہ کا گرد کارواں بن کے میں مصر پہونچا۔ یہاں کبھی فرعنہ کے زنانِ حرم کا زیور تھا۔ اور کبھی امرائے مصر کی محفلوں میں شراب ارغوانی۔ کبھی فرعون کے سر کا تاج تھا۔ اور کبھی اُس کی ڈاڑھی میں گندھا ہوا موتی۔ کبھی وہ مقدس بچھڑا تھا۔ جو دیوتاؤں کے ساتھ بلی اور مگرمچھ کی پرستش کرایا کرتے تھے۔ اور کبھی وہ مقدس و محترم بلی تھا۔ جس کی وہاں کے سب سے بڑے بتخانے میں پرستش ہوتی تھی۔ اور آخر میں اُس چھوٹی کشتی کا جزو تھا جس میں بٹھا کے حضرت موسیٰؑ بہائے گئے تھے۔

”چند روز بعد بنی اسرائیل کے قافلہ کے ساتھ میں ارض کنعان میں ہونچا۔ تابوت سکینہ میں شامل رہ کے خداپرستی کی شان دیکھی۔ اور حضرت سلیمان کے مقدس

ہاتھوں سے بیت المقدس کی برگزیدہ عمارت میں لگادیا گیا۔ یہاں چندروز قرار و سکون اختیار کرکے آرام سے بیٹھا۔ اور بنی اسرائیل کے تغیرات کا تماشا دیکھنے میں مصروف ہوگیا اُن کا عروج دیکھا اُن کی ترقیاں دیکھیں۔ اُن کی خوبیاں دیکھیں۔ اور اُن کی ضلالتیں دیکھیں۔ وہ نازک گھڑیاں دیکھیں۔ جب بابل اور اسیریا والوں کے ٹڈی دل اس ارض مقدس کے پامال کرنے کو آتے تھے۔ اور واپس جاتے تھے۔ اور آخر وہ قیامت کی گھڑی بھی دیکھی۔ جب بخت نصر کے ہاتھوں سے بیت المقدس پامال کیا گیا بنی اسرائیل اسیر ہوکے بابل کی طرف چلے۔ اور میں نے بھی گرد کاروان میں شامل ہوکے اُن کے ساتھ ساتھ مشرق کی راہ لی۔

یہاں سے کچھ دنوں کے لئے اُڑتا ہوا ایران میں چلا گیا۔ جہاں زرتشت کے آئین و قوانین دیکھے۔ لکڑی بن کے آتش کدوں میں گیا اور اجسام انسانی میں نشو و نما پاکے دخموں کی سیر کی۔ پھر خاص سائرس کے اسلحہ کا ایک جُز بن کے بابل میں واپس آیا۔ اور بعل کے مندر کے ساتھ سارے شہر اور مذہب صابئی کو پامال کر ڈالا۔ میں یہیں تھا کہ بنی اسرائیل آزاد کئے گئے۔ اور انھیں واپسی وطن کی اجازت ملی۔ ایک اسرائیلی کے جسم میں قیام کرکے میں نے بھی مغرب کی راہ لی۔ اور چندروز کی صحرانوردی کے بعد بیت المقدس کے منہدم کھنڈروں پر کھڑا ہوکے رو دیا۔ اور اُس کے از سرِ نو تعمیر کرنے میں مشغول ہوا۔

یروشلیم کے ہیکل ربانی کا گُل شدہ چراغ پھر روشن کرکے میں خاک میں مل گیا اور عربی تاجروں کے ایک قافلہ کے ساتھ یونان پہنچا۔ وہاں یونانیوں کے اجسام میں رہ رہ کے اُن کی بہادریاں دیکھیں۔ اور اُن لوگوں کی عقل آرائیاں دیکھیں۔ کبھی وینس (زہرہ) کی دلربا مورت بنکے بُت پرستی کی شان دیکھی۔ کبھی کسی دوشیزہ کے جسم میں نفوذ کرکے پیش گوئیاں کیں۔ اور یونانیوں کے بڑے بڑے عقدے حل کئے۔ کبھی فلسفی بن کے رموز حکمت بتائے۔ کبھی طبیب بن کے مسیحائی کا جلوہ دکھایا کبھی سپاہی بن کے داد شجاعت دی۔ اور کبھی کسی مظلوم کی صورت میں عیاں ہوکے ایمفی تھیٹر میں داخل ہوا۔ اور درندوں کے دانتوں اور پنجوں سے نوچا پھاڑا گیا۔

ہوتے ہوتے سکندر اعظم کا ایک سپاہی تھا۔ اور اُس کے جھنڈے کے نیچے لڑتا ہوا ایران کی طرف چلا۔ مگر راستہ ہی میں نذر اجل ہو کے خاک میں مل گیا۔ تقدیر نے یوں یاری نہ کی۔ تو اُس کے لشکر کی گرد بنا ہوا ایران پہونچا۔ یہاں کے عظیم الشان انقلابات دیکھے۔ بہادروں کے پاؤں اور گھوڑوں کی ٹاپوں سے جو گرد اُڑ کے آسمان کی طرف جاتی اُس میں مَیں بھی ہوتا۔ مگر اقبال سکندری کا تماشا دیکھنے کے شوق میں رات کو پھر اُس کے پاس آجاتا تا۔ آخر دارا کے زخمی جسم پر جو خاک پڑی ہے۔ اُس کے ذرات میں مَیں بھی تھا۔ اور اُس کے بعد نوشابہ کے جبین ناز پر جو افشاں چُنی گئی ہے۔ اُس میں بھی میں موجود تھا۔ جب دارالسلطنت عجم میں سکندر کے حکم سے آگ لگائی گئی ہے۔ اُسوقت کی عام مصیبتوں اور تباہیوں کو میں شعلوں اور دھوئیں کے ساتھ اُڑ اُڑ کے دیکھتا تھا۔ اور افسوس کرتا تھا۔ پھر سکندر کے ساتھ میں نے ہندوستان کی راہ لی۔ افغانیوں کی مزاحمتیں دیکھیں۔ راجہ پورس کی لڑائی اور پھر اُسکی اطاعت دیکھی۔ اُن یونانی عمارتوں کو دیکھا جو یہاں اُس نے تعمیر کیں۔ اور پانی کی لہروں کے ساتھ بہتا ہوا اُس کے لشکر کے ہمراہ جنوب کی طرف چلا۔ ملتان کا معرکہ کارزار دیکھا جسمیں سکندر زخمی اور نیم جان ہو گیا تھا۔ جس وقت وہ زمین پر گرا ہے۔ میں اگرچہ ایک ذرہ خاک تھا۔ مگر جوش محبت سے ایسا بیتاب ہوا اُس کی پیشانی پر گر کے اُس کا مُنہ چوم لیا۔ پھر اُس کے ساتھ بابل میں واپس آیا۔ اُس کی لاش کے ہمراہ مغرب کی راہ لی۔ اور اُسی کے ساتھ خاک میں دبا دیا گیا۔

خیال تھا کہ اب شاید ہمیشہ کے لئے سکون حاصل ہو جائے۔ اور اسی حالت میں خاموش بیٹھا رہونگا۔ مگر نظام قدرت نے قرار نہ لینے دیا۔ چند روز بعد پھر برآمد ہوا۔ اور قیصر روم کی تلوار میں ایک آبدار ذرہ جوہر بن کے چمکا اور رومیوں کے ساتھ ساتھ مختلف شکلوں اور جسموں میں نمایاں ہو ہو کے میں نے دُور دُور کی سیر کی۔ جزیرۂ روم کے گرد چکر لگایا۔ اور انگلستان میں پہنچا جہاں قسطنطین کی ماں ہلنا کی زلف گرہ گیر کے خم میں چھپا ہوا آگا لیا۔ فرانس

میں نے اس کے شو ہر کے ہمراہ خوش ہوا۔ پھر قسطنطین اعظم کی بنی صلیب کا ایک جوہر بن کے نمودار ہوا۔ اور رومیوں کے ستائے ہوئے پریشان حال مسیحیوں کو اپنی طرف کھینچ کے روم پر حملہ آور ہوا۔ رومۃ الکبریٰ کو فتح کر کے قسطنطنیہ میں آیا۔ اور سینٹ صوفیہ کی عمارت تعمیر کرانے کے بعد ہلینا کے ہمراہ پھر ارضِ مقدس میں وارد ہوا۔ یہاں بڑے بڑے گرجے اور کنیسے تعمیر ہوتے دیکھے۔ یہود کی پامالی کے ساتھ ارضِ مقدس کی دوسری تباہی کا ہولناک منظر دیکھا۔ جبکہ بت پرست قیصر روم نے یہود کے تمام گزشتہ تبرکات کو ایک دم بھر میں جلا کے خاک کر دیا تھا۔

چند روز بعد دیکھا۔ تو مسیحیت رومی تاج و تخت کی وارث تھی۔ یہود ہر جگہ ستائے جاتے تھے۔ اور بھاگ بھاگ کے جان بچاتے تھے۔ آخر میں نے ایک بھاگنے والے گروہ کی گرد کارواں میں شامل ہو کے میں نے ارضِ عرب کی راہ لی۔ اور مدینہ یثرب میں پہنچ کے قرار لیا۔ اب یہاں میں ایک معزز یثربی شخص کے جسم میں تھا کہ پیغمبر عرب علیہ السلام مکے سے ہجرت کر کے وہاں آئے۔ اور میں اُن کے عقیدت کیشوں میں شامل ہو گیا یہاں میں ایک محترم انصاری کی نورانی پیشانی پر سجدہ کا نشان بن کے چمکا۔ اور چند ہی روز بعد عربوں کے اقبال کے ساتھ ساتھ ممالک ارض کی سیر کرنے لگا۔ کبھی عباسیوں کی دستار میں تھا۔ اور کبھی سلجوقیوں کے علم میں۔

آخر بابر کی فوج کے ایک سردار کی تلوار میں جگہ پا کے ہندوستان میں آیا جہاں کبھی امیروں کا خلعت بن کے نمایاں ہوا۔ اور کبھی فقیروں کا کشکول۔ کبھی سپاہی کی تلوار تھا۔ اور کبھی کسی شیخ طریقت کا ظفر تکیہ۔ غرض ایسے ایسے عظیم الشان معاملات کو دیکھ کے۔ اور ایسی ایسی معرکہ آرائیوں کی سیر کر کے دنیاوی جھگڑوں سے آزاد ہوا۔ اب پھر وہی پہلا ذرۂ خاک ہوں اور تیرے اس کلبۂ احزاں کی فضا میں گشت لگا رہا ہوں۔

یہ واقعات سن کے میں نے کہا "اے مقدس و محترم ذرۂ خاک۔ تو تو عجیب مبارک چیز نکلا۔ میری نظر میں تو تجھے ان عظیم الشان کرات فلکی سے بھی زیادہ وقعت و عظمت حاصل ہے۔ آ تجھے اپنے پاس رکھوں۔ اور تیری قدر کروں"۔

بولا: "تم مجھے میری سیر سے نہیں روک سکتے۔ اور نہ مجھے اس کی فرصت ہے۔ اتنے دلچسپ تماشے دیکھے ہیں۔ اور خدا جانے ابھی کیا کیا دیکھونگا۔ یہ نہ سمجھ کہ میں خود اپنے شوق اور اپنی مرضی سے کہیں جاتا یا کچھ کرتا ہوں۔ میری باگ اُس خلاق عالم کے ہاتھ میں ہے۔ جدھر جدھر لیجاتا ہے جاتا ہوں۔ جہاں بٹھا دیتا ہے بیٹھ جاتا ہوں۔ اور جس کام میں لگا دیتا ہے لگ جاتا ہوں۔"

مَیں: "تیری پاک نفسی میں شک نہیں۔ لیکن اب ذرا ٹھہر۔ ہندوستان تیری پوری قدر نہیں کر سکتا۔ مگر میں تجھے انگلستان کے برٹش میوزیم میں بھجوا دونگا۔ جہاں تو ہمیشہ کے لئے محفوظ ہو جائیگا۔ گلی دنیا تجھے دیوتا یا دیوی بنا کے پوجتی۔ اب تو اُن دونوں کی طرح پوجا تو نہ جائیگا۔ مگر میں وعدہ کرتا ہوں۔ کہ دیوتاؤں سے بھی زیادہ تیری عزت کی جائیگی۔ لوگ تجھے سب چیزوں سے زیادہ عزت و ادب کی نگاہ سے دیکھیں گے۔ اور شاید پھر کبھی تجھے اُس عالیشان عمارت سے قدم باہر نکالنے کی زحمت نہ دی جائے گی۔"

یہ سُنتے ہی بگڑ کے بولا: "اس چند روزہ عروج دنیوی پر مغرور نہ ہو۔ کس کی رہی! اور کس کی رہ جائیگی! میں کاہل نہیں۔ اور نہ مجھے فرعون اور کلیوپیٹرا کی لاشوں کے درمیان میں لیٹ کے سونے کا شوق ہے۔ میں ٹھہرنے یا قرار لینے کے لئے نہیں پیدا ہوا ہوں۔ جب تک اجرام فلکی اپنے اپنے حیز کے گرد چکر لگاتے رہینگے۔ اُس وقت تک فضائے ہستی میری جولانگاہ رہیگی۔ بس جا اب اپنا کام کر۔ کیوں تضیع اوقات کر رہا ہے؟ اور مجھے بھی جانے دے۔"

یہ سُنتے ہی مَیں نے ہاتھ بڑھا کے ارادہ کیا۔ کہ اُسے پکڑ لوں۔ مگر ہاتھ کی حرکت سے جو ہوا پیدا ہوئی اُس کے لئے کافی تھی۔ اُڑا۔ اور دھوپ کی نورانی سُلاخ سے علیٰحدہ ہو کے نظر سے غائب ہو گیا۔

## سکندر کا تابوت

صاحبو! تم نے مشاعرے بہت سے دیکھے ہیں۔ اور بہت سے ڈیبٹنگ کلب بھی دیکھ ڈالے۔ جن میں بڑے بڑے شعرا کو غزل سرائی کرتے اور نامی گرامی فصحا کو داد فصاحت دیتے دیکھا ہوگا۔ لیکن ایسی پُر عبرت انجمن نہ دیکھی ہوگی جیسی کہ سکندر کی موت کے وقت اُس کے تابوت کے گرد شہر بابل میں دیکھی گئی تھی۔ سکندر نے بڑے بڑے حکیم اور فلسفی مختلف ممالک سے اور دُور دُور سے بلوا کے اپنی صحبت میں جمع کئے تھے۔ جن کی باتیں سُننے میں اُسے بڑا لطف آیا کرتا تھا۔ ان حکیموں میں یونان کے بھی تھے۔ فارس کے بھی تھے۔ اور ہندوستان کے بھی تھے۔

جب ہندوستان سے واپس جا کے وہ بابل میں مر گیا۔ تو اُس کے وابستگانِ دامن اور لشکر والوں میں رات بھر کہرام مچا رہا۔ صبح کو اُس کا زرنگار اور مرصع تابوت تیار کر کے رکھ دیا گیا۔ اور سکندر اُس میں لٹا دیا گیا۔ اس وقت تمام حکما تابوت کے گرد حلقہ کئے ہوئے تھے۔ اور سب کمال حسرت و اندوہ سے خاموش تھے۔ کہ کسی حکیم نے نہایت ہی جوشِ دل سے آگے بڑھ کے تابوت پر ہاتھ رکھا۔ اور کہا "آہ جو بڑے بڑے سرکشوں کو اسیر کر لیا کرتا تھا۔ آج وہ خود اسیر ہے!" اور اس کے بعد دیگر حکما سے کہا "آپ سب صاحب بھی تابوت پر ہاتھ رکھ رکھ کے اپنے جذباتِ دلی کو ظاہر کریں۔ دیکھوں آپ کیا کہتے ہیں۔" یہ سُنتے ہی سب حکیموں نے بڑھ بڑھ کے اور تابوت پر ہاتھ رکھ رکھ کے اپنے خیالات ظاہر کرنا شروع کر دیے۔

ایک بولا "بادشاہ سونے چاندی کو اپنے صندوق میں بند کیا کرتا تھا۔ اور آج خود زرنگار صندوق (تابوت) میں بند ہے"

دوسرے نے بڑھ کے کہا "آہ! اس جسم نے کیسا دنیا کو چھوڑا۔ اور اب تابوت میں جانے کی اسے کیسی جلدی تھی۔"

تیسرا بولا "کیسی حیرت کی بات ہے۔ کہ جو سب پر غالب تھا مغلوب ہو گیا۔ اور جو ضعیف تھے رنگ رلیاں منا رہے ہیں۔ اور پھولے نہیں سماتے ہیں۔"

چوتھے نے کہا "یہ وہ شخص ہے جس نے موت کے خیال کو تو مخفی رکھا۔ اور اپنی آرزوئیں عالم آشکارا کر دیں۔ پھر موت کو کچھ دنوں اور کیوں نہ ٹالا۔ کہ آرزوئیں

برآئیں" یا اپنی اُمیدوں کو اتنا مختصر ہی کیوں نہ رکھا۔ کہ وہ موت کی دست برد سے بچ جاتیں !"

پانچویں نے کہا: "او غم زدہ کوشش کرنے والے! تو نے وہ چیز جمع کی جس کی احتیاج رکھنے کے باعث تو ذلیل و خوار ہوا۔ پھر اُس کے بوجھ نے تیرے ساتھ بیوفائی کی۔ اور اُس کی تحصیل کے گناہوں کو تو نے کمایا۔ نتیجہ یہ ہے۔ کہ تو نے جو کچھ پیدا کیا۔ عزیزوں کے لئے تھا۔ اور اُس کا گناہ تیرے ہی گردن پر ہے۔

چھٹے نے کہا: "تو ہمیں اکثر نصیحت کیا کرتا تھا۔ مگر اس مر جانے سے زیادہ بلیغ نصیحت کبھی نہیں کی تھی۔ لہذا جو عقل رکھتا ہو سمجھے اور جو چشم عبرت رکھتا ہو عبرت پکڑے۔"

ساتویں نے کہا: "بہت سے ہیبت زدہ تجھ سے دور اور تیرے خوف سے کانپتے رہتے۔ اور آج وہ تیرے سامنے اور پاس کھڑے ہیں۔ اور تجھ سے نہیں ڈرتے۔

آٹھویں نے کہا: "بہت سے ایسے ہونگے۔ کہ جب تو تقریر کرتا ہو اُنھیں آرزو ہوتی۔ کہ تو خاموش ہوجائے۔ آج اُنھیں کو تمنا ہے۔ کہ کوئی لفظ تیری زبان سے سنیں۔ اور تو خاموش ہے۔"

نواں بولا: "کتنوں نے اس غرض سے اپنی پیاری جانیں دیں۔ کہ تو نہ مرے اور بچ جائے۔ مگر آخر تو مر ہی گیا۔"

دسواں بولا: "مجھے حکم تھا۔ کہ آپ سے جدا نہ ہوں۔ اور آج کوئی تدبیر نہیں بن پڑتی کہ کیونکر آپ تک رسائی ہو۔"

گیارھواں بولا۔ آج کا دن عظیم الشان دن ہے۔ آگے جو مصیبتیں جا رہی تھیں پلٹ آئیں۔ اور اس کی جو برکتیں آرہی تھیں۔ واپس گئیں۔ ہند جس شخص کی سلطنت چھن گئی اُس پر جس کسی کو آگر رونا ہو آکے رو لے۔"

بارھواں بولا: "اے صاحب جبروت! تیرا جبروت اس طرح دیکھتے دیکھتے غائب ہو گیا جیسے بدلی کو ہوا اڑا لے جاتی ہے۔ اور تیری سلطنت کے آثار یوں مٹ گئے جس طرح مٹھی اُٹھ جاتی ہے۔"

تیرھویں نے کہا: "اے وہ شخص جسے ساری دنیا باوجود اس طول و عرض کے تنگ نظر آتی تھی اب بتا کہ اس گز بھر زمین پر جس پر تیرا تابوت رکھا ہوا ہے، تیرا کیا حال ہے؟"

چودھویں نے کہا: "اس شخص پر تعجب کرو جس کی یہ وضع و حالت ہو۔ دولت کے فراہم کرنے میں بڑی شہرت حاصل کی مگر وہ دولت ہی کیا تھی۔ ایک حقیر یا ذرا سی مٹ جانے والی چیز یا ایک پرانا بوسیدہ اور کھوکھل درخت"

پندرھواں بولا: "لوگو۔ اس چیز سے رغبت نہ کرو۔ جس کی مسرت ناپائدار ہو۔ اور جس کی لذت جاتی رہتی ہو۔ آج تو تم پر کھل گیا کہ کون چیز مٹنے والی ہے۔ اور کون رہنے والی"

سولھواں تابوت پر ہاتھ رکھ کے بولا۔ "دیکھو۔ اس سونے والے کا وقار کیسا تشریف لے گیا! اور بدلی کیسی چھنٹ گئی!"

سترھویں نے قدم آگے بڑھا کے کہا: "اے وہ شخص جس کا غصہ موت تھا۔ تجھے موت پر غصہ نہ آیا؟"

اٹھارھویں نے کہا: "اس گذرے ہوئے بادشاہ کو تم نے دیکھا۔ اب جو بادشاہ زندہ ہے باقی ہے۔ اسے دیکھ کے نصیحت پکڑے"

انیسویں نے کہا: "جس کی آواز پر خموشی سے کان لگے رہتے تھے۔ آج خود خموش ہے۔ لہذا جو خموش تھے۔ اب ان کیلئے موقع ہے۔ کہ بولیں"

بیسویں نے کہا: "عنقریب وہ بھی تجھ سے آملیگا۔ جو تیری موت پر خوش ہوا ہو جس طرح تو اس سے جا ملا۔ جس کے مرنے کی تجھے خوشی تھی۔

اکیسویں نے کہا: "یہ کیا ہوا کہ اب تو کوئی ہاتھ پاؤں نہیں ہلاتا۔ حالانکہ تو وہ ہے جس کی نظر میں ساری دنیا حقیر و ذلیل تھی۔ اور کیا ہوا کہ تو تنگی مکان سے نہیں گھبراتا۔ حالانکہ شہروں کی چار دیواری میں بھی تیرا دم گھٹتا تھا۔"

بائیسویں نے بڑھ کے کہا: "دنیا کا یہ انجام ہے۔ اس لئے اس سے پہلے ہی سے بیلوث رہا جائے۔ تو خوب ہے۔

اب حکما و فلسفی خاموش ہوئے۔ تو سکندر کے داروغہ باورچی خانہ نے آ کے

تابوت پر ہاتھ رکھا اور کہا: "دسترخوان بچھے ہوئے ہیں۔ اور کھانے چنے ہوئے ہیں۔ مگر سوال رقعہ کا پتہ نہیں۔" اس کے بعد خزانچی نے آ کے کہا: "مجھے دولت جمع کر کر کے رکھنے کا حکم تھا۔ اب یہ دولت کس کے حوالے کروں۔" اتنے میں کسی اور شکستہ دل نے آ کے کہا: "یہ ساری لمبی چوڑی زمین اب سمٹ کے سات بالشت کی رہ گئی، جس پر تابوت رکھا ہوا ہے۔ اگر یہ انجام پہلے سے معلوم ہوتا۔ تو اس کے اور چھور کا پتہ لگانے کے لئے تو گھر سے کبھی قدم باہر نہ نکالتا۔"

اب دارا کی بیٹی روشنک جو اس کی بیاہی تھی بڑھ کے آئی اور بولی: "تم سب نے جو کچھ کہا اس سے تعریض اور طعن و تشنیع کی بو آتی ہے۔ میں تو بس اتنا کہوں گی کہ مجھے اس کی خبر نہ تھی کہ جس نے سارے عجم کو مغلوب کیا تھا، کبھی وہ خود بھی مغلوب ہوگا۔ پھر سب کی طرف دیکھ کے کہا: "جو جام اس نے پیا اسے تمہارے لئے چھوڑ گیا ہے۔ لہذا اب اس کے بعد اسے تم سب بھر بھر کے پینا۔"

اس کے بعد جب سکندر کے مرنے کی خبر اس کی ماں کو پہنچی۔ تو بولی: "آہ! میرا بیٹا تو دنیا سے چل بسا مگر اس کی یاد میرے دل سے نہیں مٹی۔"

## پہلی صدی کا ایک مرتد

جس وقت دحیہ کلبی حضرت سرورِ کائنات کا نامہ لے کے قیصر روم ہرقل کے دربار میں پہنچے ہیں۔ اور اس نے عرب کے سوداگروں کو بلوا کے جن کے سرگروہ ابوسفیان تھے، ان حضرت کے اور مسلمانوں کے حالات پوچھے ہیں۔ تو منجملہ اور سوالوں کے اس کا ایک سوال یہ بھی تھا کہ جب لوگ اس شخص (رسول اللہ صلعم) پر ایمان لے آتے ہیں تو کبھی کوئی اس دین سے پھر بھی جاتا ہے یا نہیں؟ اس کا جواب ابوسفیان باوجودیکہ دین اسلام کی مخالفت کرنا چاہتے تھے یہی دے سکے تھے کہ "کوئی نہیں"۔ لیکن آج کل اس کے خلاف ہم یہ دیکھتے ہیں کہ بعض نا سمجھ لوگ دین حق کو ترک کر دیتے ہیں۔ اس کے اسباب پر غور کرنا علمائے دین اور واعظینِ ملتِ محمدیہ کا کام ہے۔ جس موقع پر یہ دکھانا ہے کہ پہلی صدی ہجری میں بھی کئی مسلمان عیسائی ہو گئے تھے۔ لیکن ان کی

حالت میں اور ان لوگوں کی حالت میں جو آج کل اسلام سے منحرف ہوجاتے ہیں بڑا فرق ہے۔

اسلام میں کسی مسلمان کے عیسائی ہونے کا سب سے پہلا واقعہ تو بادشاہ بنی غسان جبلہ بن ایہم غسانی کا ہے۔ بنی غسان کا ملک عرب کے شمال میں ارض یہود و شام سے ملا ہوا تھا۔ اور بعثت محمدی سے بہت پہلے بنی غسان اور اُن کے تاجدار دولت روم سے مغلوب ہوکے عیسائی ہوچکے تھے۔ نیز اسلام کے طلوع ہونے کے بعد تمام بنی غسان اور اُن کے فرماں روا جبلہ نے دین اسلام قبول کیا۔ مگر حضرت عمر کے زمانے میں اتفاقاً اُن کا بادشاہ جبلہ بن ایہم آستان بوسی خلافت کے لئے مدینہ میں آیا۔ جس کا استقبال اہل مدینہ نے بڑے جوش و خروش سے کیا۔ کیونکہ غسانی فرماں رواؤں کی عظمت کے صدہا قصے جاہلیت ہی میں اہل عرب میں مشہور تھے۔ اور شاہانہ شوکت و جبروت کا جو خاکہ اُن کی نظروں کے سامنے تھا۔ وہ شاہان آل غسان ہی کا تھا۔ لہذا حضرت عمر نے بھی اُس کے استقبال میں کسی قسم کی کمی نہیں کی۔ مگر بدنصیبی سے کسی غریب صحابی کا ہاتھ نادانستگی سے کچھ سطح جبلہ پر پڑ گیا۔ کہ اُس کی ازار (تہمد) کھل کے گر پڑی۔ جبلہ کے دل سے شاہی نخوت کی بو ابھی گئی نہ تھی بے اختیار اُن صحابی کے تھپیڑ مار بیٹھا حضرت عمر نے اس پر برہم ہوکے قصاص کا حکم دیا۔ کہ وہ صحابی بھی جبلہ کے تھپیڑ ماریں۔ اس ہتک و توہین کو جبلہ برداشت نہ کرسکا۔ اور تعمیل قصاص کے لئے رات بھر کی اجازت مانگی۔ مگر صبح ہونے سے پہلے ہی بھاگ کے اپنے وطن ارض بلقا میں پہنچا۔ اور جب دیکھا کہ یہاں بھی دور فاروقی سے پناہ نہیں مل سکتی۔ تو اپنے ہم قوموں کے ایک بڑے گروہ کے ساتھ بھاگ کے قلمرو روم میں گیا۔ اور آخر قسطنطنیہ میں جا کے مع تمام ہمراہیوں کے پھر عیسائی ہوگیا۔ اور اسی مذہب پر وہاں مرا۔ مگر زندگانی بھر یہ حالت رہی۔ کہ اپنے کئے پر پچھتاتا تھا۔ اور وطن کی صحبتوں اور عربوں کی انجمنوں کو یاد کرکے رویا کرتا تھا۔

لیکن اس سے بھی زیادہ دلچسپ واقعہ ایک اور مرتد کا ہے۔ جو خاص حجازی النسل عرب تھا۔ اور بنی مخزوم میں سے جس قبیلہ کی ایک یادگار حضرت خالد بن ولید بھی تھے۔

حسن ز بصرہ بلال از حبش صہیب از شام ز خاک مکہ ابوجہل ایں چہ بوالعجبی ست

عمر بن عبد العزیز کے عہد خلافت میں اسی زمانہ کے ایک معزز شخص اسماعیل بن عبد الحکیم کا بیان ہے۔ کہ میں ایک دن خلیفہ مذکور کے دیندارانہ دربار میں حاضر تھا کہ خلافت کا ایک سفیر جو مسلمان اسیروں کو رومیوں کے ہاتھ سے چھڑانے کے لیے بھیجا گیا تھا۔ فرائض سفارت پورے کر کے واپس آیا۔ اثنائے کلام میں اُس نے ایک یہ واقعہ بھی بیان کیا کہ:

ایک دن میں قسطنطنیہ کی سیر کے لئے گھر سے نکلا۔ اور گلی کوچوں میں اپنے خچر پر سوار پھر رہا تھا۔ کہ ناگہاں میرے کان میں آواز آئی۔ کہ جیسے کوئی فصیح و بلیغ عربی لہجہ میں نہایت ہی سوز و گداز کے ساتھ عجب درد بھری دلکش دھن میں تین شعر گا رہا ہے جن سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ اپنے وطن گھر بار اور صحبت احباب کو بڑی حسرت کے ساتھ یاد کرتا ہے اُس کے اُن شعروں۔ اُس کے نغمہ کی دلکش دھن۔ اور اُس کے دل کو پاش پاش کر دینے والے الفاظ نے میرے دل پر جادو کا اثر کیا۔ بے اختیار اُس کی طرف نپکا۔ اور آخر جاتے جاتے معلوم ہوا کہ ایک بلند کھڑکی سے آواز آرہی ہے۔ خوش قسمتی سے اُس کھڑکی تک پہنچنے کے لئے زینہ بھی بنے ہوئے تھے۔ میں فوراً خچر سے اُتر پڑا اُس کی لگام کسی چیز میں اٹکا دی۔ اور زینہ پر چڑھ کے جھانکا۔ تو نظر آیا کہ ایک شخص چت لیٹا ہوا ہے۔ ایک پاؤں دوسرے پر رکھے ہوئے ہے۔ اور لیٹے ہی لیٹے تین عربی شعروں کو گاتا ہے۔ جب گا چکتا ہے۔ تو پھوٹ پھوٹ کے رونے لگتا ہے۔ اور تھوڑی دیر رونے کے بعد پھر انھیں شروع کر دیتا ہے۔ اب مجھ میں صبر کی تاب نہ تھی۔ بے اختیار کہا "السلام علیکم" میری آواز سنتے ہی وہ سنبھل کے اٹھ بیٹھا اور کہا "وعلیکم السلام" میں نے کہا "اب آنسو پونچھ ڈالو اور خوش ہو کیونکہ تمہاری اسیری کا زمانہ ختم ہوا۔ میں امیر المومنین عمر بن عبد العزیز کا فرستادہ ہوں۔ اور اس لئے آیا ہوں۔ کہ جتنے مسلمان قیدی اس سرکش بادشاہ کے پنجہ میں پھنسے ہوئے ہیں۔ انھیں زر فدیہ دے کر آزاد کر دوں"۔ اس کا وہ ہنوز جواب نہیں دینے پایا تھا۔ کہ میں نے کہا "اچھا یہ تو بتاؤ کہ تم کون ہو؟"

بولا "مجھے کیا پوچھتے ہو، میں وابصی کے نام سے مشہور ہوں۔ اتفاقاً ان نصرانیوں کے ہاتھ میں اسیر ہو گیا۔ انھوں نے پکڑ کے مجھ پر اتنے ظلم کئے۔ کہ مجبوراً اُن کا دین قبول کر لیا"۔

میں نے کہا "تو چاہیے، تم ہو و لشد میں سب سے پہلے تمہارے آزاد کرانے کی تدبیر کرونگا
اور یہی میر مومنین بھی کرینگے۔ بشرطیکہ تم دل سے کافر نہ ہوگئے ہو"!
بولا۔ میں تو خدا کی قسم کافر ہوگیا!
میں نے کہا "اچھا تو میں تمہیں قسم دلاتا ہوں۔ کہ پھر مسلمان ہو جاؤ۔
بولا "میں پھر مسلمان ہو جاؤں! اور ان دونوں بچوں کا کیا حشر ہوگا۔ جو یہاں موجود ہیں؟ کیا
کہوں میں نے تو ایک نصرانیہ عورت سے نکاح کرلیا ہے۔ اور اُس کے بطن سے دو بچے
پیدا ہو چکے ہیں۔ علاوہ بریں اس بات کا بھی خیال آتا ہے۔ کہ اب جو مسلمان ہو کے مدینہ
میں چلوں گا۔ تو چاروں طرف سے انگلیاں اُٹھینگی۔ کہ وہ نصرانی آتا ہے۔ اور جیسی
سلوک ان بچوں اور ان کی ماں کے ساتھ ہوگا۔ بھئی مجھ سے تو بخدا یہ نہ ہو سکے گا"!
میں نے کہا "تم نے قرآن بھی پڑھا ہوگا۔ اب بھی اُس کی کوئی سورت یاد ہے"؟
بولا "ہاں پڑھا ہے اور جب تک مسلمان تھا۔ برابر تلاوت کیا کرتا تھا۔ مگر اب تو سب
بھول گیا۔ بس ایک یہ آیت یاد رہ گئی ہے۔ ربما یود الذین کفروا لو کانوا مسلمین
(اکثر یہ ہوتا ہے کہ کافروں کو تمنا ہوتی ہے کاش ہم مسلمان ہوتے)
یہ جواب سُن کے میں نے پھر اُسے اسلام کا شوق دلایا۔ اور اطمینان دلایا کہ تمہیں
کوئی کچھ نہ کہیگا۔
بولا "مگر یہ صلیب کی پرستش کرنے۔ شراب پینے اور سُور کھانے کے دھبّے جو لگ چکے ہیں
کیسے چھوٹینگے"!
میں نے کہا "بھلا یہ تمہارے کہنے کی بات ہے؟ کیا تمہیں اس کا خیال نہیں۔ اِلّا مَن اُکرِہَ
وقلبہ مطمئن بالایمان (مگر وہ جو مجبور کیا جائے۔ اور اُس کا دل ایمان کی برکت سے مطمئن ہو)
مگر میرے اس کہنے کا اُس پر کچھ اثر نہیں ہوا۔ میں سمجھاتا تھا۔ اور وہ بار بار یہی کہے جاتا تھا کہ
"اس پرستش صلیب میخواری اور سُور کھانے کے دھبّے کیونکر مٹیں گے"؟ آخر میں عاجز ہو کے
واپس چلا آیا۔
یہ حالات سُنتے ہی عمر بن عبدالعزیز نے دعا کے لئے ہاتھ اُٹھائے اور کہا "بارالہا!
اتنی مہربانی کر کہ مجھے مرنے سے پہلے اس شخص پر قابو مل جائے"! اسمٰعیل بن عبدالحکیم کا بیان
ہے۔ کہ عمر بن عبدالعزیز نے ایسی رقّت قلب سے دعا مانگی تھی کہ مجھے کبھی بھولنے کو نہ آئی

اور ہمیشہ یہ خیال رہا۔ کہ کبھی نہ کبھی یہ مرتد شخص اُس کے پنجہ میں ضرور آجائیگا۔

غالباً اس واقعہ سے پہلے ایک بصری شخص بھی اس والجی سے ملا تھا۔ وہ کہتا ہے۔ میں کسی ضرورت سے قلمرو روم میں سفر کر رہا تھا۔ اتفاقاً رومیوں کے ایک قلعہ کے نیچے گذر ہوا۔ ناگہاں میرے کان میں آواز آئی۔ کہ جیسے کوئی شخص عربی کے چند شعر گا رہا ہے (اور اُس نے بھی وہی شعر بتائے ہیں۔ جو عمر بن عبد العزیز کے سفیر مذکور نے بتائے تھے) وہ دلکش نغمہ اور اُس کفرستان میں سُن کے میں چونکتا ہوا۔ اور پکار کے کہا۔ "یہ کون گا رہا ہے؟" فوراً ایک خوش رو اور توانا تندرست آدمی فصیل کے اوپر نمودار ہوا۔ اور بولا "میں!" میں نے کہا "آخر تم کون ہو۔ اور اپنی کچھ سرگزشت تو بیان کرو؟"

بولا "میں غازیان عرب میں سے ایک شخص ہوں۔ جہاں تم کھڑے ہو۔ کبھی یہیں آکے میں بھی ٹھہرا تھا۔ ناگہاں اوپر ایک ایسی ملائک فریب اور پری تمثال نازنین نمودار ہوئی۔ کہ دیکھتے ہی ؎

ہوش جاتا رہا نگاہ کے ساتھ　　صبر رخصت ہوا ایک آہ کے ساتھ

آخر دل کو سنبھال کے میں نے اظہار شوق کیا۔ اور وہ کمال بیباکی و شوخی سے بولی "منظور۔ بشرطیکہ میرا دین قبول ہو۔" میں اُس کے حسن و جمال کا ایسا شیدا ہو چکا تھا کہ شیطان نے دل پر غلبہ کیا اور بے اختیار میرے مُنہ سے نکلا

ہم عشق کے بندے ہیں مذہب سے نہیں واقف　　گر کعبہ ہوا تو کیا بتخانہ ہوا تو کیا؟

بلا تامل اُس کے مذہب میں داخل ہو گیا۔ اور وہ اپنے وعدے کے موافق میری بی بی بن گئی۔ بس اُس وقت سے میری یہ حالت ہے جو تم دیکھ رہے ہو!"

میں نے پوچھا "قرآن کچھ اب بھی یاد ہے؟"

بولا "بس اتنا ہی کہ ربما یود الذین کفروا لو کانوا مسلمین۔ وہی آیت جس کا ترجمہ ابھی بتایا جا چکا ہے۔

میں نے کہا "اگر تمہاری مرضی ہو۔ تو ہم تمہاری طرف سے زر تاوان ادا کر کے تمہیں عیسائیوں کے ہاتھ سے چھڑا لیں؟"

یہ سُن کے وہ دیر تک سر جھکا کے سوچتا رہا۔ پھر بولا "خواہ مخواہ کیوں جھگڑے

میں پڑتے ہو۔ جاؤ اپنی راہ لو۔ بس خدا حافظ"۔ یہ کہہ کے وہ غائب ہوگیا۔

اصلی واقعہ یہ ہے۔ کہ یہ والعبی پہلی صدی ہجری کا ایک مشہور مغنی تھا جو خاص مدینہ کا رہنے والا تھا۔ اور اُس نے گانے بجانے میں ایک حد تک مقبولیت حاصل کر لی تھی لیکن اس کے ساتھ مے کشی کی بھی لت تھی۔ کچھ دنوں تو نبھتی چلی گئی۔ جبکہ والیان بنی اُمیہ اس قسم کے گناہوں سے زیادہ تعرض نہ کرتے تھے۔ لیکن جب عمر بن عبدالعزیز مسند خلافت پر جلوہ افروز ہونے سے پہلے والئی حجاز مقرر ہوا۔ تو اُس نے والعبی کو میکشی کے جرم میں گرفتار کر کے درّے لگوا دیئے۔ اُس سزا یابی پر اُس نے مدینہ سے بھاگ کے ارض روم کی راہ لی۔ اور عیسائیوں کی قلمرو میں جا کے مقیم ہوا۔ ممکن ہے۔ کہ یہ دمشق سے مجاہدین صائفہ[ع] (موسم گرما کی لڑائی) کے ساتھ ملکے روانہ ہوا ہو۔ مگر روانگی کا محرک شوق جہاد نہیں۔ بلکہ صرف اسلامی تہذیب و تادیب سے بچنا تھا۔ اور یہ بھی بعید نہیں۔ کہ وہاں ہو دنج کے اظہار ارتداد کا ذریعہ اُس عورت پر فریفتہ ہونا ہوا ہو۔ ورنہ اصل میں یہ پہلے ہی دین اسلام سے علیحدہ ہونے پر آمادہ ہو چکا تھا۔ اس کا بھائی مدینہ میں مدت تک زندہ رہا جو غالباً اُس کی بے دینی پر افسوس کرتا ہوگا۔

اس مرتد کی اور نیز جبلہ بن ایہم ملک غسان کی حالت سے ظاہر ہوتا ہے کہ دونوں اپنے عیسائی ہو جانے پر مرتے دم تک نادم و پشیمان رہے۔ اور پچھتایا کرتے تھے۔ خصوصاً والعبی تو یہ بھی مانتا تھا۔ کہ میں کافر ہوں خدا کو بھولا ہوا ہوں اور شیطان کے پھندے میں اسیر ہوں۔ مگر افسوس مے کشی اور جوش عشق نے بے بس کر دیا ہے۔ ایسے شخص کی نسبت حضرات شیعہ تو بلا تامل کہہ دینگے۔ کہ وہ مومن تھا۔ اور تقیۃً کافر بنا ہوا تھا جس سے اس کی ایمانداری پر حرف نہیں آسکتا۔ مگر اہل سنت کے اصول کے مطابق بھی چونکہ اُس نے اپنے کفر کو کفر تسلیم کر لیا

---

ع‍ه ملک روم میں اتنی شدت سے سردی پڑتی ہے۔ کہ جاڑوں میں لشکر کشی دشوار تھی۔ لہذا معمول ہوگیا تھا۔ کہ ہر سال گرمیوں کا موسم شروع ہوتے ہی جہاد شروع کیا جاتا اور وہ صائفہ کے نام سے یاد کیا جاتا۔ بنی عباس کے زمانہ میں صائفہ کا ایک فیشن سا ہوگیا جس میں حصول ثواب کے لئے اکثر علماء دیندار اور ائمہ علوم بھی شریک ہو جایا کرتے۔ اگرچہ اُن کا ماحصل اب سوا سرحدی چھین جھپٹ کے کچھ نہیں باقی رہا تھا۔

لہٰذا سوائے سنی دنیا جر کے کوئی مشکل سے اُسے کافر کہہ سکے گا۔ بہرحال گو ترک تھا مگر دل سے مسلمان تھا۔ اور کوئی چیز اُس کی ایمانداری اور توحید کو ایسا نہ بدل سکی کہ صلیب پرستی وے کشی وغیرہ کو بے دینی نہ تصور کرتا۔

برخلاف اس کے ضعفِ ایمانی کی اس سے بڑھ کے کون دلیل ہوگی۔ کہ آج کل جو مسلمان عیسائیوں کے پھندے میں پھنس کے عیسائی بنتے ہیں۔ اُن میں بعض حقیقتہً اسلام سے متنفر بلکہ اس کے دشمن ہوجاتے ہیں۔ حضرات مقتدایانِ دین۔ اس تفرقہ کو مٹایئے۔ اور مسلمانوں کو پھر ایسا بنا دیجئے کہ اُن میں سے کوئی کافر بھی ہوجائے۔ تو اپنے آپ کو کافر ہی سمجھے۔

## اُولوالعزمی

بہر کارے کہ ہمت بستہ گردد ۔۔۔ اگر خارے بود گلدستہ گردد

دنیا میں یہ جتنی برکتیں نظر آرہی ہیں۔ سب اُولوالعزمی کا صدقہ ہیں۔ یورپ کے بڑے بڑے کام جو آج کل معجزات نظر آرہے ہیں۔ سچ پوچھو۔ تو یہ سب ہمت نہ ہارنے کے معجزات اور حوصلہ مندی کے کرامات ہیں۔ انسان کسی کام کی نسبت یہ نہ خیال کرے۔ کہ نہیں ہوسکتا۔ بس پھر یقین کرلو۔ کہ وہ سب کچھ کرلے جائیگا۔ نپولین اعظم جو یہ کہا کرتا تھا۔ کہ اگر میرا بس چلے۔ تو "غیر ممکن" کے لفظ کو لغات کے صفحوں پر سے مٹا دیتا۔ بہت صحیح کہتا تھا۔ اس سے اُس کا یہ مطلب نہ تھا کہ غیر ممکن کوئی چیز نہیں ہے۔ بلکہ یہ مقصد تھا۔ کہ اسی "ناممکن" ہونے کے خیال نے دُنیا میں بہت سے ایسے کام نہ ہونے دیئے۔ جو ہوسکتے تھے۔

یونانیوں کے فلسفہ اور اُن کی عقل و دانائی کی سب میں شہرت ہے۔ مگر ہمارے یہاں لوگوں کو بھی اس کی خبر نہیں۔ کہ یونانی جیسے عقلمند تھے۔ ویسے ہی بہادر اور شجاع بھی تھے۔ کوئی تعجب نہیں۔ جو اکثر عوام کے ذہن میں یہ خیال ہو کہ یونانی سب کے سب پڑھے لکھے تھے۔ اُن میں کا ہر شخص ایک اعلیٰ درجے کا مولوی تھا۔ اور مولویوں کو شجاعت و سپہگری سے کیا کام۔ مگر نہیں۔ فلسفی تو اُن میں چند گنتی ہی کے لوگ تھے۔ دنیا میں جس چیز نے یونانیوں کو زیادہ چمکایا

یونان کی اعلیٰ درجہ کی سپہگری بہادری اور اُلوالعزمی ہی تھی۔

اُنھوں نے ایرانیوں کے عظیم الشان لشکر کو شکست دی۔ کیخسرو کے جہازوں کے بیڑے کو تباہ کر دیا۔ بڑی بڑی زبردست قوموں کو اُن کے آگے سر عجز جھکانا پڑا۔ اور اسی قسم کے بیسیوں واقعات اُن کی تاریخ میں نظر آتے ہیں۔ مگر اُن کی ہمت بلند اُن کی حوصلہ مندی۔ اُن کی اُلوالعزمی کا سب سے زیادہ مکمل نمونہ فتح اور کامیابی میں نہیں بلکہ ایک شکست اور پسپائی میں نظر آیا۔ جو دُنیا کو کبھی نہ بھول سکے گی۔ وُہ ایک ایسی پسپائی تھی۔ جس پر سو فتحوں کو قربان کر دینا چاہیئے۔

یونانیوں کی تاریخ سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ کیخسرو کا بیٹا اورشیر جو ایرانیوں میں غالباً شاپور ذوالاکتاف کے لقب سے شہرت رکھتا ہے) جب ۹۹۵ سنہ قبل محمدؐ میں مرا تو اُس کا وارث سلطنت دارائے نوتھوس ہوا۔ دارائے مذکور نے دو بیٹے چھوڑے بڑا اردشیر جو دار السلطنت میں تھا۔ اور چھوٹا سائرس (خسرو) جو کہ باپ کے مرتے وقت سارڈیس کا حاکم تھا۔ خسرو اگرچہ عمر میں چھوٹا تھا۔ مگر باپ کی تخت نشین کے بعد اور اُس کے سریر آرائی کے زمانہ میں پیدا ہوا تھا۔ اس لئے سمجھتا تھا۔ کہ اصلی وارث سریر شہریاری میں ہی ہوں۔ مگر اُس کے وطن میں نہ موجود ہونے کی وجہ سے اردشیر کو تخت نشینی کا موقع مل گیا۔ اور خسرو کو جب اس کی خبر پہنچی۔ تو چڑھائی کی تیاریاں کر دیں اور سارڈیس میں فوج جمع کرنے لگا۔ اطراف و جوانب کے علاقوں سے بہت سا لشکر جمع کیا۔ اور یونان میں حاکم اسپارٹا کو لکھا کہ "میرا ارادہ ہے۔ کہ صوبہ پی سی ڈیا کو فتح کروں۔ اس لئے تم یونانیوں کا ایک لشکر مرتب کر کے میرے پاس بھیج دو۔" اہل اسپارٹا نے حکمرانِ عجم کی یہ درخواست قبول کی۔ اور گیارہ ہزار یونانیوں کا ایک لشکر جرار اسپارٹی نژاد سپہ سالار کلئے آرچوس کے زیر علم سارڈیس میں آیا۔ تاکہ شہزادۂ عجم کے ساتھ مہم پر روانہ ہو۔

خسرو مذکور اپنے تمام فراہم شدہ لشکر کو لے کے مشرق کی طرف روانہ ہوا کہ تاج و تخت کو بزور شمشیر بڑے بھائی سے چھینے۔ شہر طوسوس میں پہونچ کے یونانیوں کو معلوم ہوا کہ ہم کسی صوبہ کے فتح کرنے کو نہیں۔ بلکہ ایک بھائی کی طرفداری کے دوسرے بھائی سے لڑنے کو جا رہے ہیں۔ یہ معلوم ہوتے

ہی وہ لوگ رُک گئے۔ اور ایسی باہمی خونریزی میں خسرو کا ساتھ دینے سے انکار
کیا۔ مگر خسرو سمجھا بجھا کے اور زبردستیاں کر کے انھیں لے ہی گیا۔ ہنوز کسی حریف سے
معرکہ آرائی کی نوبت بھی نہیں آنے پائی تھی۔ کہ یونانیوں کو معلوم ہوا۔ ہم دریائے
فرات کے پار اُتر آئے ہیں۔ اور ہمارے اور وطن کے درمیان ایک بڑا دریا
حائل ہو گیا۔ مگر مجبور تھے۔ آگے بڑھے۔ شہر تونا کسا میں جو لب فرات سے
مشرق جانب تقریباً ۷۵ میل آگے بڑھ گئے تھا۔ دونوں بھائیوں کے لشکر
ایک دوسرے کے مقابل صف آرا ہوئے۔

لڑائی ہوئی اور جفاکش وجاں باز یونانی تھوڑی ہی دیر میں عیش پرست
حریفوں پر غالب آ گئے۔ مگر ابھی فتح و شکست کا فیصلہ نہیں ہونے پایا
تھا۔ کہ نوجوان شاہزادہ خسرو جوش و خروش سے خود میدان میں آیا۔ اور
اکیلا اپنے بھائی اردشیر کے مقابل ہوا۔ دونوں میں دست بدست لڑائی
ہوئی۔ اور دیر تک کی نبرد آزمائی کے بعد خسرو بڑے بھائی کے ہاتھ سے مارا گیا
کہا جاتا ہے۔ کہ اردشیر نے دغابازی کی۔ اور اُس کے کسی ہمراہ سپاہی نے
خسرو پر حربہ کر کے اُس کا کام تمام کر دیا۔ خیر جس طرح ہو۔ خاتمۂ جنگ
اسی پر ہوا۔ کہ حوصلہ مند نوعمر بھائی خاک و خون میں تھڑا پڑا تھا۔ اور
اردشیر کی طرف فتح کے نعرے بلند ہو رہے تھے۔

خسرو کی فوج جس میں ایرانی بھی تھے۔ مغربی صوبجات ایران کے بھی سپاہی
تھے۔ اور بہت سے یونانی بھی تھے۔ اُس کے مارے جانے کے بعد سرسیمہ و حیران
تھی۔ کہ اب ہم کیا کریں۔ وطن سے منزلوں دور ہیں۔ اور دشمن کی قلمرو کے اندر
مجبوراً انھوں نے صلح کی گفتگو چھیڑی۔ اردشیر نے جواب دیا۔ مجھے تم لوگوں سے تو
کوئی پرخاش نہیں۔ مگر یونانیوں کو میں ابھی نہیں۔ بلکہ آئندہ ایک دو ہفتہ میں واپسِ وطن
کی اجازت دوں گا۔ یہ کہہ کے اپنے اور مقتول بھائی کے دونوں لشکروں کو لے
کے مشرق طرف چلا۔ اور کشتیوں کا پل بنوا کے یونانیوں کو دریائے دجلہ کے
بھی پار اُتار لے گیا۔ دجلہ سے پار ہونے کے بعد یونانیوں کو نظر آیا۔ کہ ان
کے ہمراہ جو ایرانی خسرو کے لشکر میں تھے۔ وہ اردشیر سے ملے ہوئے ہیں

وہ دریائے دجلہ و فرات کے پار اتار لانے کے بعد اس فکر میں لگے ہوئے ہیں کہ یونانیوں کو فریب میں رکھ کے جب موقع ملے ہلاک کر ڈالیں۔ اس سازش کا حال معلوم ہوتے ہی یونانی اگرچہ دشمن کے ملک میں تھے۔ مکار دشمن کے جال میں پھنسے ہوئے تھے۔ اور وطن کے اور اُن کے درمیان میں دو عظیم الشان دریائے ذخار حائل تھے۔ مگر مستعدی سے اپنی حفاظت پر آمادہ ہو گئے۔ کوئی وقت نہ ہوتا جب وہ ہوشیار اور بیدار نہ نظر آتے ہوں۔ اور سب نے دل میں ٹھان لی تھی۔ کہ جان دیں گے۔ مگر ہتھیار نہ دیں گے۔

اب یہ بے سردار لشکر دریائے زاب کے کنارے پڑا ہوا تھا۔ کہ ایک ایرانی سردار نے کلے آرچوس اور چند اور معزز یونانی سرداران فوج کو دعوت کے بہانہ اپنے خیمہ میں بلایا۔ اور دھوکے ہی دھوکے میں انھیں گرفتار کر لیا۔ اسیر شدہ افسروں میں سے بعض تو فوراً قتل کر ڈالے گئے۔ اور بعض زندہ رکھے گئے۔ تاکہ اردشیر انھیں طرح طرح کی اذیتیں دے کے نہایت ہی بے رحمی سے قتل کرے۔ اب دشمنوں کو یقین کامل تھا۔ کہ افسروں کے پکڑ لیے جانے کے بعد سارے یونانی ہاتھ پاؤں ڈال دینگے اور بہ آسانی گرفتار کر لئے جا سکیں گے۔ مگر وہ شاید یونانیوں کی طینت و شجاعت سے واقف نہ تھے۔ اُن میں زے نوفوں نام ایک دار السلطنت یونان اے تی نیا راتھنز کا رہنے والا تھا۔ جس کا شمار سقراط کے شاگردوں میں تھا۔ وہ جوش میں آ کے اٹھ کھڑا ہوا۔ ہم وطنوں کو ہمت دلائی اور کہا "اگر تمہیں مرنا ہی ہے تو کم سے کم یہ ہو کہ آدمیوں کی طرح مرو۔ ہزار دشواریاں حائل ہوں مگر مایوس ہونے کی کوئی وجہ نہیں۔ اگر دریائے دجلہ کا پاٹ اتنا ہے۔ کہ ہم پار اتر نہیں سکتے تو چڑھاؤ کی طرف سفر شروع کر دو کہیں تو سرا ملیگا؟ یا کہیں تو پایاب ہوگا" اس بہادرانہ مشورہ نے سب کے حوصلے بڑھا دئے۔ اور سارے یونانی بلا تامل شمال کی طرف چل کھڑے ہوئے۔ اور اُسی وقت سے دس ہزار جانبازوں کی وُہ واپسی شروع ہوئی۔ جو یونانیوں کی تاریخ میں مشہور ہے۔ اور ساری دنیا میں اولوالعزمی کا ایک حیرت انگیز نمونہ تصور کی جاتی ہے۔ اور در حقیقت یونانیوں کی یہ واپسی غیر متزلزل حوصلہ مندی۔ تحمل و بردباری اور باضابطگی

کی ایک عجیب و غریب یادگار ہے۔ اس وقت یونانیوں کو ہر طرف ایسی دقتیں اور مایوسیاں نظر آرہی تھیں۔ کہ اگر دنیا کا کوئی اور لشکر ہوتا۔ تو یقیناً ہمت ہار دیتا۔ اور اپنے آپ کو بے بس دیکھ کے ہتھیار رکھ دیتا۔ یا بدحواسی و اضطراب کے بھنور میں پڑ کے منتشر اور تباہ و برباد ہو جاتا۔ مگر یونانیوں نے کسی دشواری کا خیال بھی نہ کیا۔ اور خدا پر بھروسہ کر کے چل کھڑے ہوئے۔

انھیں شمال کی طرف جاتے دیکھ کے دشمنوں نے تعاقب کیا۔ چنانچہ حریف کے سوار ہمیشہ اُن کے پیچھے لگے رہتے۔ اور دریا کے کنارے ہی کنارے دُور تک اُن کا پیچھا کرتے چلے آئے۔ مگر یونانی بھی برابر ہوشیاری کے ساتھ اُن سے لڑتے بھڑتے اور اپنے آپ کو بچاتے ہوئے چلے جاتے تھے۔ یہاں تک کہ تعاقب کرنے والوں نے ہمت ہار دی۔ پچھتاتے ہوئے واپس گئے۔ اور یونانی اُن سے پیچھا چھڑاتے ہی آرمینیہ کے کوہستان میں گھسے۔ یہاں وہ سردی اور بھوک کی ناقابل برداشت مصیبتوں میں مبتلا تھے۔ جنگل اور میدان میں چھ چھ فٹ گہری برف جمی ہوئی تھی۔ مگر وہ صبر و شکر کے ساتھ ان سب مصیبتوں کو جھیلتے سخت سے سخت دشواریوں کا مقابلہ کرتے اور اولوالعزمی کے راستہ میں قدم مارتے چلے جاتے تھے۔ اس راستہ میں پالے اور برف کے صدموں سے بہتوں کے انگوٹھے اور انگلیاں گھل گھل کے غائب ہو گئیں۔ برف کی براق سفیدی اس طرح آنکھوں میں پیوست ہوئی جاتی تھی۔ کہ اکثر لوگوں کی بینائی کو نقصان پہنچ گیا۔ ان قدرتی دشمنوں کے علاوہ ابھی تک انسانی دشمنوں سے بھی پیچھا نہیں چھٹا تھا۔ کیونکہ اب اس سرزمین کے رہنے والوں نے بھی اُن پر یورش کیا۔ اور جمع ہو ہو کے اُن پر یورشیں کرنے لگے۔ لیکن یونانیوں کو اسی طرح وطن کی دھن لگی تھی۔ سردی سے کانپتے تھرتھراتے تھے۔ دشمنوں سے لڑتے بھڑتے اور کٹتے مرتے تھے۔ اور وطن کی یاد میں برابر آگے قدم بڑھائے چلے جاتے تھے۔

سب سے بڑی دشواری یہ تھی۔ کہ ساتھ نہ کوئی رہبر تھا۔ نہ رستہ بتانے والا نہ کسی قسم کا کھانے پینے کا انتظام تھا۔ اور نہ رہنے سہنے کا درتب پاس ہونے کا بندوبست یہ سب مصیبتیں تھیں۔ مگر وہ ہمت والے برابر سعی کی راہ میں

قدم بڑھاتے قسمت سے لڑتے اور ہر قسم کی مزاحمت کو ذلیل و ہیچ تصور کرتے چلے جاتے تھے۔ یہ سب آفتیں جھیلنے اور بیسیوں بار مرمر کے جینے کے بعد ایک دن وہ تھکے چور تمام ایک پہاڑ پر چڑھ رہے تھے۔ کہ ناگہاں "زے نوفوں" جو سب کا سرغنا اور پیش رو تھا اس کی گاڑی جو سب کے آگے تھی چلتے چلتے رُک گئی۔ اور اس نے زور و شور سے نعرۂ مسرت بلند کیا کہ "سمندر! سمندر!" سمندر یونانیوں کا وطنی دوست اور بچپن کا رفیق تھا۔ جس کی موجوں سے وہ بچپن میں کھیلا کرتے تھے۔ اور جس کے ذریعہ سے وہ آسانی کے ساتھ جزیرۂ روم کے تمام سواحل پر پہنچ جایا کرتے تھے۔ اس لئے زے نوفوں نے جو اس وطنی رفیق وانیس کی صورت دیکھی، جوش مسرت کو ضبط نہ کر سکا۔ اس کے بعد اور سب نے سمندر کی خوشنما لہریں اور اس کی موجوں کی باہمی شوخیاں دیکھیں۔ اور مارے خوشی کے اچھل اچھل پڑے۔ اب اُن کی مسرت و شادمانی کی کوئی حد نہ تھی۔ جوش و خروش سے مسرت کے نعرے بلند کرتے۔ ایک دوسرے سے لپٹ لپٹ کے روتے۔ اور خوشی کے آنسو بہاتے تھے۔ جب مسرت کی بیخودیاں ذرا کم ہوئیں۔ تو بہت کچھ دیر تک کنارے بیٹھ کے سمندر کا تماشہ دیکھتے رہے۔ پھر سبھوں نے اِدھر اُدھر سے پتھر لا لا کے ایک جگہ ڈھیر کئے۔ اُن سے ایک بڑا بھاری تودہ یا ٹیلہ بنایا۔ اور اس تودے کو ایک قومی دیوتا قرار دے کے ہر ایک شخص کے پاس جو سب سے اچھی اور قیمتی چیز تھی۔ اُس پر لا کے چڑھا دی۔ پھر اُس تودے کو اپنی خوشی کی یادگار بنا کے وہاں چھوڑا۔ اور سفر کا سامان کرنے لگے۔ یہ بحر "یوکزین" (غالباً بحر اسود) تھا۔ اور اُس سمندر سے ملا ہوا تھا۔ جس کی لہریں یونانی خلیج کی لہروں سے ہم آغوش ہوتی اور سواحل یونان کو جا کے ٹکورے دیتی تھیں۔ غرض اسی سمندر کے سہارے پر انھوں نے آگے کا سفر شروع کیا۔ اب اُن کی مصیبتوں کا خاتمہ ہو چکا تھا۔ اور زے نوفوں اپنے باقی ماندہ ہمراہیوں کے ساتھ جن کی تعداد ۸۶۰۰ آدمیوں کی تھی۔ جن میں بہتوں کی انگلیاں غائب ہو گئی تھیں۔ بہتوں کی آنکھیں سفید ہو گئی تھیں۔ یونان کے قدیم شہر بزن شیم (قسطنطنیہ) میں پہونچا۔ مگر خدا جانے کتنی منزلیں مار کے اور کتنے دشمنوں

کے علاقہ میں سے گذر کے یہاں تک آنا نصیب ہوا تھا۔

یہ سفر تو ختم ہو گیا تھا۔ مگر یونانیوں کو مدتوں یاد رہا۔ بوڑھے بچوں کے سامنے اس کا تذکرہ کرتے۔ اُس کے قصے بیان کرتے۔ عورتیں بچوں کو اُن کے کارناموں کی کہانیاں سُناتیں۔ ہمیشہ اس سفر کے واقعات سے یونانی اپنی قومی الوالعزمی کا ثبوت دیتے تھے۔ کہ کس استقلال سے انھوں نے بہادری کے ساتھ اپنی جان بچائی کیسی مشکل ترین ہفتخوان کو سر کر کے۔ اور کس طرح گویا سات سمندر پیر کے وہ اپنے گھروں میں آئے۔ زے نوفون نے اپنے اس سفر کا ایک سفرنامہ لکھا۔ اور اُس کے علاوہ اور بھی کئی تاریخیں تصنیف کیں۔ جو آجتک موجود ہیں۔ اور وہ اُس عہد کا سب سے اعلےٰ مورخ تصور کیا جاتا ہے۔

اگرچہ اس سفر سے یونانیوں کو بہ ظاہر سوا نقصان اور حد سے گذری ہوئی مصیبتوں میں مبتلا ہونے کے کوئی فائدہ نہیں ہوا تھا۔ مگر حقیقت یہ ہے۔ کہ اُس نے یونانیوں میں عجیب اُلوالعزمی پیدا کر دی تھی۔ اور یہ حالت ہو گئی تھی۔ کہ کوئی مشکل اُن کے ارادوں کی سدِ راہ نہ ہو سکتی تھی۔ چنانچہ ۷۵ برس بعد اُسی اُلوالعزمی کا ظہور سکندر اعظم کی فتحیابیوں سے ہوا۔ جس کے ہمراہیوں کو جلا وطنی میں گویا لطف آتا تھا۔ اور جتنی دور اُن سے کہا جاتا۔ اور جیسے ذخار دریاؤں کے پار لے جایا جاتا۔ وہ بے تکلف چلے جاتے۔ یہاں تک کہ وہ یونان سے چلا۔ تو اُس قدیم زمانہ میں جبکہ نہ سڑکیں تھیں۔ نہ راستے معلوم تھے۔ ایک ملک دوسرے سے ناواقف تھا وہ لڑتا بھڑتا اور فتح و نصرت کے پھریرے اُڑاتا ہوا دریائے سندھ کے پار اُتر آیا۔ اور وہاں تک آگیا جہاں اُن دنوں کسی کا وہم و گمان بھی نہ پہونچ سکتا تھا۔ سچ یہ ہے کہ سکندر کی ساری اُلوالعزمیاں اور کل حملہ آوریاں اس ایک بھگدر کی یادگار تھیں۔ جس کا ہم ذکر کر چکے ہیں۔ سچ کہا ہے۔ ہمارے اخلاقی شاعر نے کہ ؎

ہمت بلند دار کہ پیش خدا و خلق      باشد بقدر ہمت تو اعتبار تو

## ایثار نفس

اکثر نوجوانوں کے دل میں جمی ہوئی ہے۔ کہ ہم نے انگریزی پڑھ لی۔ اخبارات کا مطالعہ کیا کرتے ہیں۔ اہل مغرب کی وضع قطع اختیار کر لی ہے۔ اور خوب ترقی کر گئے ہیں لہذا اب ہمیں ریفارمیشن اور اصلاح قوم کے کاموں میں لگ جانا چاہیے۔ لیکن عزیزو! ترقی اس کا نام نہیں جسے تم سمجھے ہوئے ہو۔ ترقی بالکل دوسری چیز ہے جس کی تمہیں ابھی ہوا بھی نہیں لگی۔ ترقی کا اصلی خمیرہ انگریزی دانی ہے۔ نہ ترقی یافتہ قوموں کی صورت بنانا۔ بلکہ اس کا اصلی خمیر محبت انس اور باہمی ہمدردی ہے۔ ان مذکورہ صفتوں کا پیدا ہونا بھی کسی قسم کی ترقی کا ابتدائی اور معمولی درجہ ہوتا ہے۔ کیونکہ محبت اور انس اور باہمی ہمدردی تو انسانیت کے ضروری لوازم میں سے ہیں۔ انسانوں کے جس گروہ میں یہ صفتیں نہ ہوں۔ اس کا شمار فی الحقیقت انسانوں میں نہیں بہائم میں ہونا چاہیے۔ لہذا ان صفات کے ایک معمولی درجہ تک پیدا ہو جانے پر بھی کسی قوم کو پوری طرح ترقی یافتہ قوم نہیں کہہ سکتے۔

سچی ترقی یافتہ قوم وہ ہے جسمیں مذکورہ صفات یعنی باہمی انس و محبت اور ہمدردی و اتفاق کا جوش وجذبہ اعتدال کی حد سے تجاوز کر کے اس درجہ کو پہونچ جائے۔ جسے ایثار نفس کہتے ہیں۔ یعنی قوم اور وطن کی فلاح کے سامنے اپنی جان و مال کا خیال نہ رہے۔ بلکہ لوگ قومی مفاد پر شخصی فوائد و منافع کے قربان کرنے کو تیار ہو جایا کریں۔ دنیا میں کسی قوم نے ترقی نہیں کی ہے۔ جب تک اسمیں ہمدردی و ایثار نفس کا جوش نہیں پیدا ہوا ہے۔

ہر قوم کے لوگ جب اپنے قومی دشمنوں کے مقابلہ میں صف آرا ہوتے اور قومی اغراض پر کٹنے مرنے کو تیار ہوتے ہیں۔ اس وقت ہر ہر سپاہی کے چہرے پر ایثار نفس کا نور چمکتا نظر آتا ہے۔ کیونکہ وہ قوم و ملک کے مقاصد پر جان دینے کو تیار ہوتا ہے۔ لیکن یہ بھی بہت معمولی درجہ کا ایثار نفس ہے۔ حقیقی ایثار نفس کے نمونہ دنیا میں کم نظر آتے ہیں۔ اور نظر بھی آتے ہیں تو خاص ہی خاص لوگوں میں۔ اس قسم کے نمونہ ہم رومتہ الکبریٰ یعنی رومیوں کی تاریخ سے نکال کے تمہارے سامنے پیش کرتے ہیں۔ جن کے دیکھنے سے تم کو نظر آئے گا۔ کہ رومیوں نے اپنے گذشتہ عروج و اقبال کو کیسی قیمتی جانیں بیچ کے یا ایک ایثار نفس کر کے حاصل کیا تھا۔

ان میں سے پہلا واقعہ "ہوراطیوس قوقلیس" (ہوراشیس کاکلیز) کا ہے۔ جو عہد قدیم کا ایک معمولی رومی سپاہی تھا۔ اور شہر رومۃ الکبریٰ کے ایک پھاٹک کے پہرے پر مامور تھا۔ اس واقعہ کی حقیقت یہ ہے کہ رومیوں پر پہلے کبھی "طارکون" خاندان کی حکومت تھی۔ جو اپنے مظالم اور اپنی بیہودگیوں کی باعث تخت و تاج سے محروم ہوگیا تھا۔ آخر کار علاقہ "اطروسقہ" (اٹرسکا) کے ایک فرماں روا "لارس پورسنا" نے "طارکون" خاندان کی طرفداری کا بیڑا اُٹھایا۔ اور روم پر چڑھائی کر دی۔ رومۃ الکبریٰ میں کسی کو خبر بھی نہ ہونے پائی۔ اور وہ ناگہاں شہر کے باب "جانی قولوم" پر آپہنچا۔ جو دریائے طیبر کے کنارے واقع تھا۔ پھاٹک کے باہر دریا پر ایک لکڑی کا پل بندھا ہوا تھا۔ اگر "پورسنا" اُس پل سے گزر آتا تو پھر شہر اُس کا تھا۔ کیونکہ اس ناگہانی حریف سے مقابلہ کی کسی کو بھی جرأت نہ ہوئی۔ بلکہ ابھی سے یہ حالت ہوگئی کہ بیرون شہر کے رومی شہر میں پناہ لینے کے لئے بھاگے چلے آتے تھے۔ ہوراطیوس نے جو اس لب دریا پھاٹک پر پہرہ دے رہا تھا۔ بھاگنے والے رومیوں کو روک کے کہا "اب شہر کے بچنے کی بس ایک ہی تدبیر ہے۔ اور وہ یہ کہ کسی طرح یہ پل توڑ دیا جائے۔" اس کے بعد اس نے لوگوں سے کہا "میں پل کے اُس پار جا کے دشمنوں سے مقابلہ کرتا اور انھیں وہیں روکتا ہوں۔ تم سب پل کو توڑنا شروع کرو۔" ہوراطیوس نے یہ تجویز ایسے پُراثر جوش جاں بازی سے پیش کی تھی کہ بھاگنے والوں میں سے دو اور بھی اُس کا ساتھ دینے پر راضی ہوگئے اور یہ تینوں بہادر "سورما پورسنا" کے لشکر کے سامنے جا کے ڈٹ گئے۔ ادھر باقی ماندہ لوگ بھاگنے سے قدم روک کے پل کے توڑنے میں مصروف ہوگئے۔ اب ایک طرف ہوراطیوس اپنے تینوں رفیقوں کے ساتھ دشمنوں پر وار کر رہا تھا۔ ادھر رومیوں کا ایک زبردست گروہ پل پر چوٹیں لگا رہا تھا۔ یہاں تک کہ پل بالکل قریب بانہدام ہوگیا۔ اور سبھوں نے اُن بہادروں سے کہا "پل گرنے ہی کو ہے۔ اور ابھی موقع ہے کہ تم بھی نکل آؤ۔" یہ صدا سُن کے ہوراطیوس کے دونوں رفیق پلٹے۔ اور ہوراطیوس پکارا کہ "وہ دونوں بھی نکل جائیں۔ تو میں اپنی جگہ سے ٹلوں۔" اب وہ دونوں شخص بھی صحیح و سالم اس پار نکل آئے۔ اور ہوراطیوس واپس آنے ہی کو تھا کہ پل اُڑ اُڑا دھڑ دھم کر کے دریا میں گرا۔ اور وہ اکیلا حامی وطن ہوراطیوس زندگی سے

مایوس تھا۔ سامنے دریائے ذخار لہریں مار رہا تھا۔ اور پیچھے دشمنوں کا زبردست لشکر تھا۔ اس کیفیت نے ہوراطیوس ہی پر ایک خوفناک سناٹا نہیں طاری کر دیا۔ بلکہ دونوں طرف کے دیکھنے والے بھی خاموشی سے اُس کی مایوسی کو دیکھ رہے تھے۔ رومیوں میں اپنے حامی وطن کی بیکسی پر انتشار و اضطراب تھا۔ اور دشمن بھی اس تماشہ میں محو ہو کے گویا لڑنا اور شمشیر زنی کرنا بھول گئے تھے۔ ہوراطیوس کا قسمت نے اگرچہ بڑا سخت امتحان لیا تھا۔ مگر وہ ابھی تک ہمت نہیں ہارا تھا۔ اُس نے نہایت پامردی و استقلال سے دریائے طبیر کی طرف دونوں ہاتھ پھیلائے۔ اور چلا کے کہا "یا والطبیر! میں ایک نبردی سپاہی ہوں۔ مجھے اپنی لہروں کے آغوش میں لے!" اور دریا میں پھاند پڑا۔ غوطہ کھا کے اُبھرا تو دونوں کناروں سے اُس پر عجیب قسم کی نظریں پڑ رہی تھیں۔ ایک طرف استقبال کا جوش تھا۔ اور دوسری طرف حیرت و تعجب۔ اگرچہ فولادی لباس پہنے اور وزنی اسلحہ لگائے ہوئے تھا۔ مگر ڈوبتا تیرتا بہتا اور ہاتھ پاؤں مارتا پار جا پہنچا۔ اور ہم وطنوں نے بڑے ہی جوش وخروش سے نعرۂ مسرت بلند کیا۔

دوسرا واقعہ ایک اور رومی نوجوان کا ہے۔ جس کا نام "قیوس میوطیوس" (کائی یس میوٹی اس) تھا۔ گذشتہ واقعہ میں پل توڑ دیے جانے کے بعد جب پورسنا کا اور کوئی زور نہ چلا۔ تو اُس نے رومتہ الکبریٰ کا محاصرہ کر لیا۔ اُس وقت اُس نوجوان قیوس نے دل میں ٹھان لی۔ کہ جس طرح بنے گھس بیٹھ کے پورسنا کو مار ڈالے اور اپنے وطن کو اُس کے آزار سے بچا دے۔ یہ منصوبہ ٹھہرا کے وہ دشمن کے لشکر میں گیا۔ خاص پورسنا کے خیمہ میں بھی کسی بہانہ سے داخل ہوا۔ مگر چونکہ اُسے پہچانتا نہ تھا۔ غلطی سے اس کے عوض اُس کے ایک خادم کے سینہ میں خنجر بھونک دیا۔ جس نے تڑپ کے جان دیدی۔ "قیوس" کو لوگوں نے گھبر کے پکڑا۔ چھری چھینی۔ اور اس قتل کا پوچھا تو کہا "کیا کہوں غلطی ہو گئی۔ میں تو خود پورسنا کے قتل کو آیا تھا"۔ پورسنا نے یہ خیال کر کے کہ اس سے دشمنوں کے ارادے اور منصوبے معلوم ہو جائیں گے۔ کہ طرح طرح کی سخت اذیتیں دے کے اُس سے شہر والوں کے حالات پوچھے جائیں۔ اتفاقاً سامنے ایک بتوں کی قربان گاہ تھی۔ جس پہ

آگ روشن ہو رہی تھی۔ اور شعلے نکل رہے تھے۔ قیبوس نے بلا تامل بیباکی سے اپنا ہاتھ آگ میں ڈال دیا۔ اور ہاتھ کو اس کے اندر ڈالے ڈالے بغیر اس کے کہ چہرے سے ذرا بھی تکلیف و درد کے آثار ظاہر ہوں۔ فخر و تمکنت کے ساتھ بادشاہ پورسنا کی طرف دیکھا۔ گویا زبان حال سے کہہ رہا تھا۔ کہ "دیکھو جو لوگ سچی عظمت و وقار کی خواہش رکھتے ہیں۔ اُن کے نزدیک اس جسم کی کیا وقعت ہے۔" پورسنا پر اس نوجوان رومی کے اس حرکت کا کچھ ایسا اثر پڑا۔ کہ فوراً اُسے چھوڑ دیا۔ اور کہا "تم آزاد ہو اپنے لشکر میں جاؤ اب کوئی مزاحم نہ ہوگا۔" یہ سُن کے بہادر قیبوس بولا۔ "اب تم نے میرے ساتھ ایسا سلوک کیا ہے۔ تو لو جو سچی خبر ہے مجھ سے سُن لو۔ ہم سو نوجوان ہیں۔ جنھوں نے ایک ساتھ اور ایک ہی حالت میں اس بات پر حلف اٹھائی ہے۔ کہ جس طرح بنے گا پورسنا کو زندہ نہ چھوڑینگے۔" یہ کہہ کے قیبوس نو رومتہ الکبریٰ کی چاردیواری میں واپس آیا۔ اور پورسنا کے دل پر رومیوں کی اس قدر ہیبت چھا گئی تھی۔ کہ محاصرہ چھوڑ کے واپس چلا گیا۔ قیبوس کی رومیوں میں بڑی قدر و منزلت ہوئی۔ اور چونکہ اُس کا بایاں ہاتھ جل کے قومی و وطنی خدمت کی نذر ہو گیا تھا۔ اس لئے رومی پبلک نے اسے اس کے دوناآرذوالیسا (یعنی بائیں ہاتھ والا) خطاب دیا۔

تیسرا واقعہ ان دونوں سے بھی بڑھا ہوا ہے۔ ان دونو واقعات میں تو نوجوانی و نوعمری کا جوش پایا جاتا ہے۔ مگر اس تیسرے میں بڑھاپے کی پختہ مغزی جلوہ نما ہے۔ اس کی اصلیت یہ ہے۔ کہ جب رومیوں نے بحری قوت میں اپنے آپ کو اہل قرطاجنہ کے مقابل کمزور دیکھ کے جہازوں کا ایک نیا بیڑا بنوایا اور رومیوں کا ایک زبردست افسر مارکوس اٹوبیوس رے غولس "ریارکس اٹی لیس گولس" اس بیڑے کو لے کے قرطاجنہ کے افریقی سواحل پر اُترا تو رے غولوس نے وہاں پہونچ کے دشمنوں کو کئی شکستیں دیں۔ اتنے میں اُس کی مدت ملازمت ختم ہو گئی۔ اور اُس نے رومی مجلس حکمرانی کے سامنے درخواست بھیج کے التجا کی۔ کہ "اب میں ملکی خدمت سے سبکدوش کیا جاؤں۔ تاکہ وطن میں آ کے اپنی کھیتی کو دیکھوں بھالوں۔ میرا غلام آلات کشاورزی لے کے بھاگ گیا ہے

ور گیا۔ اور چند روز یہی حالت رہی۔ ویسی ہی غفلت رہی۔ تو میرے بی بی بچہ فاقوں مر جائینگے۔" مجلس نے اس درخواست کو قبول نہ کیا۔ اُس کی ملازمت میں توسیع کی اور لکھا کہ "تمہارے اہل و عیال کا بار سلطنت پر ہے۔ تم اس کی فکر نہ کرو۔" اتفاقاً ان دنوں یونان کے پہلوانوں کے نانی شہر اسپارٹا کا ایک شخص قرطاجنہ والوں کی ملازمت میں آگیا تھا۔ اُس نے ایسی بہادری اور دانائی سے مقابلہ کیا۔ کہ رومیوں کو شکست ہوئی۔ اور رے غولوس اہل قرطاجنہ کے ہاتھ میں اسیر ہو گیا اب وہ اسپارٹا کا بہادر قرطاجنہ والوں کی بد سلوکی سے ناراض ہو کے چلا گیا۔ کہا جاتا ہے۔ کہ واپسی کے وقت جہاز پر مار ڈالا گیا۔ اور قرطاجنہ والوں کو ضرورت ہوئی۔ کہ رومیوں سے صلح کر لیں رے غولوس ایک زمانہ سے اُن کے ہاتھ میں اسیر تھا ہی اُسے اپنے مفید مطلب چند شرائط دے کے رومتہ الکبریٰ روانہ کیا کہ ان شرطوں پر صلح کرا دو۔ اور قسم لے لی۔ کہ اگر یہ شرطیں نہ منظور ہوئیں تو بلا تامل و تعویق ہمارے پاس چلے آؤ گے۔

رے غولوس دار السلطنت روما کی دیواروں کے نیچے پہونچا۔ اگرچہ رومیوں نے اُس کے استقبال میں بڑی گرمجوشی دکھانے کا ارادہ کیا تھا۔ مگر اُس نے شہر کے اندر داخل ہونے سے قطعی انکار کیا۔ اور کہا "نہ میں سابق کی طرح مجلس حکمرانی کا رکن ہوں۔ نہ کانسل (مجسٹریٹ) کے رتبہ کا شخص۔ میں دراصل اہل قرطاجنہ کا غلام ہوں۔ لہذا شہر میں نہ داخل ہونگا۔" آخر مجلس حکومت نے اُس کا بیان سننے کیلئے بیرون شہر ہی میں اجلاس کیا۔ اور اُس کے سامنے "رے غلوس" نے جو تقریر کی وہ اُس کے ذاتی مقاصد کے بالکل ہی خلاف تھی۔ اُس نے کہا "آپ لوگوں کو لڑائی پر استقلال سے قائم رہنا چاہیئے۔ قرطاجنہ والوں میں یہ کمزوریاں ہیں۔ اور اب انہیں آپ سے مقابلہ کرنے کا دم نہیں ہے۔ اپنے قومی مقاصد و منافع کے سامنے آپ میرے بچانے کا ذرا بھی لحاظ نہ کیجئے۔ کیونکہ مجھ سا ایک بوڑھا اور از کار رفتہ شخص جو آئندہ آپ کے کام نہیں آ سکتا۔ اگر بچا بھی تو کیا! رہا اسیروں کا مبادلہ اس کا بھی آپ خیال نہ کریں۔ کیونکہ اس میں آپ ہی ہر طرح گھاٹے میں رہیں گے آپ کا اکیلا ایک اسیر اُن کے ہاتھ میں ہوں۔ اور اُس کے مقابل اُن کے کم از کم تیرہ سپہ سالار آپ

کے ہاتھ میں گرفتار ہیں۔"

روم کی مجلس حکومت صلح پر آمادہ تھی۔ مگر صرف رے غولوس کے اصرار سے اُسے اپنی مرضی کے خلاف سلسلۂ جنگ کے قائم رکھنے اور صلح سے انکار کرنے پر مجبور ہونا پڑا۔ آخر اِن لوگوں نے رے غولوس کو صلاح دی۔ کہ "تم حلف کا خیال نہ کرو۔ اور گھر میں جاکے اپنے بیوی بچوں میں ٹھہرو۔ خود ہی جاکے زنجیریں پہن لینا اور موت کے مُنھ میں چلا جانا کون سی عقلمندی ہے؟" مگر اُس دیانت دار اور متین و مستقل سردار نے اس مشورے کے سُننے سے قطعاً انکار کیا۔ پیاری بی بی آنکھوں سے آنسوؤں کا سیلاب بہاتی ہوئی آئی اور لپٹ کے کہا۔ "اپنے اوپر ترس نہیں کھاتے۔ تو للہ ہمارے حال پر ترس کھاؤ۔" بچے روتے ہوئے آئے اور باپ کے قدموں سے لپٹ گئے۔ کہ "ہماری یتیمی و بیکسی کا خیال کیجئے۔" مگر رے غولوس نے ایک نہ سُنی۔ اور ثابت کر دیا کہ اُسے اپنے قول کو پورا کرنا اور اپنے وطن کی حمایت کرنا خود اپنی جان اپنی تمام خواہشوں اور اپنے بی بی بچوں سب سے زیادہ عزیز تھا۔ چنانچہ بغیر اس کے کہ شہر کے اندر قدم بھی رکھا ہو وہ اُلٹے پاؤں دشمنوں کے پاس واپس چلا گیا قرطاجنہ والوں میں اس کی قابلیت نہ تھی۔ کہ ایسی شریف النفسی اور راست بازی کی قدر کرتے۔ اُس کی صورت دیکھتے ہی سمجھ گئے کہ ناکامی کی خبر لایا ہے۔ جھنجھلا اٹھے اور بے کچھ پوچھے گچھے شریف النفس رے غولوس کو طرح طرح کی سخت اذیتیں اور تکلیفیں دے کے مار ڈالا۔ مگر اُس کی ناموری و عظمت اور اُس کی عزت و حرمت ابدی چیزیں ہیں جو کبھی نہ مریں گی اور رہتی دنیا تک برقرار رہینگی۔ اس کے بعد قرطاجنہ والوں کو دبکے اور ایسی شرطوں پر جو رومیوں کے مقاصد کے زیادہ موافق تھیں صلح کرنا پڑی۔ دراصل یہی صلح اور رے غولوس کی یہی کارروائی تھی جس نے آخر کار قرطاجنہ کو ایسا تباہ و برباد کیا۔ کہ اُس کا نام و نشان بھی دنیا سے مٹ گیا۔

یہ ہیں ایثار نفس کے سچے نمونے۔ اور یہ واقعات ہیں۔ جو قوم کو قوم بنایا کرتے ہیں۔ ہندوستان کی تاریخ ایثار نفس کے معمولی واقعات سے بھی خالی ہے فی الحال ہم کو یورپ سے فدائے قوم بننے کے سبق ملے ہیں۔ مگر فدائے قوم بننا اُس

وقت ہو سکتا ہے جب ساکنان ہند کی ایک قوم بن لے۔ جب قوم ہی نہیں تو کوئی فدا کس پر ہوگا؟ پہلے ضرورت ہے۔ کہ ہندو مسلمان خود اپنے فریق والوں اور نیز ایک دوسرے کے لئے ایثار نفس کے ایسے نمونہ دکھائیں۔ اُس کے بعد ترقی کا نام لیں اور آگے قدم بڑھائیں۔ یہاں لوگ میونسپل کمشنری۔ ذلیل ملازمت اور ادنٰے ادنٰے منافع کیلئے ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہو جاتے ہیں۔ اور پارٹی فیلنگ کی آفت میں مبتلا ہیں۔ حالانکہ ہر ترقی یافتہ قوم میں پارٹی فیلنگ کا جذبہ قوم بننے اور اتحاد قومی کے روابط مضبوط ہو جانے کے بعد پیدا ہوتا ہے اور اکثر وہی بڑھ کے زوال قومی کا باعث ہو جایا کرتا ہے۔

اُس گروہ کو ترقی کا نام لیتے وقت شرمانا چاہیئے جس میں اتحاد قومی سے پہلے ہی پارٹی فیلنگ کا جوش پیدا ہو گیا ہو۔

## وطن اور ابنائے وطن*

خاک وطن سے ہمارا خمیر ہے۔ اُس کے بطن سے ہم پیدا ہوتے۔ اور اُس اُس کے آغوش میں پلتے ہیں۔ اسی وجہ سے لوگوں نے سرزمین کو ایک جوان عورت سے تعبیر کیا ہے۔ اور اُس میں پیدا ہونے والوں کو ابنائے وطن کہتے ہیں زمین کو ماں کہنا کوئی آجکل کا نیا خیال نہیں ہے۔ قدیم الایام سے لوگ دُنیا کو مادر گیتی کہتے آئے ہیں۔ غور سے دیکھو تو یہ خیال بیجا بھی نہیں۔ جو مزہ ہمیں آغوش مادر آیا ہوگا قریب قریب وہی سواد وطن میں آتا ہے کیسے ہی تھکے ماندے اور خستہ و خراب ہوں۔ آغوش وطن میں آکے بیٹھے۔ اور ساری ماندگی دُور ہو گئی۔ کیسے ہی حیران و پریشان اور ملول حزیں ہوں۔ مادر وطن کے سینے سے لپٹے اور دل کو تسلی و تسکین ہو گئی۔ غریب الوطنی کی تکلیفیں اور مصیبتیں مشہور ہیں۔ اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے اپنے وطن کے سوا دوسری زمینیں ہماری دشمن اور خون کی پیاسی ہیں۔ بیشک وُہ بھی ہماری مائیں ہیں۔ مگر سوتیلی مائیں جن کو ہمارا ایسا درد دکھ نہیں ہو سکتا جیسا کہ خاص اپنی ماں کو ہوتا ہے۔ اور اسی لئے ہمیں بھی جو اُنس اور جیسی محبت اپنے وطن سے ہے۔ کسی دوسرے ملک سے نہیں۔ دوسرے مقامات کے لوگ غریب الوطنی میں ہمارے ساتھ چاہے

* جولائی سنہ ۱۹۱۱ء

کیسا ہی اچھا سلوک کریں۔ کیسے ہی اخلاق سے پیش آئیں۔ کیسی ہی خاطر و مدارات کریں۔ اور اُن سے چاہے کیسی ہی محبت ظاہر ہو مگر وہ محبت بھی عزیزوں کی سی محبت ہوتی ہے۔ اُس میں شفقت مادری کا مزہ نہیں۔

کشش زمین کا مسئلہ طے ہو گیا۔ اور اب کسی کو اُس سے انکار نہیں مگر کشش زمین کے اس پہلو کا شاید کسی نے خیال نہ کیا ہو گا۔ کہ یہ کشش دراصل اس محبت مادری کی کشش ہے۔ جو ماں کو اپنے بیٹوں کے ساتھ ہوا کرتی ہے ہم اگر زبردستیاں کر کے یا کسی قسری قوت کو کام میں لا کے اُس سے الگ ہونا چاہتے ہیں۔ تو یہ زمین کس جوش کے ساتھ ہمیں اپنی طرف کھینچ لیتی ہے۔ اور دور نکل جاتے ہیں۔ اتنی ہی زبردستیوں سے اور ایسے جوش کے ساتھ کھینچتی ہے۔ کہ اُسکی محبت میں سزا کا مزا آ جاتا ہے۔ اسکی کشش محبت اسقدر بڑھی ہوئی ہے کہ ہم کسی طرح اسکی حکومت سے باہر نکل ہی نہیں سکتے۔ ہزار غبارے بنائیں۔ لاکھ ہوائی جہاز سے کام لیں۔ مگر اتنی مجال نہیں۔ کہ اس کی گرفت سے باہر ہو سکیں۔ یا اُس کے آغوش کے سوا اور کسی جگہ ہمیں قرار آ سکے۔

اس کشش محبت میں ہمارا اصلی وطن اور دیگر ممالک۔ وطن یعنی ہماری حقیقی اور سوتیلی مائیں سب برابر ہیں۔ اُن دوسری ماؤں کو یوں ہم سے لاکھ عداوت و عناد ہو۔ مگر اُس کی روادار ہرگز نہیں ہیں۔ کہ اُن کی سوت کا بچہ کسی غیر کے آغوش میں چلا جائے۔ دراصل یہ اس کشش مادری ہی کی برکت ہے۔ کہ ہماری دُنیا کی کمائی کا کوئی حصہ بھی اُس سے نہیں چھن سکتا۔

گو غیروں کے مقابل میں ہماری سب مائیں برابر ہیں۔ مگر پھر بھی اپنی ماں اپنی ہی ہے جب کبھی ہم سواد وطن سے باہر قدم نکالتے۔ اور سفر اختیار کر کے اپنے وطن سے اور کسی اور سرزمین میں چلے جاتے ہیں۔ تو آغوش وطن ہمیں ہمیشہ اپنی طرف کھینچتا ہی رہتا ہے۔ اور ہر گھڑی یہی تمنا ہمارے دلوں میں جوش مارا کرتی ہے۔ کہ کوئی ایسی تدبیر ہوتی کہ اُڑ کے اپنے گھر چلے جاتے۔ اور یاران وطن سے جا ملتے۔ جن کی پیاری صورتیں ہمیشہ آنکھوں کے سامنے پھرا کرتی ہیں۔ یہی وطنی رشتہ قومیں بناتا ہے۔ جس کا جوش تمام دوسرے جذبات پر غالب آ جاتا ہے۔

وطن کی تو محبت ہمیں نسل اور مذہب تک کو بھلا دیتی ہے۔ اور اپنی اس ماں کے لئے ہم سب کو چھوڑ دیتے ہیں۔

مگر تعجب یہ ہے۔ کہ جیسی محبت ہمیں اپنی اس ماں یعنی وطن کے ساتھ ہے۔ ویسی مادر وطن کو ہمارے ساتھ نہیں نظر آتی۔ سفر اور غریب الوطنی میں اگرچہ ایسی ایسی دشواریوں اور مصیبتوں سے سابقہ پڑتا ہے۔ کہ ہم لوگوں میں عام کہاوت ہو گئی ہے۔ کہ سفر سقر کے مثل ہے۔ لیکن اے مادر وطن تیری سرد مہریاں اس قدر بڑھی ہوئی ہیں۔ کہ وہی لوگ جو سفر کو دوزخ کے مثل بتاتے ہیں۔ اکثر اوقات تنگ آ کے کہنے لگتے ہیں "السفر وسیلۃ الظفر" یعنی کامیابی کا نتیجہ سفر ہی ہے۔ بے شک وطن ہماری قدر نہیں کرتا۔ اور اگر ہم میں کوئی اچھی چیز ہوتی بھی ہے۔ تو اس کی قدر دانی جیسی غیر ملکوں میں ہوتی ہے۔ اپنے گھر میں نہیں ہوتی۔

حضرت ابراہیم کو وطن نے آگ میں ڈالا۔ اور غربت نے آسمان کا تارا بنا کے چمکایا۔ حسن یوسف کے ساتھ بھائیوں عزیزوں اور اہل وطن کا تو یہ سلوک تھا کہ کوئیں میں ڈھکیلے اور کھوٹے داموں بیچے گئے۔ اور غربت نے ایسی قدردانی کی۔ کہ سلطنت مصر کے سیاہ و سفید کے مالک تھے۔ حضرت موسیٰ نے اپنے وطن میں ہمیشہ خوف اور دھڑکوں کی زندگی بسر کی۔ اور آخر ماں اور بہن بھائی کو چھوڑ کے ڈرتے ہوئے گھر سے نکلے۔ اور غریب الوطنی نے پیغمبر اُولوالعزم بنا دیا۔ حضرت مسیح کے ساتھ مادر وطن کا جو خوفناک سلوک ہوا دنیا بھر میں مشہور ہے اور برادران وطن ہی تھے۔ جنھوں نے دشمنوں کے ہاتھ میں اسیر کرایا۔ کانٹوں کا تاج پہنایا۔ ہر طرح کی تحقیر و تذلیل کی۔ اور آخر رومی حکام کو مجبور کیا۔ کہ ان کو سولی دیجئے۔ ان کا خون ہم اپنے سر لیتے ہیں۔ اسی طرح حضرت محمد رسول اللہ صلعم کو دیکھو۔ کہ آپ کس مصیبت کے ساتھ جلا وطن کئے گئے۔ اور اہل وطن کی عداوت یہاں تک بڑھی ہوئی تھی۔ کہ غربت میں بھی اطمینان سے نہ بیٹھنے دیتے تھے۔

دنیا کی تمام ماؤں کا معمول ہے۔ کہ اولاد پر جان دیتی ہیں۔ اور ان

پالنے میں اپنی زندگی شاد یا کرتی ہیں۔ لیکن بیٹوں کو ماں کے ساتھ ویسی محبت نہ ہوئی۔ کہ ماں کے لئے اپنا عیش منغص اور مزا کرکرا کر دیں۔ بخلاف اس کے اے مادر وطن تجھ سے اپنی اولاد کے بارے میں وہ الفت و محبت نہیں ظاہر ہوئی جیسی کہ تیری اولاد کو تیرے ساتھ ہے۔ وطن کی بد سلوکیاں تو اسی سے ظاہر ہیں۔ کہ ہمیں بغیر گھر سے قدم نکالے اور غریب الوطنی اختیار کئے فلاح کی کوئی صورت نہیں نظر آتی۔ اس کے مقابل ہماری محبت وطن کو دیکھو۔ کہ کسی طرح اس کی ہر مصیبت و تکلیف اور ہر درد دکھ کو مزہ لے لے کے یاد کرتے ہیں۔

یوسف کہ بمصر بادشاہی میکرد  مے گفت گدا بودن کنعان خوشتر

دنیا کی ساری تاریخ پر اگر غور سے نظر ڈالو تو نظر آئے گا کہ یہ صرف اس بات کی تاریخ ہے۔ کہ اہل وطن نے وطن پر کس طرح جانیں دیں۔ دنیا میں شاید چند ہی لڑائیاں مذہب یا کسی اور غرض کے لئے ہوئی ہونگی۔ ورنہ یہ گذشتہ دنیا کے سارے جھگڑے فساد اور سارا قتل و خون حمایت وطن کے لئے تھا۔

مادر وطن ساری مائیں اپنے بیٹوں کے مرنے پر روئی اور اُن کی لاش پر کھڑی ہو کے بین کرتی ہیں۔ مگر سچ بتا اپنے ہزاروں لاکھوں بچوں کو اپنے اوپر قربان ہوتے دیکھ کے تو بھی کبھی روئی تھی؟ جس طرح سوتیلی ماؤں کے بیٹے آپس میں لڑا کرتے ہیں۔ اُسی طرح مختلف سرزمینوں کی اولاد ہمیشہ باہم لڑتی اور کٹتی مرتی رہی۔ جب کسی ملک کے بیٹوں کا زور ہوا۔ انھوں نے یہی کوشش کی کہ دیگر ممالک پر چڑھ جائیں۔ اور اُن کی اولاد کو قتل کریں۔ اور اگر زندہ بھی چھوڑیں تو ذلیل و عاجز کرکے اور اپنے لونڈی غلام بنا کے

اگلی دنیا پر ایک اجمالی نظر ڈالو۔ ہمیشہ یہی کرشمہ نظر آئیں گے۔ سیریا والے بڑھے ہیں۔ اور ہر طرف خون کی ندیاں بہاتے ساری دنیا کو اپنی غلامی پر مجبور کر رہے ہیں۔ بابل والے اُٹھے ہیں اور اسیریا کو تباہ کرکے ساری دنیا کو اپنا حلقہ بگوش بنا رہے ہیں۔ مصر والوں کا عروج ہوا ہے۔ اور آس پاس کی صدہا

قوموں کو مغلوب و مقہور کر چکے ہیں۔ یہاں تک بڑھتے بڑھتے دو زبردست سلطنتیں بابل اور اہل مصر میں ٹکر ہو گئی۔ اور اتنی بڑی خونریزی ہوئی کہ لاکھوں بندگان خدا قتل ہو گئے۔

اسی طرح صدہا قوموں اور سلطنتوں نے اپنی کامیابی ہمیشہ اسی بات کو سمجھا ہے کہ غیر ملک کی اولاد کو تباہ و برباد کریں اور ایسے زبردست حملہ آوروں کے مقابلہ میں ابنائے وطن نے اپنے وطن کی عزت و آبرو اور اس کی آزادی قائم رکھنے کے لئے جانیں دیدی ہیں۔ اور جہاں تک بس چلا ہے اپنے جیتے جی اس بات کو گوارا نہیں کیا۔ وطن کی رسوائی ہو مگر اے بے درد مادر وطن تو خبر بھی نہ ہوئی کہ تیری اولاد کو تیری محبت میں کیا پیش آئی۔ اور وہ کمزور پاکے کس قدر ستائے اور کس طرح ذلیل کیے گئے۔

کیا یہ تجربات اور تیری سرد مہری کے برتاؤ ہمارے دل سے تیری محبت مٹا دیں گے! ہرگز نہیں تو چاہے ہمارے ساتھ کیسی ہی بیرحمی کرے ہم تیرے ویسے ہی جان نثار رہیں گے۔ تیرے نام پر جبیں رگڑیں گے۔ تیری عظمت بڑھائیں گے۔ تیری تعریف کے گیت گائیں گے۔ اور یہی چاہیں گے کہ تیرا بول بالا رہے۔ اے سرزمین وطن! اور اے مہربان مادر وطن! اگر تو زندگی میں ہم پر مہربان نہیں ہوتی۔ تو مضائقہ نہیں تیری یہ عنایت کیا کم ہے کہ مرنے کے بعد ہمیں اپنے سینہ سے لگا کے لٹا رکھتی ہے۔ اور ایسا تھپک تھپک کے سلاتی ہے کہ قیامت تک کے لئے ہم بڑے مزے کی نیند سو لیتے ہیں۔

کہتے ہیں کہ جیسی محبت دیگر ملک والوں کو اپنے وطن کے ساتھ ہے۔ ہندوستانیوں کو نہیں۔ اگرچہ حمایت وطن نے یہاں بڑی بڑی قیمتی قربانیاں الفت وطن کے نذر کردیں۔ مگر پھر بھی جیسے کارنامہ اور ملک والوں نے دکھائے ہیں۔ اہل ہند نہیں دکھا سکے۔ اس کی وجہ اور کسی کے نزدیک چاہے جو کچھ ہو مگر ہمارے خیال میں تو یہ بات آتی ہے۔ کہ دوسری زمینوں کی طرح اے سر زمین ہند تو اپنی اولاد کو مرنے کے بعد بھی اپنے آغوش میں جگہ نہیں دیتی تیرے

بچوں کی لاشیں بجائے اس کے کہ تو انھیں اپنے گہوارے میں لٹا کے موت کی میٹھی نیند سُلائے آگ کی نذر ہوتی اور جلا کے خاک کر دی جاتی ہیں۔ تو انھیں پیدا کرتی ہے جب تک جیتے ہیں اُن کے ساتھ تیرا سلوک معمولی رہتا ہے لیکن مرنے کے بعد تو اُس کی روادار نہیں۔ کہ وہ تیرے آغوش میں لیٹیں پھر ایسی بے رحم ماں اپنی اولاد سے کیا امید کر سکتی ہے۔

## عدالت فاروقی رض

مسلمانان عرب اور صحابۂ کبار نے جب روم شام کو فتح کیا ہے اور سطوت فاروقی نے قیصر روم کے اعضا و جوارح میں لرزہ ڈال دیا ہے۔ اُس وقت فاتحین اسلام کے مقابل رومیوں کے ساتھ مسیحی عربوں کی بھی ایک بڑی بھاری جماعت نظر آتی ہے جو اکثر بڑے میدانوں میں اُن سے لڑنے اور شکست کھا کے بھاگتے تھے۔ اور تعجب معلوم ہوتا ہے۔ کہ جب سارے جزیرہ نمائے عرب میں اسلام کا بول بالا ہو چکا تھا ہر قوم اور ہر قبیلہ کے لوگ حجاز کے پیغمبر اُمّی (صلی اللہ علیہ وسلم) پر ایمان لا چکے تھے اُس وقت یہ نصرانی عرب کہاں سے پیدا ہو گئے جو عربی معاشرت رکھتے تھے عربی بولتے تھے۔ عربی شعر و سخن کی داد دیتے تھے۔ اور پھر اس کے ساتھ عیسائی تھے۔

اس کی اصلیت یہ ہے۔ کہ جاہلیت عرب میں جس طرح حیرہ میں آل منذر کی سلطنت قائم تھی۔ جو کہ ایران کی سرحد پر ہونے کے باعث خسروانِ عجم کے ماتحت اور اُن کے زیر اثر تھی۔ اُسی طرح عرب کے شمال میں بنی غسان کی ایک اور زبردست سلطنت تھی۔ جو شام و ارض یہودا کی سرحد پر ہونے کے باعث قیاصرۂ روم کے ماتحت اور اُن کی ہم مذاق و ہم مذہب تھی شہر تبوک کے قریب پرانا عالیشان شہر بلقا اس کا مرکز حکومت تھا اور خاندان شہریاری "جفنہ" نام کسی پرانے مورث کی نسبت سے "آل جفنہ" کہلاتا تھا صحرا نشینان عرب عموماً یہاں آ کے فرمانرواؤں اور امیروں سے تمدن و تہذیب کا سبق لیتے تھے۔ اور شعرائے عرب دُور دُور سے آ کے ان کی مدح میں غزل سرائی کرتے تھے۔ اس ملک کا آخری تاجدار جبلہ ابن ایہم غسانی تھا جس کے دادا حارث اعرج کی شجاعت اور اُس کی دادی ماریۂ ذات القرطین زدو

رخ فروری ۱۹۱۲ء

گوشواروں والی اکی خوش وضعی اور نیز اُس تزئین سارے عرب میں مشہور تھی۔ جبلہ نے جب دیکھا کہ سارے قبائل عرب نے علم اسلام کے آگے سر جھکا دیا۔ اور کل شرفائے عرب مسلمان ہو گئے اور نظر آیا کہ حجاز کی دینی حکومت کی سطوت ایران و روم کی صدیوں کی عظمت و جبروت کو پامال کئے ڈالتی ہے تو خود بھی دین اسلام کے قبول کرنے پر آمادہ ہو گیا۔

مسند خلافت پر اُن دونوں حضرت فاروق اعظم جلوہ فرما تھے اور درّۂ عمری کے رعب سے سلاطین ارض کانپ رہے تھے۔ اُس نے حضرت عمر کو اپنے ارادے کی خبر کی۔ اور لکھا کہ "میں چاہتا ہوں بذات خود مدینہ میں حاضر ہو کے پیغمبر آخر الزمان پر ایمان لاؤں"۔ اہل مدینہ کے لئے یہ ایک بہت بڑا مژدہ تھا۔ کیونکہ انھیں فرمانروائے بنی غسان اور تاجدار بلقاد کے ایمان لانے کی جتنی خوشی ہو سکتی تھی نہ قیصر روم کے دین اسلام قبول کرنے پر ہو سکتی تھی۔ اور نہ خسرو عجم کے مسلمان ہونے پر۔ جناب فاروق نے اُسے جواب میں خوش ہو کے تحریر فرمایا۔ "شوق سے آؤ۔ ایمان لانے کے بعد تم کو وہ تمام حقوق حاصل ہو جائیں گے جو ہمیں حاصل ہیں۔ اور تمہارے فرائض بھی وہی ہو جائینگے۔ جو ہمارے فرائض ہیں"۔ یہ قابل اطمینان جواب پا کے جبلہ پانچ سو سواروں کے جلوس کے ساتھ مدینہ طیبہ میں آیا مدینہ کے قریب پہنچ کے اُس نے اپنے جلوس کے تمام سواروں کو دھاری دار زر لفت کی قبائیں پہنائیں اور معلوم ہوتا تھا کہ اُس کا سارا لشکر سونے کے دریا میں غرق ہے۔ بیچ میں اپنا مرصع زریں تاج سر پر رکھے اور مرصع و مغرق کپڑے پہنے خود تھا۔ اور اُس کے سونے کے تاج میں اور جواہرات کے ساتھ اُس کی دادی ذات القرطین کے دونو مشہور گوشوارے بھی آویزاں تھے۔

اُس کے آنے کی خبر مشہور ہوئی تو تمام اہل مدینہ تماشا دیکھنے یا استقبال کے لئے شہر کے باہر گئے۔ اور بچے اور گھروں کی بیٹھنے والی عورتیں تک اُس کے جلوس کی آن بان دیکھنے کے شوق میں گھروں سے باہر نکل پڑیں اور اُس سے پہلے مدینہ میں کبھی ایسی دھوم دھام نہیں نظر آئی تھی۔ غرض بڑے جلوس اور ٹھاٹھ کے ساتھ جبلہ مدینہ میں داخل ہوا۔ حضرت عمر سے ملا۔ آپ کے ہاتھ پر ایمان لایا۔

اسی قدر نہیں چند روز بعد موسم حج آیا۔ تو اُس نے حضرت فاروق کے ہمراہ حج کرنیکے شوق میں مکہ معظمہ کا سفر کیا۔ اور تمام مسلمانوں کے ساتھ حج کیا۔

اسی حج کے زمانہ میں ایک دن خانہ کعبہ کے گرد طواف کر رہا تھا۔ عرب کے دنیا پرست اُمرا کی پرانی وضع یہ تھی۔ کہ ازار (تہمت) ایسی باندھتے جو بہت نیچی ہوتی اور اُس کے دونوں سرے زمین پر لوٹتے جاتے۔ جس کی حدیث میں سخت مخالفت آگئی ہے۔ جبلہ بھی اسی وضع میں تھا۔ اور شاید اُس کے ابھی ابھی مسلمان ہونے کے خیال سے لوگوں نے اُس کی یہ متکبرانہ وضع گوارا کر لی تھی۔ اتفاقاً اُس وقت بنی فزارہ میں کا ایک معمولی شخص بھی مصروفِ طواف تھا۔ نادانستگی سے اُس کا پاؤں جبلہ کی ازار کے اُس کونے پر پڑ گیا۔ جو زمین پر لوٹ رہا تھا۔ ساتھ ہی جبلہ نے بے دیکھے قدم آگے بڑھایا۔ تو ازار کھل گئی۔ جبلہ کا سا مغرور فرمانروا بھلا اس کی تاب لا سکتا تھا؟ اُس فزاری شخص کے مُنہ پر اس زور سے طمانچہ مارا کہ ناک کا بانسہ پھوٹ گیا۔ اور خون بہنے لگا۔ فزاری نے آ کے حضرت عمرؓ سے شکایت کی اور آپ کے دربارِ عدالت سے دادخواہ ہوا۔ آپ نے آدمی بھیج کے جبلہ سے دریافت کیا کہ "آپ نے اس بیگناہ شخص کو تھپیڑ کیوں مارا؟" اس نے کہلا بھیجا۔ "اُس شخص نے بڑی گستاخی کی کہ میری ازار پر اس طرح پاؤں رکھ دیا۔ کہ وُہ کھل گئی۔ اور یہ تو طمانچہ ہی تھا۔ مجھے اگر حُرمتِ کعبہ کا پاس نہ ہوتا تو میں اس کا سر اُڑا دیتا۔" حضرت عمرؓ نے فرمایا "خیر جو ہوا، وُہ تو ہوا مگر آپ نے اپنا یہ جُرم تو قبول کر لیا۔ کہ اُسے تھپیڑ مارا ہے اب یا تو جس طرح بنے اُسے راضی کیجئے۔ ورنہ بحکم شریعتِ غرّا "والجروح قصاص" میں اس فزاری کو اجازت دوں گا کہ ویسا ہی تھپیڑ آپ کو مارے۔" یہ سُن کے جبلہ کو حیرت ہوئی بولا "مجھ سے اور قصاص! میں ایک فرمانروا ہوں۔ اور وہ ایک ادنیٰ درجہ کا بازاری شخص ہے!" جناب فاروق نے فرمایا "مگر اسلام نے تمہیں اور اُس کو برابر کر دیا ہے۔ اب سوا نیکو کاری کے کوئی مایۂ فضیلت نہیں ہو سکتا۔ اِنّ اکرمکم عند اللہ اتقٰکم۔" جبلہ نے کہا "میں تو سمجھتا تھا کہ اسلام لانے سے میری عزت بڑھ جائیگی۔ نہ کہ جو کچھ آبرو ہے۔ وہ بھی ڈوب جائے۔" جناب عدالت پناہ نے فرمایا "بیشک

عزت بڑھ گئی اور وہی یہی باہمی مساوات اور اخوت دینی ہے۔ اس پر بگڑ کے جبلہ بولا "یہی حالت ہے تو میں پھر عیسائی ہو جاؤں گا۔" حضرت فاروق نے فرمایا "اگر تم مرتد ہو گئے تو میں تمھارا سر اڑا دوں گا۔" جناب فاروق کی زبان سے یہ کلمہ سن کے جبلہ کے ہوش ٹھکانے ہوئے۔ اور دل میں سوچنے لگا کہ کیا کروں۔

اب یہاں یہ حالت ہو رہی تھی کہ ایک طرف بنی فزارہ کا ایک بڑا گروہ جمع ہو گیا تھا۔ کہ ہمارے قبیلہ والے کے ساتھ ناانصافی نہ ہونے پائے۔ دوسری طرف جبلہ کے سوار دست بہ شمشیر تھے۔ کہ ہمارے تاجدار کے ساتھ کوئی برا سلوک نہ ہو جائے۔ آخر جبلہ نے حضرت عمر سے کہا "تو پھر مجھے سوچنے کے لئے کل تک کی مہلت دیجیے۔ جو کچھ مناسب ہوگا کل کروں گا۔" حضرت عمر نے فرمایا "یہ منظور ہے۔" اس کے بعد جب رات کو اندھیرا چھا گیا۔ جبلہ اپنے تمام ہمراہیوں کے ساتھ مکہ سے بھاگ کھڑا ہوا۔ اور ایسا دہشت زدہ اور خائف تھا کہ گو اپنے ملک اور وطن ہی میں سے ہو کے گزرا۔ مگر وہاں کبھی دم نہ لیا آگے بڑھ کے قلمرو روم میں داخل ہوا۔ اور وہاں بھی اطمینان نہ ہوا۔ تو بھاگتے بھاگتے خاص قسطنطنیہ میں داخل ہوا اور ہرقل سے ملا۔ ہرقل شہسواران اسلام کی متواتر فتوحوں کی خبریں سن کے سہما ہوا تھا۔ جب دیکھا کہ عربوں ہی میں کا ایک سردار بلکہ تاجدار ان سے ٹوٹ کے میرے پاس چلا آیا ہے۔ تو بہت خوش ہوا۔ بڑی قدر و منزلت سے پیش آیا۔ حد سے زیادہ تعظیم و تکریم کی اور بہت بڑی جاگیر دی۔ کہ اطمینان اور فارغ البالی اور شاہانہ تمکنت سے زندگی بسر کر سکے۔ بہت سے غسانی لوگ اس کے ساتھ ہی چلے گئے تھے بہت سے بعد جا پہنچے۔ جو لشکر روم میں اعلیٰ درجے کے سپہ گری کا کام دیتے

چند روز بعد حضرت فاروق اعظم نے ہرقل کے پاس اپنا ایک ایلچی بھیجا اسے دین اسلام کی تبلیغ کی۔ اور اپنے خط میں بتایا کہ اسلام میں کیسی کیسی خوبیاں ہیں۔ ہرقل نے دین اسلام قبول کرنے سے تو انکار کیا۔ مگر چند اور شرائط پہ صلح کر لی کیونکہ بغیر صلح کیے اسے اپنی سلطنت نہایت ہی خطرناک

حالت میں نظر آتی تھی۔ ہرقل جب حضرت عمر کے خط کا جواب لکھنے کو بیٹھا۔ تو اُسے خود بخود ملک غسان جبلہ کا خیال آیا اور جناب فاروق کے ایلچی سے پوچھا "تم اپنے اُس ملکی و قومی بھائی سے بھی ملے ہو جو ہمارے دین کا گرویدہ ہو کے یہاں آیا ہے اور ہمارا مہمان ہے؟" اُس نے کہا "نہیں۔" بولا "تو اُس سے جا کے مل آؤ۔ جب تک میں خط کا جواب لکھتا ہوں۔"

خود اُس ایلچی کا بیان ہے۔ کہ قیصر کے قصر سے نکل کے جب میں جبلہ بن ایہم کی ڈیوڑھی پر پہونچا۔ تو وہاں بھی مجھے ویسے ہی ٹھاٹھ اور ویسی ہی شان و شوکت نظر آئی۔ جیسی کہ خود ہرقل کے دروازے پر تھی دربانوں اور حاجبوں کا ہجوم تھا۔ غلام زرق برق کپڑے پہنے اور فوجی لوگ ہتھیار لگائے ہوئے ٹہل رہے تھے۔ اور ملنا درکنار جبلہ کو آنے کی اطلاع کرنا بھی دشوار معلوم ہوتا تھا بڑی دشواریوں سے میں نے اپنی اطلاع کرائی۔ اور تھوڑی دیر کے بعد مجھے باریابی کا موقع ملا۔ اندر جا کے اُس کی صورت دیکھی۔ تو پہچان نہ سکا۔ اس لئے کہ جب مدینہ میں آیا ہے۔ اُس کی ڈاڑھی موچھیں سیاہ تھیں اور اب سفید ہو گئی تھیں۔ اتنے میں اُس نے ایک خادم کے ہاتھ سے سونے کا بُرادہ لے کے ڈاڑھی پر چھڑک لیا۔ اور اُس کے چہرے کے تمام بال سُنہرے ہو گئے۔ اور ڈاڑھی سونے کی سہرے کی طرح جگمگا اٹھی۔

وہ ایک شیشہ کے تخت پر بیٹھا ہوا تھا۔ جس کے پایہ آبنوس کے تھے اور اُن میں سونے کی پچی کاری تھی۔ سر پر ایک مرصّع تاج پہنے تھا جس کی چوٹی پر صلیب تھی۔ مجھے پہچانتے ہی اُس نے کھینچ کے اپنے برابر تخت پر بٹھا لیا۔ اور مسلمانوں کے حالات پوچھے میں نے کہا "الحمد للہ کہ سب خیریت سے ہیں۔ اور اُن کی تعداد روز بروز بڑھتی ہی جاتی ہے۔ جب آپ نے دیکھا تھا اُس سے اب بدرجہا زیادہ بڑھ گئے ہیں۔" پوچھا "عمر بن الخطاب کیسے ہیں؟" میں نے کہا "وہ بھی بہت اچھے اور مع الخیر ہیں۔" یہ سُنتے ہی میں نے دیکھا کہ اُس کا چہرہ مکدر ہو گیا۔ مجھے اُس کی یہ حرکت ایسی بُری معلوم ہوئی۔ کہ تخت سے اُتر کے زمین پر کھڑا ہو گیا۔ اُس نے متعجب ہو کے کہا "میں تو تمہاری قدر و منزلت کرتا ہوں اور تم اُس سے بھاگتے ہو؟" میں نے کہا۔ "ایسے تخت پر بیٹھنے سے ہمیں رسول اللہ صلعم نے منع فرمایا ہے۔" بولا "ہاں انہوں نے منع

کیا ہے۔ خدا اُن پر رحمت نازل کرے۔ مگر میں تو کہتا ہوں کہ اپنا دل پاک و صاف رکھو اور جیسے فرش اور تختوں پہ چاہو" اُس کو جناب رسول خدا پر درود بھیجتے سُن کے میرے دل میں حوصلہ پیدا ہوا اور میں نے کہا "جبلہ۔ افسوس تم ایمان نہیں لاتے! آخر اس میں تامل کیا ہے؟" بولا "ان سب باتوں اور اپنے مرتد ہونے کے بعد بھی کیا میں مسلمان ہو سکتا ہوں؟" میں نے کہا "بے شک بنی فزارہ ہی میں کا ایک شخص مرتد ہو گیا تھا۔ تم سے زیادہ اُس نے مسلمانوں سے دشمنی کی۔ اُن کے گھٹنوں پر تلواریں ماریں۔ لیکن اب خدا کے ہدایت کرنے سے دین اسلام قبول کیا اور اُس کا اسلام قبول بھی کر لیا گیا۔ میں ابھی ابھی اُسے مدینہ میں چھوڑ کے آیا ہوں" بولا "اب مجھے رہنے ہی دو" پھر کچھ سوچ کے کہا "اچھا یہ شرط کرو کہ عمر بن الخطاب مجھے اپنی بیٹی بیکے داماد بنائیں گے اور مجھی کو اپنا ولی عہد قرار دینگے" میں نے کہا "اُن کی بیٹی دلوانے کی تو میں ذمہ واری کر سکتا ہوں۔ مگر اس کا اطمینان نہیں دلا سکتا کہ وہ تمھیں ولی عہد بھی تسلیم کریں گے"

اب جبلہ نے اس گفتگو کو ٹال کے اپنے ایک خادم کی طرف کچھ اشارہ کیا۔ جو فوراً تعمیل حکم کو دوڑا۔ اور چند لمحوں کے بعد خدام نے آکے دسترخوان بچھایا اور طرح طرح کی نفیس غذائیں سونے کے بادیوں اور چاندی کی رکابیوں میں لا کے چنی گئیں جب سب کھانا آ گیا تو اُس نے مجھ سے کہا "کھاؤ" میں نے ہاتھ روکا اور کہا "ہے جناب رسالت مآب صلعم نے سونے چاندی کے ظروف میں کھانے سے منع فرمایا۔" یہ سُن کے پھر پہلے کی طرح بولا "ہاں اُنھوں نے منع فرمایا ہے خدا اُن پر رحمت نازل کرے مگر میں تو کہتا ہوں کہ دل پاک و صاف رکھو اور جیسے برتنوں میں جی چاہے کھاؤ" آخر میں نے مٹی کے برتنوں میں اور اُس نے اپنے سونے چاندی کے برتنوں میں کھانا کھایا۔ جب غذا سے فراغت ہوئی تو چاندی کی سلفچی میں سونے کے آفتابہ سے ہاتھ دھلائے گئے اور دسترخوان بڑھایا گیا۔

اب اس نے پھر اپنے خادم کو اشارہ کیا اور دم بھر میں دس مرصع طلائی کرسیاں داہنی طرف اور دس بائیں طرف لا کے بچھا دی گئیں۔ چند دقیقہ نہ گذرے ہونگے کہ دونوں جانب ان کرسیوں پر نہایت ہی حسین و ماہ جبیں گلرخسار و جادو نگاہ

نازک اندامیں مغرق و مرصع لباس سے آراستہ سر سے پاؤں تک زیور سے لدی اور دُلھن بنی ہوئی آکے اُن کرسیوں پر بیٹھ گئیں۔ میں نے زندگی بھر میں کبھی ایسی پری جمال و نازک اندام مہ وشیں نہیں دیکھی تھیں۔ میں اُنھیں بیس نازنینوں کی ہر ہر ادا پر فریفتہ ہو رہا تھا۔ کہ ناگہاں ایک اور گل رخسار حسینہ آئی جس کا حسن و جمال سب سے بڑھا ہوا تھا۔ بے اختیار زبان سے نکلا "تبارک اللہ احسن الخالقین"۔ اس گل اندام کے سر پر ایک زریں تاج تھا۔ اور اُس کی چوٹی پر ایک زندہ طائر بیٹھا ہوا تھا۔ اُس کے داہنے ہاتھ میں مشک و عنبر سے بھرا ہوا جام تھا اور بائیں ہاتھ میں گلاب کا کٹورہ۔ اس حسینہ کا فرماجرا نے جبلہ کے سامنے ادب سے ٹھہر کے سیٹی بجائی۔ فوراً وہ طائر اُس کے تاج سے اُڑ کے نیچے آیا۔ اور گلاب کے جام میں لوٹنے اور غوطہ لگانے لگا۔ اس کے بعد اُس نے پھر سیٹی بجائی تو وہ اُڑ کے جبلہ کے تاج کے گرد چکر لگانے اور اُس کے تاج کی صلیب پر گلاب چھڑکنے لگا میں تو یہ تماشہ دیکھ کے متحیر تھا۔ مگر جبلہ مارے خوشی کے ہنس پڑا۔ اور دانت جبڑوں تک کھل گئے۔

اب یہ نازنین تو ایک طرف کھڑی ہو گئی اور جبلہ نے داہنی جانب والی نازک اندا موں سے کہا "اب تم ذرا مجھے خوش کر دو۔ فوراً انھوں نے اپنے چنگوں کے تار کھینچ کے اور سُر ملا کے چند اشعار گائے جن میں پہلا شعر یہ تھا۔

لِلّٰہ درّ عصابۃ نادمتہم یوماً بجلق فی الزمان الاول[ع]

ان اشعار میں اُس کے خاندان کی خوبیاں اور اس کی عظمت بتائی گئی تھی اور ان کی فیاضی و دریادلی کی مدح تھی۔ ان اشعار کا نغمہ سُن کے وہ پھر اس قدر ہنسا کہ مسوڑے کھل گئے اور میری طرف دیکھ کے کہا "سمجھتے ہو یہ اشعار کس کے طبع زاد ہیں؟" میں نے کہا "نہیں"۔ بولا "یہ حسان بن ثابت کے شعر ہیں۔ جو محمد (صلعم) کے مداح خاص ہیں۔

اس کے بعد اُس نے بائیں طرف والی مہ جبینوں کی طرف متوجہ ہو کے کہا "تم مجھے ذرا رلا دو"۔ حکم کے ساتھ ہی اُن گل اندا موں نے اپنا ساز درست کیا اور چند

---

ع۔ کیا خوب تھے وہ لوگ جن سے میں اگلے زمانہ میں ایک دن (قصر) جلق میں ہم صحبت رہا تھا۔

اشعار گائے جن کا مطلع تھا۔

لمن الدار اقفرت بمعان      بین اعلی الیرموک فالجمان[۴]

یہ اشعار نہ تھے۔ بلکہ دراصل فرمانروایان بنی غسان کے قصر شاہی کے اجڑنے کا مرثیہ تھا جیسیں اُس کے محل کی گرد کی سینری دکھائی گئی تھی۔ اُسکو سُنکے جبلہ کی آنکھوں سے آنسو جاری ہوگئے پھر آنکھوں سے آنسو پونچھ کے مجھ سے پوچھا" اور جانتے ہو یہ شعر کس نے کہئے ہیں۔؟" میں نے کہا "نہیں" بولا" یہ بھی حسان بن ثابت ہی کے شعر ہیں" اس کے بعد اُس نے چند شعر خود پڑھے۔ جس میں دوسرا شعر یہ تھا۔

فیالیت اُمی لم تلدنی ولیتنی      رجعت الی الامر الذی قال لی عمر[۵]

ان شعروں میں اُس نے اپنے تھپڑ مارنے اور اپنی ضد پر قائم رہنے پر پچھتا کے اپنی جلا وطنی پر اظہار اندوہ وملال کیا تھا۔

یہ شعر پڑھ چکنے کے بعد ذرا ٹھہر کے مجھ سے پوچھا" حسان بن ثابت زندہ ہیں؟ میں نے کہا جس وقت میں مدینہ سے چلا ہوں اُس وقت تو بقید حیات تھے۔ اُن کی زندگی کی خبر سُن کے اُس نے ایک خلعت اور چند نہایت ہی اعلےٰ درجہ کے اونٹ منگوا کے میرے حوالہ کیئے اور کہا "مدینہ میں پونہچ کے اگر حسان کو زندہ پانا تو یہ دونوں چیزیں میری طرف سے ہدیۃً اُن کو دے دینا اور اگر انتقال کر چکے ہوں تو خلعت اُن کے گھر میں دے دینا۔ اور ان اونٹوں کو اُن کی قبر پر لیجا کے ذبح کر دینا۔ میں نے کہا "بہتر"

اب میں اُس سے رخصت ہو کے ہرقل کے پاس گیا اور اُس کا خط لے کے مدینہ طیبہ میں واپس آیا۔ اور کل واقعات امیر المومنین عمر فاروق کی خدمت میں عرض کر دیئے۔ جب میں نے جبلہ کو دین اسلام کی طرف مدعو کرنے اور اُس کی شرطوں کا ذکر کیا تو حضرت عمر نے فرمایا" تم نے دونوں باتوں کا وعدہ کیوں نہ کر لیا؟ جب اسلام اُس پر اثر کرتا تو پھر اُس کے فیصلوں پر وہ خود ہی چلنے لگتا" اس کے بعد جب میں نے اُس کے ہدیوں کا ذکر کیا جو اُس نے حسان بن ثابت کیلئے بھیجے تھے۔

[۴] ترجمہ: مقام معان میں یعنی یرموک سے ... در وادی جمان میں یہ کس کا مکان ہے جو اُجڑ گیا۔

[۵] ترجمہ: کاش میری ماں مجھے نہ جنتی۔ اور کاش میں وہی بات مان لیتا جو (امیر المومنین) عمر رضی اللہ عنہ نے کہی تھی

تو آپ نے فوراً حسان بن ثابت کو بلوایا۔ حسان بن ثابت اب آنکھوں سے معذور ہوگئے تھے۔ ایک شخص انھیں پکڑ کے لایا انھوں نے آتے ہی کہا "یا امیر المومنین مجھے آپ کے پاس سے آل جفنہ رخاندان جبلہ بن ایہم وحکمرانان بنی غسان) کی بو آئی ہے"۔ آپ نے میری طرف اشارہ کرکے فرمایا "ہاں یہ اُس سے ملے چلے آتے ہیں"۔ اس کے جواب کے ساتھ ہی حسان نے مجھ سے کہا "تو بھائی جو کچھ لائے ہو دو۔ وہ فیاض ہے اور فیاضوں کی نسل سے ہے۔ جاہلیت میں میں نے اُس کی مداح سرائی کی تھی جس پر خوش ہو کے اُس نے قسم کھائی تھی۔ کہ جب کوئی تمہارا شناسا ملے گا۔ اُس کے ہاتھ تمھیں کوئی نہ کوئی ہدیہ ضرور بھیجونگا"۔

## نیچر کی ترقیاں

(مارچ ۱۲ء)

نیچر کا لفظ جب پہلے پہل ہندوستان میں آیا ہے تو اُس پر ہر طرف سے یورشیں ہونے لگیں سر سید مرحوم کی زبان سے جیسے ہی یہ انوکھا لفظ سُنا گیا۔ ہر جگہ شور مچ گیا۔ کوئی سمجھا اور کوئی نہیں سمجھا۔ مگر پیچھے سب پڑ گئے۔ اور چند روز تک یہ عالم تھا کہ معلوم ہوتا جیسے لوگ غریب نیچر کو دنیا میں رہنے ہی نہ دیں گے۔

ہندوستان پر موقوف نہیں۔ دنیا میں جہاں کہیں نیچر کا نام پہلے پہل لیا گیا۔ یہی درگت بنی انسان کے ہوش سنبھالنے سے پہلے سارے صفحۂ ہستی پر نیچر کی حکومت تھی ہر چیز نیچر کی تابع فرمان تھی اور نیچر ہی انسان کا رہبر بلکہ اُستاد ازل تھا۔ مگر انسان جو جو ہوش سنبھالتا گیا نیچر کو بھولتا گیا۔ اُس کے دماغی خیالات اُس کے ایجادات و اختراعات۔ نیچر پر غالب آتے گئے۔ یہاں تک کہ انسانی تربیت وتعلیم کے لئے مذاہب پیدا ہوئے۔ مذہب کی اصلی بنیاد نیچر ہی پر قائم ہوئی تھی مگر دنیا کے عام مذاق رسم ورواج اور انسان کے اپنی قوت پر نازاں ہونے کا نتیجہ تھا کہ مذاہب کو نیچر سے عداوت ہوگئی۔ اور مذہبوں نے بڑی زبردست قوت اور بڑے جوش وخروش کے ساتھ نیچر پر حملہ شروع کر دیا۔ پھر جب دنیا کی حکومت بھی مذہبوں کے ہاتھ آگئی تو انھوں نے نیچر کو جا بجا شکستیں دیں اور اب جہاں دیکھیے۔ نیچر کا حریف تصنع اُس پر غالب تھا۔

خدا فراموش لوگ چونکہ اکثر نیچر کا زیادہ نام لیتے اور نیچر ہی کی جے پکارا کرتے تھے

اس لئے پیروان مذہب کے ذہن سے "فطرۃ اللہ" کا خیال اُتر گیا اور انھوں نے خدا پرستی کا سب سے بڑا دشمن نیچری کو سمجھ لیا۔ اور یہی اصلی بنا نیچر اور مذہب کی عداوت کی تھی گو اصل میں دونوں ایک تھے اور ازل سے ایک دوسرے کے دوست اور ہمدم و ہمراز چلے آتے تھے مگر تصنع کے غلبہ نے دونوں کی صورتیں ایسی بدل دی تھیں کہ ایک دوسرے کو دشمن جانی تصور کرتے۔ اور معلوم ہوتا کہ دنیا میں ان دونوں حریفوں کا ایک ساتھ ہرگز نباہ نہ ہو سکے گا چنانچہ مذہب سے جہاں تک بنتا تھا اسی کوشش میں تھا کہ نیچر کو پیس دے اور ایسا فناہ کرے ۔ کہ پھر کہیں اُس کا نام و نشان نہ باقی رہنے پائے۔ مگر نیچر فناہ ہونے والی چیز نہ تھا جن لوگوں نے حدیث "لاتسبو الدہر انا الدہر" (زمانہ کو نہ کوسو میں ہی زمانہ ہوں) سُنی تھی جانتے تھے کہ تخلیق عالم میں نیچر ہی خدا کا داہنا ہاتھ ہے وہ ہاتھ جس کی نسبت خود وہ حضرت رب العزت فرماتا ہے: "ید اللہ فوق ایدیہم" (خدا کا ہاتھ اُن کے ہاتھوں پر ہے) اور جب وہ خدا کا ہاتھ تھا جو باغ قدرت میں رنگ رنگ کے گل بوٹے کھلاتا اور طرح طرح کے طیور سے اُن پر نغمہ سنجی کراتا تھا۔ تو بھلا اُسے کون مغلوب کر سکتا تھا! چنانچہ نیچر گو بادی النظر میں دبا ہوا نظر آتا تھا مگر ہر جگہ اپنی پوری قوت کے ساتھ موجود تھا اور تصنع کے دامن ہی میں چھپا ہوا اپنے کمالات اور اپنی چابکدستی کے کرشمے دکھا رہا تھا۔

اُس نے تصنع اور انسانی تبختر کے چند روز کے لئے اُبھرنے اور سر اُٹھانے کا موقع دیدیا۔ انسانی کارستانی کا پورا زور ختم ہونے اور اُس کی خود آرائی و خود پرستی کا تماشہ دیکھ لینے کے بعد سر اونچا کیا! اور دنیا کو دکھا دیا کہ وہ مغلوب یا فنا نہیں ہوا تھا۔ بلکہ انھیں مصنوعات انسانی کے دامن میں چھپا ہوا تھا۔ اب کی نمایاں ہوتے ہی اُس نے دکھا دیا۔ اور ثابت کر دیا کہ سارے تصنع اور تمام انسانی کاریگریوں میں اُس کی قوت مخفی تھی۔ جو کچھ کر رہا تھا وہی کر رہا تھا۔ اور بناوٹ میں بھی دراصل اُسی کے ہاتھ کی کاریگریاں تھی۔

نیچر کا یہ آخری غلبہ دیکھ کے سب لوگ چونک پڑے۔ جو اُس کے مخالف تھے موافق ہو گئے جنھیں اُن سے عداوت تھی محب ہو گئی جن کو اُس کی صورت سے نفرت تھی۔ اُس کے جمال جہاں آرا کے دیوانہ ہو گئے اور اہل مذہب بھی تعصب کا پرد

چاک کر کے چلا اُٹھے۔ "ہل تجد لخلق اللہ تبدیلا" (خدا کی تخلیق (نیچر) میں تجھے کوئی بھی تغیر و تبدل نظر آتا ہے)

خصوص اہل تصوف اور قائلین وحدت وجود نے تو صاف اقرار کر لیا کہ اس سارے عالم کون و فساد اور اس تجلی نہ بیٹھنے والی دنیا میں ہر چیز بلکہ ہر ذرے سے وہی ہستی مطلق نمایاں ہے۔ اور اسی کے یہ تغیرات وانقلابات وہی فطرۃ ہیں۔ جسے اہل شرع فطرۃ اللہ کہتے ہیں اور اسی کا دوسرا نام نیچر ہے۔

یہ خیال پیدا ہونے کے بعد غور کیا گیا تو صاف نظر آیا اور سب کو تسلیم کر لینا پڑا کہ جو کچھ ہے نیچر ہی ہے اور نیچر کے سوا کچھ نہیں۔ اگلی دنیا نے نیچر کی مخالفت میں اپنی ناسمجھی سے جو کچھ کیا ظلم تھا۔ بادۂ نیچر کے سرشار منصور کو جس نے نیچر کی محبت کے جوش میں "انا الحق" کا نعرہ بلند کیا تھا سولی دی گئی اور سرمد نے نیچر کے جذبات میں محو ہو کے کپڑے پھاڑ ڈالے تو واجب القتل قرار پایا مگر ایسے مظالم اب نہیں ہو سکتے۔ کیونکہ اب نیچر نے تصنع یعنی مادہ پرستوں پر فتح پالی۔ اور وہ زمانہ آ گیا کہ مذہب ہی کے طرف داروں میں سے کسی کی زبان سے تو یہ الفاظ نکلتے ہیں کہ "جتنا مذہب فلسفہ میں ہے اتنا فلسفہ مذہب میں نہیں" اور کوئی کہتا ہے کہ "فلسفہ مذہب ہے اور مذہب فلسفہ"

یا تو انسان کی بنائی ہوئی تہذیب کا اس قدر زور تھا کہ محض برہنگی کی بنا پر سرمد کا سر کاٹا گیا۔ اور یا یہ عہد ہے کہ برہنگی ہی میں فطرت کا سچا کمال نظر آتا ہے۔

یورپ میں اکثر مشہور ہے کہ بعض آوارہ عورتیں مردوں کے مجمع میں برہنہ ہو کے ناچتی ہیں مگر یہ ایک بدتہذیبی و بداخلاقی کا فعل سمجھا جاتا تھا۔ اور قانون کسی طرح اس کی اجازت نہ دے سکتا تھا۔ جو عورتیں ایسا کرتی بھی تھیں تو پوشیدہ مکانوں میں اور خاص جماعتوں کے سامنے کرتی تھیں یہ مجال نہ تھی کہ عام مجمعوں کے سامنے ننگی ہو کے ناچیں مگر فی الحال پیرس کی ایک باکمال حسینہ نے اپنا کمال عریانی دکھا کے زمانہ کو منوا دیا کہ ننگا ہو کے ناچنا ہرگز بداخلاقی نہیں بلکہ فطرت کے بالکل مطابق اور نیچر کی سب سے زیادہ مکمل جلوہ فرمائی ہے۔

ان بی صاحبہ کا نام مس ویلانی ہے جو پیرس کی بڑی مشہور رقاصہ ہیں مس ویلانی

نے مختلف صحبتوں میں پوشیدہ طور پر اپنا یہ کمال دکھانے کے بعد فی الحال جرمنی کے شہر میونیخ میں خاص خاص مشہور مصوروں نقاشوں اور بت تراشوں کو بلا کے اُن کے سامنے اپنے برہنہ ناچ کا کمال دکھایا۔ پولیس کے افسر جو پُرانے اصول اخلاق کے دلدادہ اور لکیر کے فقیر تھے اس ناچ کو سخت بد اخلاقی و بد تہذیبی تصور کرتے تھے اور مس ویلانی کی تاک میں لگے ہوئے تھے۔ میونیخ کے کسی تھیٹر میں وُہ ننگی کھڑی ہوئی ناچ ہی رہی تھیں کہ پولیس نے دخل بیجا کر کے صحبت بھر بھنڈ کر دی۔ اور مس ویلانی کا چالان کیا۔

یہ مقدمہ جب مجسٹریٹ کے اجلاس میں پیش ہوا۔ تو جرمنی کے نصف درجن مشہور و معروف صاحب کمال مصوروں نے آکے شہادت دی کہ ہم نے خود مس ویلانی کا ننگا ہو کے ناچنا دیکھا ہے۔ اور دعوے کرتے ہیں۔ کہ نہایت ہی اعلےٰ درجہ کا سائن ٹفک ناچ تھا جسمیں ایک اعلیٰ ترین کمال انسانی نظر آتا ہے۔ اور ہمیں اپنے فن میں اُن کے اس ناچ سے بڑی مدد ملی۔ جرمن کے سب سے بڑے نقاش پروفیسر کول باش نے کہا "یہ رقص علم و فن کی حیثیت سے بڑے اعلےٰ ترین کمال کا ظاہر کرنے والا اور بہت ہی مہذب و معزز تھا۔ میں اپنی بی بی کو بھی یہ ناچ دکھانے کو لے گیا تھا۔ اور انھوں نے بھی تسلیم کیا کہ اس میں کوئی اعتراض کے قابل بات نہیں ہے۔ میونیخ کی آرٹسٹ سوسائٹی کے پریسیڈنٹ پروفیسر ٹیرسن نے شہادت میں اس سے بھی بڑھ کے یہ ارشاد فرمایا "میں تو اُس دن خوش ہونگا۔ جب ایسے کمالات بجائے منتخب لوگوں کے عوام کے سامنے اور خلقت عام کے مجمع میں دکھائے جایا کریں گے اور تہذیب انسانی کی یہ ترقی عام مخلوق کے لئے ایک نعمت عظمیٰ ہوگی انسانی جسم کے حسن و جمال کے اظہار سے تہذیب میں کسی قسم کا رخنہ نہیں پڑ سکتا"

الغرض ایسی ایسی زبردست اور زوردار شہادتیں پیش ہوئیں کہ پولیس کو ایسے ایسے مہذب و شائستہ فعل پر مس ویلانی کے چالان کرنے پر ندامت ہوئی۔ اور جوری نے فیصلہ سنایا۔ کہ "مس ویلانی اپنے اس رقص سے ایک فن کی اعلیٰ درجے کی خدمت کر رہی ہیں اور یہ عذر کہ اُن کا یہ فعل اخلاق عامہ کے اصول کے خلاف تھا۔ بالکل لغو و بے بنیاد ہے چنانچہ اب اُمید ہے۔ کہ مس ویلانی بہت بے تکلفی و آزادی اور فخر و ناز کے ساتھ اپنا کمال دکھایا کرینگی۔ اور پھر کبھی کسی قسم کی مزاحمت پیش نہ آئیگی۔

ہمیں یاد ہے کہ ایک بار سید مرحوم لکھنؤ سے علیگڑھ جا رہے تھے گاڑی ہردوئی کے اسٹیشن پر ٹھہری اور کسی وکیل نے جو انھیں پہچانتا تھا اکثر لوگوں کو جو اسٹیشن پر موجود تھے۔ اور سید صاحب کی زیارت کے مشتاق تھے۔ دُور سے اُن کی صورت دکھا دی۔ فوراً سید صاحب کی گاڑی کے سامنے ایک میلا سا لگ گیا۔ اور سندیلہ کے ایک اردو داں وکیل صاحب نے بڑی جرأت کر کے یہ حرکت کی۔ کہ سید صاحب کے سامنے ہاتھ جوڑ کے کھڑے ہو گئے۔ اور خوشامد و لجاجت سے کہنے لگے "مجھے دکھا دیجیے!" جب کئی بار اُنھوں نے یہی سوال کیا تو سید صاحب نے پوچھا "آخر کیا دکھا دوں!" عرض کیا "نیچر" میں نیچر کے دیکھنے کا مشتاق ہوں اور سُنا ہے آپ سے ملاقات ہے!" سید صاحب نے ہنس کے کہا: "آپ ہی کے گھر میں ہے جا کے دیکھ لیجیے!" مگر ہمیں افسوس ہے کہ اُن دنوں مس ویلانی نہ ہوئیں۔ ورنہ سید صاحب انھیں اُن کی بی بی کے پاس بھیجنے کے عوض مس ویلانی کے پاس بھیج دیتے۔

## ہارون رشید کے دربار میں ہندوستانی تحفہ

ہر ایسی قوم جس نے دنیا میں کبھی ترقی کی ہو اُس کی پہلی اور پچھلی حالت میں زمین و آسمان کا فرق ہوا کرتا ہے اور ایسا عجیب اختلاف کہ خیال کر کے حیرت ہوتی ہے ابتدا میں اولوالعزمی اور جوش شجاعت کے ساتھ سادگی ہوتی ہے کام زیادہ اور بڑے بڑے ہوتے ہیں۔ اور دعویٰ مطلقاً نہیں ہوتا اس کے مقابل ترقی کر چکنے بعد اُس میں دعوے بڑھ جاتے ہیں۔ اور کارگزاری کم ہوتی جاتی ہے۔ سادگی تشریف لیجاتی ہے اور تکلفات زیادہ ہوتے ہیں۔

یہی اختلاف مسلمانوں کی ترقی کی ابتدا اور انتہا میں نظر آتا ہے۔ ایک تو وہ زمانہ تھا کہ روم و عجم کے سفیر مدینہ میں آتے اور خلفا کی سادگی دیکھ کے حیرت کرنے لگتے تھے بے اختیار اُن کے دل میں یہ خیال گزرتا تھا کہ یہی ہیں۔ جن کی سطوت و جبروت سے دنیا کانپ رہی ہے۔ اور جن کے خوف سے ہمارے عالی مرتبہ تاجدار راتوں کو نیند بھر کے سو نہیں سکتے! یہی بزرگ جو لوگوں میں بے تکلف بیٹھتے۔ ہر ادنیٰ و اعلیٰ سے کسی معمولی دوست کی طرح ملتے۔ اور بازاروں میں خود دستوں کا سودا خریدتے پھرتے تھیں

مسلمانوں کے خلیفہ ہیں! ہمارے وہاں تو ان کا نام سُن کے لوگوں کو بخار چڑھ آتا ہے اور یہاں ان کی یہ حالت ہے کہ اگر راستہ میں ان پر کوئی حملہ کر بیٹھے۔ تو کوئی بچانے والا بھی نہیں۔

یا تو یہ حالت تھی یا ہارون رشید کے زمانہ میں اُنھیں خلفائے اسلام نے وہ تزک و احتشام اور شان و شکوہ پیدا کر لیا تھا۔ کہ سلاطین ارض کے سفیر بغداد میں آ کے ایسی دھوم دھام دیکھتے تھے۔ کہ اُن کی آنکھیں خیرہ ہو جاتیں اور اُس کا عشر عشیر بھی دنیا کے کسی دربار میں نہ نظر آتا۔

چنانچہ ایک مرتبہ ہندوستان کے کسی عالی مرتبہ راجہ نے اپنے ایلچیوں کی معرفت ہارون رشید کے دربار میں کچھ تحفہ اور ہدیہ بھیجے تھے۔ وہ سفیر بغداد میں آئے۔ اور رشید نے اُن سے ملنے کے لئے ایک عظیم الشان دربار کیا۔ ارکان خلافت اور امرائے دولت زرق برق کپڑے پہن کے اپنے اپنے مرتبہ کے موافق بیٹھے۔ ترک سپاہی سر سے پاؤں تک فولاد کے دریا میں غرق جنکے سارے جسم میں سوا آنکھوں کی پتلیوں کے اور کوئی چیز نظر نہ آتی تھی دونو جانب صفیں باندھ کے کھڑے ہو گئے۔ اور اُن میں فخر بنی عباس ہارون رشید بڑے کر و فر سے آ کے جلوہ افروز ہوا۔ ہندوستانی سفیر آستان بوس ہوئے۔ خلیفہ نے انھیں بیٹھنے کی اجازت دی۔ اور حکم دیا کہ "جو کچھ لائے ہو۔ پیش کرو۔"

اُنھوں نے پہلے کچھ اعلیٰ درجے کے تھان نکال کے سامنے رکھے اور عرض کیا ہمارے ملک میں اس سے بہتر کپڑا تیار نہیں ہو سکتا۔ اور یہ تھان سوا تاجداروں اور سریر آراؤں کے کسی کو نصیب نہیں ہو سکتے"۔ رشید نے اُن تھانوں کو تحقیر کی نظر سے دیکھا۔ اور ان ایلچیوں کے سامنے ہی شاہی درزی کو بلا کے حکم دیا۔ کہ "ان تھانوں کو قطع کر کے میرے گھوڑے کی جھولیں تیار کرو"۔

یہ دیکھ کے ایلچی نے ندامت سے سر نیچے کر لئے۔ اور رشید نے کہا "اور کیا لائے ہو۔" عرض کیا ہمارے راجہ نے چند تلواریں بھی تحفۃً بھیجی ہیں۔ سیف ہندی ساری دنیا میں مشہور ہے۔ اور یہ تلواریں ہندوستان کی تلواروں میں بھی بے مثل اور نایاب ہیں۔ اور ان سے اچھی تلواریں اب نہیں نصیب ہو سکتیں"۔ یہ کہہ کے اُنھوں نے وہ

تلواریں تخت کے سامنے رکھ دیں۔ رشید نے انھیں غور سے دیکھا اور اپنے داروغہ سلح خانہ سے کہا ”وہ عمر بن سعدی کرب والی تلوار ”صمصامہ“ تو لانا۔“ فوراً وہ تلوار حاضر کی گئی۔ جیسے ہی اُس نے اُن تلواروں پر ایک ہاتھ جو مارا۔ تو سب کٹ کے ٹکڑے ہو گئیں۔ اور پھر اُس کی باڑھ ان ایلچیوں کو دکھائی اور کہا ”تلوار اسے کہتے ہیں۔“ ایلچیوں نے حیرت سے دیکھا کہ ”صمصامہ“ کی باڑھ میلی بھی نہیں ہوئی تھی۔ مڑنا یا کرنا تو کیا چیز ہے۔ اور پھر ندامت سے سر جھکا لیے۔

اب رشید نے کہا ”اور بھی کچھ لائے ہو؟“ ایلچیوں نے عرض کیا ”جی ہاں حضور تین کتّے بھی ہیں۔ جن کا بہادری میں کوئی درندہ مقابلہ نہیں کر سکتا۔“ اور وہ کتّے حاضر کیے گئے۔ رشید نے انھیں دیکھ کے کہا ”ہمارا کتّا شیر ببر ہے۔“ فوراً شیر کا کٹھرا لا کے پیش کیا گیا۔ جسے دیکھ کے خلیفہ نے کہا ”اس کا مقابلہ یہ کتّے کریں گے؟“ ایلچیوں نے کہا ”ہمارے ملک میں ایسا شیر نہیں ہوتا۔ لیکن اگر اجازت ہو تو ہم ان کتّوں کو اس شیر ببر پر چھوڑیں۔“ خلیفہ نے اجازت دی۔ اور کتّے شیر ببر پر چھوڑ دیے گئے شیر اکیلا تھا تینوں کتّوں نے اُسے مل کر مار لیا۔ تو رشید کو حیرت ہو گئی۔ اور بولا ”ہاں یہ کتّے البتہ ایک چیز ہیں۔ ان کو لے کے میں خوش ہوا۔ اچھا تو ان کے عوض میں تم میری قلمرو کی کوئی عجیب و غریب چیز پسند کرو۔ میں تمہیں دوں گا۔“ انھوں نے عرض کیا ”تو یہ تلوار صمصامہ مرحمت ہو۔ جس سے ہماری تلواریں کٹ گئیں۔“ رشید نے کہا ”یہ ناممکن ہے۔ ہمارے یہاں سلاح کی قسم سے کوئی چیز کسی غیر کو نہیں دی جا سکتی۔ صرف اس بات کا خیال ہے۔ ورنہ یہ تلواریں بے تکلف دیدیتا۔ کوئی اور چیز مانگو؟“ انھوں نے کہا ”ہم کو تو فقط اس تلوار ہی کی آرزو ہے۔“ رشید نے کہا ”یہ تو نہیں ہو سکتا۔“

پھر اُن لوگوں کو خلعت و انعام سے سرفراز کر کے اور بہت کچھ دیکے رخصت کیا۔

## بہادروں کا رعب

دنیا میں اکثر قومیں اور اکثر لوگ اپنے رعب سے کامیاب ہوئے ہیں رعب

اپریل ۱۹۰۲ء

کے لئے کچھ ضرورت نہیں کہ بہادری ہی اُس کا باعث ہو۔ ہر اعلیٰ صفت کمالی جب عموعی درجہ سے بڑھ جائے۔ اپنا ایک خاص رعب رکھتی ہے جس سے بڑے بڑے بہادروں کے ہاتھ پاؤں میں لرزہ پڑ جاتا ہے اور بادشاہوں تک کے حوصلہ پست ہو جاتے ہیں۔

حضرت ابراہیم خلیل اللہ کی بی بی جناب سارہ جب فرعون کے محل میں گئی ہیں اور فرعون نے دست درازی کا قصد کیا ہے۔ تو اُس کے ہاتھ پاؤں رہ گئے یہ عصمت و عفت کا رعب تھا جس نے اپنی معجز نمائی سے دنیا کے ایک شہنشاہ اعظم کو بے دست و پا کر دیا۔

روم کے ایک مسیح دشمن نے مدینہ میں آکے حضرت عمر کو بے تکلفی کے ساتھ ایک درخت کے نیچے سوتے دیکھا اور قصد کیا کہ تلوار کے ایک وار سے آپ کا کام تمام کر دے۔ مگر اُسے وہاں کوئی ایسا قدرتی پہرہ نظر آیا۔ کہ اُس کے ہوش جاتے رہے۔ یہ عدالت و اتقا کا رعب تھا جس نے ایک بہادر دشمن کا حوصلہ پست کر دیا۔

رعب کے اس قسم کے نمونہ نے جن کو زیادہ تر پاک نفسی اور اخلاق حسنہ سے تعلق ہو۔ اُنھیں لوگوں کے ساتھ مخصوص ہیں جن کے روحانی کمالات اس اعلیٰ درجہ کو پہونچ گئے ہوں کہ اُن کی نیک نفسی اور نیک نہادی کا رعب ایک معجزے یا کرامت کے عنوان سے نمایاں ہو۔

لیکن شجاعت کو چونکہ حریف کے کمزور دل پر اثر ڈالنے سے خاص تعلق ہے۔ اس لئے اس کے نمونہ دنیا کے اکثر بہادروں کی ذات سے نمایاں ہوں۔ اور آج تک ظاہر ہوا کرتے ہیں۔ ہر قسم کے نمونہ جس قدر رومیوں کی تاریخ میں ملتے ہیں اور کہیں نہیں ملتے۔ جس کی وجہ ہمارے نزدیک یقیناً یہ ہے کہ اپنے جزئی اور تفصیلی واقعات جس قدر رومیوں نے صفحات تاریخ پر درج کر دئے ہیں۔ اور کسی پرانی قوم کے حالات نہیں درج ہو سکے۔

حضرت مسیح سے تقریباً اسّی برس پیشتر رومیوں میں سب سے نامی گرامی افسر قیوس ماریوس زکئی لیس میرلیس اٹھا جو ایک معمر و سن رسیدہ شخص تھا۔ مگر دوسرا

رومی سردار سلّا یا اسی میں اُس کے خلاف ہو گیا۔ اور اپنے لشکر کے ساتھ دارالسلطنت رومنۃ الکبریٰ میں گھس آیا۔ اور ایسا زور باندھا کہ ماریوس کو جو بڑے بڑے میدانوں میں جوہر شجاعت دکھا چکا تھا گھر چھوڑ کے بھاگنا پڑا۔ اُس کے جاتے ہی یہاں اُس کا نام دشمنانِ ملک اور واجب القتل لوگوں کی فہرست میں درج کر کے شائع کر دیا گیا۔

ماریوس روم سے بھاگ کے شہر اوسطیا (اوسٹیا) میں پہونچا۔ اور جہاز پر بیٹھ کے افریقہ کی راہ لی۔ مگر قسمت دشمنی پر آمادہ تھی۔ بجائے اُس کے کہ جہاز بحر روم کے اُس پار جا سکے بادِ مخالف نے اطالیہ ہی کے ساحل پر لا کے پھینک دیا۔ اور قرقیا (سرسیا) کے قریب وہ سمندر کے کنارے قریب بہ ہلاکت تھا۔ کہ ایک مچھلی والے کے جھونپڑے میں پناہ مل گئی۔ مگر ایک اولوالعزم شخص کو ایسی ذلیل حالت میں بھلا کیونکر چین آ سکتا تھا۔ آخر وہ بھاگ کے من طورنا کی ترائی کی طرف بھاگا۔ اور ایک دلدل میں جا پڑا۔ جس کے اندر گلے گلے تک دفن ہو گیا۔ اس حالت میں دشمنوں نے آلیا۔ دلدل سے کھینچ کے باہر نکالا۔ اور مجسٹریٹ کے اجلاس میں پیش کر دیا۔ مجسٹریٹ نے حکومت روم کے اعلان کے مطابق اُس کے قتل کا حکم دیا۔ کیونکہ جو شخص اُس کا سر لائے اُسے بہت بڑے انعام کے ملنے کی اُمید تھی۔ غرض وہ قتل کے لئے ایک تیرہ و تار قید خانہ میں بند کر دیا گیا۔ کہ مناسب موقع پر سر کاٹ لیا جائیگا۔ اور ایک سپاہی اُس کی خدمت پر مامور ہوا کہ قید خانہ میں گھس کے اُسے قتل کرے اور اُس کا سر کاٹ لائے یہ شخص گھسنے کو تو قید خانہ میں گھس گیا۔ مگر ماریوس کے خوف سے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ اور آگے قدم بڑھانے کی جرأت نہ ہوتی تھی۔ اتنے میں اندھیرے کے اندر اُسے زمین پر ماریوس کی آنکھیں آگ کی چنگاریوں کی طرح چمکتی نظر آئیں۔ اور رہے سہے حواس بھی جلتے رہے اب اُس کی طبیعت قابو سے بالکل باہر تھی۔ کہ ماریوس نے جو زمین پر چت پڑا ہوا تھا۔ بھاری اور مہیب آواز میں ڈانٹ کے کہا: "تجھے اتنی جرأت ہو سکتی ہے کہ قیوس ماریوس کو قتل کرے؟" اب اس سپاہی میں ٹھہرنے کی تاب نہ تھی۔ نہایت ہی بد حواسی کے ساتھ اُلٹے پاؤں بھاگا۔ اور زبان پر یہ الفاظ جاری تھے "میں قیوس ماریوس کو نہیں قتل کر سکتا۔ میں قیوس ماریوس کو نہیں قتل کر سکتا!"

اُس کی یہ حالت دیکھ کے شہر کے مجسٹریٹ بھی گھبرائے۔ اور کچھ ایسے مرعوب ہوئے کہ ایک دوسرے سے کہا "اسے اس کی قسمت ہی پر چھوڑدو۔ تاکہ غیر ممالک میں جا کے قسمت آزمائی کرے۔ شاید ہمارے اس کارِ خیر سے دیوتا ہم پر مہربان ہو جائیں"
یہ کہہ کے اُسے چھوڑ دیا۔ ماریوس یہاں سے چھوٹ کے جزیرۂ اینی رہا میں پہونچا۔ اور اب قسمت نے اتنی موافقت کی کہ وہاں چند احباب مل گئے۔ جن میں اُس کا بیٹا بھی تھا اور اُن کے ساتھ جہاز پر سوار ہو کے اُس نے افریقہ کی راہ لی اُس کا جہاز جیسے ہی پرانے شہر قرطاجنہ (کارتھیج) کے کھنڈروں کے سامنے پہونچا وہاں کے رومی حاکم سنکس طی لیوس (سکسٹی لیس) کا پیام آیا کہ "اگر تم نے زمین پر قدم رکھا تو سزائے قتل دیجائیگی"
یہ پیام سُن کے ماریوس کو غصہ آگیا۔ اور اُس شخص سے جو پیام لایا تھا کہا "اُس سے جا کے فقط اتنا بیان کر دینا کہ قرطاجنہ کے کھنڈروں میں تم نے قبوس ماریوس کو بیٹھے دیکھا ہے۔

یہ جواب سُن کے پھر حاکم افریقہ کو دوبارہ کسی کے بھیجنے کی جرأت نہ رہی۔ مگر ماریوس بھی یہاں نہیں ٹھہرا۔ بلکہ اپنے بیٹے کے ساتھ جا کے جزیرۂ قرقنیا میں لنگر انداز ہوا۔ یہاں زیادہ نہیں ٹھہرنے پایا تھا۔ کہ روم میں اُس کے طرفداروں اور دوستوں کا پھر زور ہوا۔ جنھوں نے اُسے بلوایا۔ اس مصیبت کے زمانہ میں اس نے زمانہ اور ابنائے زمانہ کے ہاتھوں سے ایسے ایسے بے رحمی کے سلوک دیکھے تھے۔ کہ اس کا دل بھی سخت ہو گیا تھا۔ اور اب کی جو روم میں پہونچ کے وہ برسرِ حکومت ہوا۔ تو بے انتہا مظالم کیے۔ اور اُس کے حکم سے ایسی سخت خونریزی ہوئی کہ اس سے پیشتر کبھی نہیں دیکھی گئی تھی۔

## یا آصف الدولہ ولی

لکھنؤ کے اکثر دوکاندار صبح کو بوہنی کرتے وقت "یا آصف الدولہ ولی" کہہ کے نواب آصف الدولہ مرحوم کا نام لیا کرتے ہیں۔ لیکن یہ کسی کی سمجھ میں نہ آیا ہوگا۔ کہ آصف الدولہ کو ولایت کیونکر اور کس سے ملی تھی۔ نواب مرحوم نے اپنی یادگار کے طور پر امام باڑہ کی ایک ایسی لاجواب عمارت چھوڑی ہے۔ جو دنیا کی بہت ہی منتخب

عمارت اور اعجوبۂ روزگار ہے۔ اُس کی تعمیر قحط کے زمانہ میں صرف رعایا پروری کیلئے ہوئی تھی اور محض اس خیال سے کہ شریف محتاجوں کو بھی نفع اُٹھانے کا موقع ملے راتوں کو بھی عمارت کا کام جاری رکھا جاتا تھا۔ لیکن ولی بننے کے لئے اتنا ہی کافی نہیں ہے خصوصاً جب ہم دیکھتے ہیں۔ کہ نواب آصف الدولہ مرحوم نے اپنے ۲۲ سال کے زمانۂ حکمرانی میں اپنی ماں بہو بیگم صاحبہ کو جن میں رابعہ بصری کے سے صفات موجود تھے بہت ستایا۔ اور ہمیشہ آزردہ رکھا۔ ایسے رزیل لوگوں سے صحبت تھی اور ایسے شرمناک افعال تھے۔ کہ ادنی طبقہ کے لوگوں کو بھی سن کے حیرت ہو جاتی تھی ایسے ایسے شخص کا عوام کے معتقدات میں ولی بن جانا تعجب سے خالی نہیں ہے۔ مگر مسٹر ولیم ہوئی کی کتاب "ممائرز آف دی اینڈ فیض آباد" کو پڑھ کے جو کہ تاریخ "فرح بخش" کا ترجمہ ہے۔ ہمیں آصف الدولہ کی ولایت کی اصلی بنیاد معلوم ہوگئی۔ یہ ہم جانتے ہیں۔ کہ ایسی باتوں کو آجکل کے لوگ تسلیم نہ کرینگے۔ مگر سُن رکھنا دلچسپی سے خالی نہیں ہے۔

آصف الدولہ کی ولایت کا حال لوگوں کو اُن کی وفات کے وقت معلوم ہوا کیونکہ ایک برس پہلے سے اُنھیں اپنی موت کا یقین ہوگیا تھا حتیٰ کہ شاہ ایران زماں شاہ کی نسبت افواہ اڑی کہ ہندوستان پر چڑھائی کرنے والا ہے تو آصف الدولہ نے صاف کہدیا کہ اُس کو ملک کے تمام لوگ دیکھیں گے مگر میں نہ دیکھونگا میں اُسوقت تک زندہ ہی نہ رہونگا۔ یہ راز کہ آصف الدولہ کو اپنی موت کا وقت کیونکر معلوم ہوگیا تھا مندرجۂ ذیل قصہ سے کھلیگا۔

دہلی میں ایک برہمن تھا جو نہایت ہی فلاکت و غربت میں مبتلا تھا۔ اور اس پر قیامت یہ کہ دو کنواری بیٹیاں بیاہنے کو بیٹھی ہوئی تھیں چنانچہ اس نے ہر ہندو مسلمان کے سامنے جا کے دست سوال پھیلایا۔ اور شہر کے تاجروں اور مہاجنوں سے بھیک مانگتا پھرا۔ مگر کسی نے اُس پر ترس نہ کھایا۔ اور کچھ کفالت نہ کی۔ آخر مایوس ہو کے اُس نے جنگلوں اور پہاڑوں کی راہ لی۔ پھرتے پھراتے جمنا کی پہاڑیوں کے اس پار چلا گیا اور شکستہ حالی کے ساتھ مارا مارا پھرنے لگا۔ یہاں تک وہ ایک ایسے مقام پر پہونچا۔ جہاں بڑے بڑے سایہ دار درختوں کا گھنا جنگل تھا

اور کئی منزلوں تک آسمان بھی نہ دکھائی دیا۔ اس تاریک جنگل کے عین درمیان میں اُسے ایک پختہ عمارت نظر آئی جسے دیکھکے وہ متحیّر ہوا۔ اور اُس کے گرد چکر لگانے لگا۔ آخر ایک کھڑکی ملی۔ جسے اُس نے بڑی مشکلوں سے کھولا۔ اور اُس عمارت کے اندر داخل ہوا۔ وہاں چاروں کونوں پر اُسے چار ایسے شخص نظر آئے جو مراقبہ میں تھے۔ اور خدا کے دھیان میں غرق معلوم ہوتے تھے اور دنیا و ما فیہا سے بیخبر۔ آخر وہ تھک کے ایک جانب بیٹھ گیا۔ جب رات ہوئی تو اُن چاروں نے مراقبہ سے سر اُٹھائے۔ اور قوت لایموت بہم پہونچانے کیلئے اُٹھے۔ حسب معمول سوئی میں کھانا تیار کیا اور جب کھانے کا وقت آیا تو سب نے پانچواں حصّہ نکال کے اُس تازہ وارد مہمان کو دے دیا۔ کھانے سے فارغ ہو کے اُنھوں نے ہاتھوں کے اشارہ سے اُس کی کیفیت دریافت کی۔ اور اُس نے اپنی ساری مصیبت اور سرگذشت بیان کر دی۔ یہ سُن کے اُن چاروں میں سے ایک نے ایک بھوج پتّر کا ٹکڑا لے کے اُس پر چند الفاظ لکھ دیئے۔ جو نہ ہندی تھے نہ فارسی تھے نہ عربی تھے۔ پھر وُہ ٹکڑا اُس کے ہاتھ میں دے کے کہا "تم اسے لکھنؤ میں لیجاؤ۔ اور آصف الدولہ جب ہوا کھانے کو باہر آئیں۔ تم اُنھیں دُور سے یہ رقعہ دکھا دینا۔ وہ فوراً تم سے ہاتھ بڑھا کے لے لینگے اور ایک ہزار روپیہ تمہارے حوالے کریں گے"۔ پھر سمجھانے کے طریق پر کہا "جب تم نواب کے قریب جانا اور اُن سے باتیں ہونے لگیں تو تم مرعوب نہ ہونا۔ بلکہ یہ کہدینا کہ اس رقعہ کے لکھنے والوں نے آپ کو پیام دیا ہے۔ کہ آپ کی یہ دنیوی زندگی ختم ہونے کو آئی لہذا جلدی آیئے"۔

اس کے بعد وہ شخص اُسی مکان سے نکلا۔ اور جنگل سے باہر نکل کے پیدل سفر کرتا ہوا لکھنؤ میں آیا۔ آصف الدولہ ایک دن ہوادار پر سوار جا رہے تھے کہ اُس نے دُور سے وہ بھوج پتر کا رقعہ اُنھیں دکھا دیا۔ دیکھتے ہی اُنھوں نے ہوادار کو رکوایا اور اُس برہمن کو پکار کے قریب بلایا۔ رقعہ اُس کے ہاتھ سے لے کے اپنی جیب میں رکھ لیا۔ اور راجہ جھاؤلال کو حکم دیا۔ کہ اس شخص کو فوراً ایک ہزار روپیہ دیدو۔ اور جب تک لکھنؤ میں رہے اس کو اچھی طرح رکھو اور کھلاؤ پلاؤ جب وُہ برہمن نواب کے قریب گیا تو وُہ زبانی پیام بھی پہونچا دیا۔ جسے سن کے نواب نے کہا "

ہاں مجھے معلوم ہے "

راجہ جھاؤلال اُس برہمن کو اپنے گھر لے گئے۔ اور اُس کی زبان سے پورا قصہ سُنا مگر متحیّر تھے کہ یہ کیا راز ہے اس کے بعد جب وہ نواب صاحب سے ملے تو ارادہ کیا۔ کہ خود اُن سے اس راز کو دریافت کریں۔ قبل اس کے کہ ان کی زبان سے کوئی لفظ بھی نکلنے پائے۔ نواب چہرے سے تاڑ گئے اور کہا "دیکھو خبردار۔ اُس برہمن کے متعلق کوئی سوال نہ کرنا میں اس بارے میں کچھ نہ کہونگا۔" اس کے بعد پھر بھی راجہ نے دو ایک سوال اس واقعہ کے متعلق کیئے۔ مگر ہمیشہ۔ ٹوک دیئے گئے۔ اور کچھ حال نہ کھلا۔ اس کے چھ مہینہ کے بعد ایک دن راجہ جھاؤلال اور نواب صاحب تنہا تھے۔ راجہ نے جرأت کر کے عرض کیا "حضور جب سے وہ برہمن آیا ہے میں اُس کے راز سے سخت حیرت میں پڑا ہوا ہوں" نواب آصف الدولہ نے جواب میں صرف اتنا کہا "وہ لوگ میرے بھائی ہیں۔ اور اُس شخص کو میرے پاس بھیج کے انہوں نے مجھے بلا بھیجا ہے" اس کے سوا اور کچھ نہیں کہا۔ اور نواب سے اس سے زیادہ تصریح کرانے کی بھلا کسے جرأت ہو سکتی تھی؟

اس واقعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ نواب آصف الدولہ کو اپنے مرنے کا زمانہ کیونکر معلوم ہو گیا تھا۔ اور انھیں ہندو مرتاض جوگیوں کے ساتھ ایسے تعلقات تھے جو اُس عہد کے مذاق میں سوا کسی ولی کے اور کسی کو نہیں ہو سکتے تھے۔ چنانچہ اسی چیز نے گو کہ وہ ایک بڑی حد تک راز سربستہ رہی نواب آصف الدولہ کو باوجود طرح طرح کی بداعمالیوں کے ولی کامل بنا دیا!

## دوست نما دشمن

ہم دشمنوں سے ڈرتے اور دوستوں پر بھروسہ کرتے ہیں۔ دشمن ہمارے دل کو پریشان و غیر مطمئن رکھتے اور دوست ہمارے دل بیقرار کو تسلی دیتے ہیں جی تو یہ چاہتا ہے کہ دشمنوں سے دنیا خالی ہوتی اور دنیا میں جتنے ہوتے دوست ہی دوست ہوتے۔ لیکن یہ ہماری غلطی ہے۔ کیونکہ دوست دشمن دونوں ہمارے لئے خدا کی برکتیں ہیں۔ دشمنوں سے ہمکو اپنی حفاظت اور حزم و احتیاط کا سبق ملتا ہے اور

دوستوں سے ہمارا تو صدمہ پہنچتا ہے

سچ پوچھو تو دوستوں کی تعداد بہت ہی کم ہے۔ اور دنیا دشمنوں سے آباد ہے اگر کشمکش زندگی کے مسئلہ پر غور کیا جائے۔ تو بخوبی نظر آجاتا ہے کہ دنیا میں جو ہے اسی فکر میں لگا ہوا ہے۔ کہ ہمیں مٹا دے۔ انسان اور درندے ہی نہیں یہ کیڑے مکوڑے اور یہ حجر و شجر سب ہمارے غارت کرنے کی فکر میں ہیں۔ مگر ان کی طرح طرح کی دشمنیوں ہی کو دیکھ کے ہم اپنی زندگی بناتے اپنے جینے کا سامان کرتے اور اپنی عمر بڑھاتے ہیں۔

لیکن خطرناک دشمن وہ ہے۔ جو دوست کی صورت میں آئے اور دوستی کا سامان بہم پہنچا کے ہمارے ساتھ دشمنی کرے۔ انسانوں میں ایسے بہادر کثرت سے ملیں گے جو اپنے دشمنوں پر غالب آئے ہوں۔ اور جس نے بہادری اور ہمت سے کام لیا کبھی دشمن سے مغلوب نہیں ہوا۔ مگر وہ دشمن جو دوست بن کے آتا ہے غالب ہی آتا ہے بڑے بڑے بہادر ایسے ہی دشمنوں کے ہاتھ سے مارے گئے ہیں۔ اور زبردست سے زبردست سورماؤں کو ایسے ہی دشمنوں نے نیچا دکھایا ہے۔

قرآن مجید میں بھی سب سے زیادہ مذمت منافقوں کی کی گئی ہے۔ جو تمہارے پاس آکے تمہارے دوست بنیں اور دشمنوں میں جا کے ان کے جاں نثار بن جائیں۔ دنیا کی تاریخ پر نظر ڈالیے تو معلوم ہو جائے گا۔ کہ دنیا کے بڑے بڑے نامی گرامی بہادر اور نامور شہنشاہ ایسے ہی دشمنوں کے ہاتھ سے مارے گئے ہیں۔

یولیوس یا قیصر جولیس سیزر سے زیادہ بہادر اور زبردست فاتح کون ہوگا؟ کوئی خطرہ اس کے ارادے کو نہ روک سکا۔ اور کوئی دشمن اس کے آگے سر نہ اٹھا سکا۔ مگر اس کی زندگی کا چراغ گل کیا تو اس کے بھروسے کے دوستوں کاسیوس مارقوس بروٹوس اور دقی موس نے جو خاص اس کے لوگ تھے۔ کاسیوس اور بروٹوس کی جانیں اسی نے بچائی تھیں ورنہ وہ کب کے گزشتہ سازشوں کے انتقام میں مارے جا چکے ہوتے۔ دقی موس خاص قیصر کے علم اقبال کے

ئی مگر ابھی گذر نہیں گئی ہے۔"

اس کے بعد جولیس باہر کے دیوان خانے میں آکے کرسی پر بیٹھا۔ اُس کے بیٹھتے
ی پندرہوں سازشیوں نے کرسی کو گھیر کے اپنے حلقہ میں کر لیا۔ پھر اُن میں سے
ب نے بڑھ کے ایک درخواست پیش کی جس میں کوئی ایسی خواہش کی گئی
ی۔ جو کسی طرح منظور نہیں کی جا سکتی تھی۔ چنانچہ قیصر نے اُس کی منظوری
ے انکار کیا۔ لفظ انکار کے ساتھ ہی ایک سازشی نے بڑھ کے چھری ماری۔
م کھاتے ہی قیصر نے مزاحمت میں ہاتھ پاؤں مارنا شروع کئے اور ارادہ کیا کہ
ن قاتلوں کے نرغے سے نکل کے بھاگے۔ لیکن ہوشیار دشمنوں نے نکلنے نہ
ا اور اُس پر ہر طرف سے حربے ہونے لگے۔ یہاں تک کہ چھریاں کھاتے کھاتے
دم ہو گیا۔ اسی حالت میں بروطوس کے چہرے پر نظر پڑی۔ جو دشمنوں میں شریک
ھا۔ بے اختیار قیصر کی زبان سے نکلا "ارے بروطوس تو بھی!" اس کے
اتھ ہی اُسے دنیا میں کچھ ایسی بے وفائی نظر آئی کہ مُنہ چادر میں چھپا
یا۔ پھر بیدم ہو کے جھکا اور پومپئی اعظم کی مورت کے نیچے گر کے دم
ڑ دیا۔

دنیا میں کون تھا جو یولیوس قیصر کو مغلوب کرتا؟ زبردست سلطنتیں
ں سے پناہ مانگتی تھیں۔ اور بڑے بڑے سرکش فرماں روا اُس کے آگے
ر اطاعت جھکاتے تھے۔ کیسا ہی زبردست دشمن ہو اُس کے آگے ہیچ اور ذلیل
ھا۔ لیکن اُسے جس نے مغلوب و مقہور اور بے دست و پا کیا۔ اُس کے دوست
ا دشمن تھے۔ وہ مار آستین تھے۔ جن کے کاٹے کا منتر نہیں۔ اور وہ منافق تھے
ن کی مکاری پر کوئی قوت نہیں غالب آ سکتی۔

مذکورۂ بالا واقعے سے کچھ کم تین سو برس پہلے سکندر اعظم کے حملے کے
قت دارائے عجم اپنے ایسے ہی دوست نما دشمنوں کے ہاتھ سے مارا گیا تھا۔
ارا کو اگرچہ سکندر کے مقابلے میں شکست ہو چکی تھی۔ اور اُسے اپنا دار السلطنت
چھوڑ کے باختر جانا پڑا تھا۔ کہ نئی فوج جمع کر کے لائے۔ اور مغربی حملہ آور کو شکست
ے۔ ممکن تھا کہ اس ارادے میں وہ کامیاب ہوتا۔ کیونکہ جن بہادر نبرد آزماؤں

نے دولت ایران کی عظمت و شوکت قائم کی تھی وہ باختر اور ترکستان ہی کے تھے۔ کوئی تعجب کی بات نہ تھی کہ دارا یہاں کا ایک زبردست لشکر لے کے جاتا اور سکندر کو نامراد و ناکام واپس کرتا۔ اور یہ بات سکندر کی حیثیت اور قدرت سے باہر تھی کہ ایسی قدیم اور اتنی بڑی زبردست سلطنت کا چراغ یوں آناً فاناً گُل کر دیتا۔ مگر سکندر اس اُلو العزمی۔ اس حوصلے اس شجاعت۔ اور ایسی زبردست فوج کے ساتھ دارا کا اتنا بڑا خطرناک دشمن ہرگز نہ تھا۔ جیسے کہ اُس کے دوست اُس کی فوج کے سردار اور اُس کے معتمد علیہ اہلِ دربار جانثار اور وفادار تھے ان نمک حرام اور منافق سرداران عجم نے اپنے کج کلاہ ولی نعمت کو بے دست و پا اور پریشان حال دیکھ کے گرفتار کر لیا۔ اور اپنے ساتھ پابزنجیر لے کے بھاگے اور جب دیکھا کہ یونانی تعاقب کرتے ہوئے سر پر آ پہونچے۔ اور اس بات سے ڈرے کہ ایسا نہ ہو سکندر اپنے صاحب تاج دشمن کے ساتھ رعایت کرے تو نیزے سے ایک کاری حربہ کر کے اور اُسے بسمل چھوڑ کے بھاگ کھڑے ہوئے تاجدار عجم خاک و خون میں لتھڑا ہوا زمین پر پڑا تھا۔ جاں بلب تھا کہ یونانی پہونچے۔ اور سکندر کو خبر کی۔ سکندر سنتے ہی دوڑا گیا۔ بعض کہتے ہیں کہ سکندر کو زندہ ملا۔ اور اُس سے چند حسرت ناک باتیں کر کے دم توڑ دیا۔ اور بعض کہتے ہیں کہ نہیں۔ سکندر کے پہونچنے سے پہلے ہی اُس کی روح مفارقت کر چکی تھی اُسے ایک بے کسی کے ساتھ خاک پر پڑے دیکھ کے سکندر کا دل بھر آیا۔ آنکھوں میں آنسو بھر لایا۔ اپنی قبا اُتار کے اُس پر ڈال دی۔ اور حکم دیا کہ بابل میں لے جا کے نہایت تزک و احتشام سے دفن کیا جائے۔

یہ واقعہ بتا رہا ہے۔ کہ دارا کا اتنا بڑا دشمن سکندر ہرگز نہ تھا۔ بلکہ وہ نمک حرام لوگ تھے۔ جو اُس کے دوست نما دشمن تھے۔

سب سے آخری نظیر سلطان عبد الحمید خاں کی ہے۔ جن کی ہوشیاری اور حکمت عملی کا دنیا کے بڑے بڑے پالیٹشن لوہا مانتے تھے۔ اگرچہ دول یورپ کی قوت اتنی بڑھ گئی ہے۔ کہ یورپ کے اندر کسی اسلامی سلطنت

کا برقرار رہنا نہایت دشوار نظر آتا ہے۔ روس۔ آسٹریلیا۔ اٹلی۔ جرمن۔ فرانس
کے ایسے زبردست دشمن مدتوں اسی ادھیڑبن میں لگے رہے کہ عبدالحمید خاں کو
نیچا دکھائیں۔ مگر کوئی کچھ نہ بگاڑ سکا۔ اور بوڑھے ضعیف ترک نے ہمیشہ اور
ہر موقع پر تند دستوں اور یونانوں کو دے ٹیکا۔ گلیڈاسٹون کوستے رہے۔ گالیاں
دیتے دیتے مرگئے۔ اور عبدالحمید خاں کا کچھ نہ بگاڑ سکے۔ مگر جو دشمنی عبدالحمید خاں
کے ساتھ نہ روس کر سکا تھا۔ نہ آسٹریا کر سکا تھا۔ نہ یونانی کر سکے تھے نہ انکی
وہ دشمنی خود ان کے معتمد علیہ لوگوں اُن کے فوجی افسروں اور اُن کے دوستوں
نے کی جو کہ دوست نما دشمن تھے۔ اور جن پر دولت عثمانیہ کو بھروسا تھا۔

## چند اگلی تمنائیں

اکثر لوگوں کا خیال ہے کہ دعا قبول ہونے اور آرزو برآنے کو وقت اور جگہ سے
تعلق ہے کسی کی آرزو برآتی ہے تو زبان سے نکل جاتا ہے کہ کس گھڑی دعا مانگی
تھی۔ کہ پوری ہی ہو کے رہی؟ یا فلاں متبرک مقام میں دعا مانگی تھی کیوں نہ پوری
ہوتی؟ دعاؤں کا برلانے والا وہ قادر مطلق ہے جو ہر ایک کی سن لیتا ہے اور ہر جگہ
سن سکتا ہے۔ مگر اس میں شک نہیں کہ بعض اوقات اور بعض جگہ التجا کرنے سے
کچھ ایسی خوبی کے ساتھ انسان کی مراد برآتی ہے۔ کہ پھر وہ ہمیشہ دعا
کے لئے مناسب وقت اور موزوں مقام کا جویا ہو جاتا ہے۔

جن دنوں جناب معٰویہ بلا شرکت غیرے خلیفہ اور ممالک اسلام کے
سیاہ سفید کے مالک تھے۔ اُن دنوں مکۂ معظمہ کا واقعہ ہے کہ ایک دن بیت اللہ
شریف میں رسول اللہ کے پھوپھی زاد بھائی زبیرؓ بن عوام کے تینوں بیٹے عبداللہ
عروہ مصعب اور مروان بن حکم کا بیٹا عبدالملک ایک صحبت میں بیٹھے باتیں
کر رہے تھے ان چاروں کا شمار معزز نوجوانان قریش اور صاحبزادگان امت میں
تھا۔ عبداللہ بن زبیر سب میں بڑے تھے اور صحابیت کا فخر رکھتے تھے۔ لیکن
صحابہ میں بھی انھیں یہ خصوصیت تھی۔ اور یہ امتیاز حاصل تھا کہ ام المومنین
عائشہ صدیقہ کے بھانجے ہونے کی وجہ سے اُن کا نشو و نما آغوش نبوت

ورسالت میں اور جناب سرورِ کائنات صلعم کے گھر میں ہوا تھا۔ چونکہ ہجرت کے بعد سال بھر تک مسلمان اولاد سے محروم رہے تھے۔ اور بڑی تمناؤں کے بعد سب سے پہلے مسلمانوں میں جو بچہ پیدا ہوا وہ عبداللہ بن زبیر تھے۔ اس لئے اُن کی ولادت پر مسلمانوں نے بڑی خوشیاں منائی تھیں اور سارا مدینہ تکبیر کے نعروں سے گونج اُٹھا تھا۔ اس کے علاوہ اُن کے ذریعہ سے علوم نبوت کا ایک معتدبہ حصہ بعد والوں کو ملا تھا بہر تقدیر وہ معززین صحابہ میں تھے۔

عروہ بن زبیر اُن کے سگے بھائی تھے۔ اُنھیں صحابیت کی عزت تو نہیں حاصل ہوئی۔ مگر اتنے بڑے صاحب علم وفضل اس پائے کے فقیہہ و محدث اور ایسے عابد و زاہد و متقی و پرہیزگار تھے کہ کبار تابعین میں شمار کیئے جاتے تھے۔ اور علوم دین حاصل کرنے کے لئے لوگ دُور دُور کا سفر کر کے اُن کے پاس آتے اور اُن کے چشمہ علم سے بہرہ یاب ہوتے۔

مصعب بن زبیر بھی اُن کے بھائی تھے اور گو حضرت صدیقہ کے بھانجے نہ تھے مگر ایک جلیل القدر صحابی اور قریش کے شریف گھرانے کے فرزند ہونے کے باعث معزز و محترم مانے جاتے اور اُن کے مزاج میں نفاست اور شجاعت کے وہ ایسے جوہر تھے جو انھیں اقران و امثال سے ممتاز ثابت کر رہے تھے۔

چوتھا شخص عبدالملک حضرت عثمان کے سالے کا بیٹا اور برسرِ حکومت خاندان بنی اُمیہ کا ایک بلند حوصلہ رکن تھا جو بعد کے زمانے میں دنیا کا سب سے بڑا شہنشاہ اور بنی اُمیہ کا سب سے زیادہ زبردست خلیفہ ثابت ہوا۔

مگر اس وقت ان میں سے کسی کو بھی اپنی آئندہ زندگی کی مطلق خبر نہ تھی اور نہ یہ جانتے تھے کہ ہم چاروں میں بعد کو کیسے واقعات پیش آنے والے ہیں اور کیسی سخت خونریزیاں ہونے والی ہیں۔ ان دنوں یہ چاروں نوجوان سیدھے سادے نوجوان قریش تھے۔ لطف و محبت سے باہم ملتے جلتے تھے اور ایک دوسرے کی صحبت سے لطف اُٹھاتے تھے۔ باتوں باتوں میں کسی نے کہا "اچھا آؤ ہم سب اپنی اپنی تمنائیں بیان کریں۔ دیکھیں کون کیا چاہتا ہے۔ اور کس کی مراد برآتی ہے" یہ سُن کے عبداللہ بن زبیر بولے "بھئی میں تو یہ چاہتا ہوں کہ حرمین (مکہ مدینہ کا) حاکم ہوجاؤں

اور عثمان خلافت میرے ہاتھ میں ہو۔" اُن کے سوتیلے بھائی مصعب بن زبیر نے کہا "اور میری تمنا یہ ہے کہ عراقین (عراق عرب و عراق عجم) کا حاکم ہوں۔ اور قریش کی دونوں معزز خاتونیں سکینہ بنت حسین اور عائشہ بنت طلحہ میری بیبیاں ہوں۔" عبد الملک بن مروان بولا "میری آرزو تم دونوں سے بڑھی ہوئی ہے۔ میں تو چاہتا ہوں کہ ساری دنیا کا بادشاہ ہو جاؤں اور معاویہ کا جانشین بنوں۔" ان تینوں کی آرزوئیں سن کے عروہ بن زبیر بولے "میرے دل میں تم لوگوں کی سی دنیوی ہوسیں نہیں۔ میں تو بس اتنا چاہتا ہوں کہ دنیا میں زہد و تقویٰ کے زیور سے آراستہ رہوں۔ عقبےٰ میں جنت نصیب ہو۔ اور اُن لوگوں میں شمار کیا جاؤں جن سے علوم دینیہ کی اشاعت ہو۔"

چاروں نے اپنی اپنی آرزوئیں خدا جانے کس مقبولیت کی گھڑی میں ظاہر کی تھیں کہ محروم کوئی نہیں رہا۔ جو جس چیز کو چاہتا تھا اُسے ضرور حاصل ہوئی۔ یزید بن معٰویہ کے بعد عبد اللہ بن زبیر مدت تک حرمین کے حاکم رہے۔ خلافت کا دعویٰ کیا۔ اور مسلمانان عرب نے اُن کے ہاتھ پر بیعت کی۔ مصعب بن زبیر اپنی آرزو کے مطابق بھائی کی طرف سے عراقین کے حاکم اور والی ہو گئے۔ اور دولت مندی کے زمانے میں جناب سکینہ بنت حسین اور عائشہ بنت طلحہ دونوں اُن کے عقد نکاح میں آئیں۔ عبد الملک کی مراد بھی خدا نے پوری کر دی۔ یزید کے بعد دمشق میں مروان خلیفہ بن گیا اور اُس کے بعد عبد الملک بن مروان کو خلافت ملی جس نے عبد اللہ بن زبیر کو شہید کر کے ایسے زور و شور سے خلافت کی کہ چین سے اندلس تک اُسی کا حکم چل رہا تھا۔ اور جو حصۂ ارض اُس کی قلمرو سے باہر تھا۔ وہاں کے سلاطین بھی اُس سے ایسے خائف و ترساں تھے کہ غالباً یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ وہ ساری دنیا کا بادشاہ تھا۔ رہے عروہ بن زبیر انھوں نے بعد کے جھگڑوں میں ذرا بھی دخل نہیں دیا۔ دین کی پیروی کرتے تھے اور دین کی تعلیم دیتے تھے۔ صحابہ کی بتائی ہوئی حدیثوں اور علوم رسالت کو بعد والوں میں پوری امانت داری کے ساتھ پہونچاتے تھے۔ انھیں نہ بھائی سے سروکار تھا اور نہ عبد الملک سے۔ نہ عبد اللہ بن زبیر کے ساتھی تھے اور نہ عبد الملک کے مخالف۔ جس کا نتیجہ یہ تھا کہ ان کے بھائیوں کا قاتل اور تمام اکابر صحابہ کا دشمن عبد الملک اکثر کہا کرتا جو

کوئی چاہتا ہو کہ کسی جنّتی شخص کو دیکھے تو وہ جا کے عُروہ بن زبیر کا چہرہ دیکھ لے۔ عُروہ عبداللہ بن زبیر کے سگے بھائی تھے۔ اس لئے غیر ممکن ہے کہ عبدالملک اُن سے کھٹکتا نہ ہو۔ مگر اُن کی بے نفسی و پرہیزگاری کا وہ بھی معترف تھا سچ کہتے ہیں کہ ع "الفضلُ ما شہدت بہ الاعداءُ" (حقیقی فضیلت وہی ہے۔ جس کے دشمن بھی معترف ہوں)

## ہندوستان کا ایک دلچسپ مناظرہ

مسلمانوں میں یا تو علم و فضل کی یہ حالت تھی کہ بڑے بڑے زبردست بادشاہ اور خلفا بھی مخالف کی ہر بات کو سنجیدگی و متانت سے سُنتے اور اُس پر غور کرتے تھے اور علما کی صحبت روشن دلی کا آئینہ ہوتی تھی نہ مرغوں اور بٹیروں کی پالی۔ مگر جب ہندوستان میں وہ پرانی علمی برکتیں فنا ہو گئیں تو اُن کی علمی محفلوں اور تحقیق و تدقیق کی صحبتوں نے جہالت کے دنگلوں کی صورت اختیار کر لی۔ چنانچہ اسی کا ایک دلچسپ نمونہ یہ ہے۔

دلگداز کے گذشتہ نمبر میں ہم دکھا چکے ہیں۔ کہ شجاع الدولہ کے زمانہ میں فیض آباد کیسا بارونق شہر ہو گیا تھا اور ہندوستان کے تمام باکمال اُس کی سواد میں کس کثرت سے جمع ہو گئے تھے۔ جہاں اور لوگ تھے۔ وہاں پانچ حاذق اور پابند شرع طبیب بھی تھے۔ جو دہلی سے آ کے نواب شجاع الدولہ۔ اُن کی بی بی بہو بیگم صاحبہ اور اُن کی والدہ مخدّرہ کی سرکاروں میں بڑے بڑے بھاری درماہوں مقرر تھے۔ نواب شجاع الدولہ کے انتقال کے بعد بھی بیگموں کی سرکاریں قائم رہیں۔ اور وہ اطبا انھیں سے وابستہ اُسی شہر میں مقیم رہے۔ انھیں میں ایک صاحب علم اور سن رسیدہ طبیب حکیم معالج خاں تھے۔

ان دنوں یہاں ایک اعلیٰ درجے کے صاحب علم ملّا مولوی محمد منیر تھے۔ جو فارسی اور عربی کتابوں کا درس دیتے۔ اور اُن سے تعلیم پانے کے لئے شہر میں بہت سے طلبا کا ہجوم رہتا۔ ان مولوی صاحب کو بہو بیگم صاحبہ کے خواجہ سرا اور اُن کے داروغہ جواہر علی خاں کی سرکار سے محض علمی خدمت کے طور پر کچھ ماہوار ملتی تھی جواہر علی خاں اُن کے علم و فضل کا بڑا معترف تھا۔ یہ خواجہ سرا اس زمانے میں فیض آباد کا سب سے

بڑا صاحب اقتدار اور صاحب اثر شخص تھا۔ فوج اور توپ خانے سب اُس کے زیر حکم تھے۔ اور گویا سارے شہر پر اُسی کی حکومت تھی۔ حکیم معالج خاں کو چونکہ فن طب کے علاوہ اپنے علم پر بھی غرہ تھا۔ اسلئے اُن سے اور مولوی محمد منیر سے چشمک ہو گئی۔ اکثر صحبتوں میں وہ مولوی صاحب پر کوئی نہ کوئی اعتراض جمادیا کرتے۔ اور ہمیشہ عیب چینی میں مصروف رہتے۔ یہ بات جواہر علی خاں کو ناگوار ہوئی۔ اُس نے کئی بار حکیم صاحب کو سمجھایا۔ مگر انھوں نے عیب گیری سے زبان نہ روکی۔ اسی اثنا میں ایک بڑے زبان آور ایرانی مغل جو ملا عبدالمجید کے نام سے مشہور تھے۔ فیض آباد میں وارد ہوئے۔ اُن سے اور مولوی محمد منیر سے راہ و رسم بڑھا۔ تو حکیم معالج خاں صاحب اُن دونوں شخصوں پر طعن و تشنیع کرنے لگے۔ آخر جواہر علیخاں اس کے درپے ہوا۔ کہ کسی موقع پر حکیم صاحب کو ملا صاحب کے مقابلے میں زک دلوا کے ذلیل کرائے۔

اتفاقاً حکیم معالج خاں نے کسی صحبت میں اپنا یہ عقیدہ ظاہر کیا کہ "امام زین العابدین کے صاحبزادے زید بن علی شہیدوں میں شامل نہیں ہیں۔ اس لئے کہ انھوں نے امام زمانہ امام محمد باقر سے بغاوت کر کے خروج کیا تھا" یہ مسئلہ جواہر علی خاں نے ملا عبدالمجید سے دریافت کیا۔ انھوں نے کہا "زید کی شہادت یقینی ہے اور اس سے انکار کرنا ہرگز درست نہیں ہے" عجمی ملا صاحب کا یہ قول حکیم معالج خاں نے سنا تو دعوے سے کہا "میں احادیث ائمہ سے ثابت کردوں گا کہ زید کو شہید نہ کہنا چاہیئے"

آخر کار مناظرہ قرار پا گیا۔ اور یہ ٹھہری کہ ماہ ذی قعدہ ۱۱۹۳ھ کی گیارھویں

---

ع۔ حضرت زید نے امامت کا دعوے کیا تھا اور کہتے تھے کہ کچھ ضرور نہیں کہ ایک وقت اور ایک شہر میں ایک ہی امام ہو۔ جائز ہے کہ دنیا میں ایک ہی زمانے میں دو یا زیادہ امام ہوں۔ حضرت علی کو خلفائے ثلثہ سے افضل مانتے تھے اور کہتے تھے کہ جائز ہے کہ کوئی کم فضیلت والا اپنے سے افضل کو چھوڑ کے امام ہو جائے۔ اور اس بنیاد پر وہ خلفائے ثلثہ کی خلافت کو جائز بتاتے تھے۔ عبدالملک بن مروان کے زمانہ میں انھوں نے اپنے پیرووں کے ساتھ علم امامت بلند کیا۔ مگر ساتھ والوں نے دغا کی۔ چھوڑ کے چلے گئے۔ اور عبدالملک نے انھیں گرفتار کر کے مصلوب کیا۔ پہلا شیعہ فرقہ زیدیہ ہیں۔ اور آجتک عرب اور یمن پر کثرت سے موجود ہیں۔

تاریخ بہادر علی خاں خواجہ سرا کے مکان میں یہ دونوں حضرات جمع ہو کے ایک دوسرے کے مقابل اپنے دعوے کو ثابت کریں۔ روز مقررہ کو بہت سے آدمی مناظرہ سننے کے لئے جمع ہو گئے۔ اور بڑی بھاری محفل مرتب ہو گئی۔ سب سے پہلے جواہر علی مولوی محمد منیر کو مع اُن کے طلبا اور طرفداروں کو لے کے آیا اور باہر پھاٹک پر اُس کی فوج کے تقریباً دو سو سپاہی کھڑے ہو گئے۔ اندر بھی بہار علی خاں اور جواہر علی خاں کے دو تین سو ملازم موجود تھے۔ ان کے علاوہ بہت سے شہر والے بھی بحث سننے اور تماشا دیکھنے کو آ گئے تھے۔ الغرض سب ملا کے کوئی پندرہ سولہ سو آدمیوں کا مجمع تھا۔

اتنے میں حکیم معالج خاں ایک کتاب ہاتھ میں لئے ہوئے اپنے مکان سے نکلے۔ جو بیگم صاحبہ کے مکان یعنی اسی عمارت کے پھاٹک کے اندر واقع تھا۔ اُن کے برابر اُن کے صاحبزادے تھے۔ اور شاگردوں کا ایک بڑا غول اُن کے پیچھے تھا۔ یہ سب صاحب آ کے ایک طرف بیٹھ گئے۔ اُن کے بعد ایرانی ملّا آغا عبدالمجید اور اُن کے رفقا کو لے کے متبوع علی خاں خواجہ سرا آیا۔ یہ بھی ایک بڑا زبردست حاکم اور رئیس تھا۔ اور اُس کے ہمراہ بھی اُس کے ملازموں اور مسلح سپاہیوں کا ایک بڑا بھاری غول تھا۔

یہ سب لوگ آ کے اپنی اپنی جگہوں پر بیٹھ گئے اور وقت آیا کہ مناظرہ شروع ہو۔ مگر محفل کا رنگ خطرناک تھا۔ تینوں گروہ مسلح تھے۔ ان لوگوں کو اس کا خیال نہ تھا کہ یہ ایک علمی تحقیق کی صحبت اور اہل علم کا جلسہ ہے۔ کسی گڑھی یا قلعے کا فتح کرنا نہیں ہے۔ ہر گروہ کے سپاہیوں کو صرف اس بات کا خیال تھا کہ ہمارے آقا سے کسی سے تکرار ہو گئی ہے۔ اور آج ہمیں حق نمک ادا کرنا ہے۔ جتنے تھے سب ہتھیار لگا لگا کے اور اوچی بن کے ہو پہنچے تھے۔ اور کتنے مرنے کو تیار تھے تینوں گروہوں کے سپاہی الگ الگ صفیں باندھے کھڑے تھے۔ بندوقیں بھری ہوئی تھیں۔ اور توڑے سلگ رہے تھے۔ یہ عمارت وسیع تھی۔ اور کافی گنجائش رکھتی تھی۔ تینوں طرف محرابیں بنتی چلی گئی تھیں۔ اور بیچ میں کشادہ صحن تھا۔ مگر لوگوں کا اس قدر ہجوم تھا۔ کہ اندر باہر کہیں تل رکھنے

کی جگہ نہ تھی۔ اور سب اس طرح کھچا کھچ بھرے ہوئے تھے۔ کہ سانس
لینا دشوار تھا۔

اب مناظرہ کا تماشہ دکھانے سے پہلے بہتر ہوگا۔ کہ ہم دونوں متقابل
حریفوں کی تصویریں بھی اپنے ناظرین کے سامنے کردیں۔ مولوی محمد بنیر
خاموش تھے۔ اس لئے کہ بحث کرنے کا کام آغا عبدالمجید نے اپنے ذمہ لیا تھا انھیں
صرف خاموش بیٹھ کے دیکھنا تھا۔ آغا صاحب کی یہ شان تھی کہ اول تو وہ ایک
زبان آور یادہ گو مغل تھے۔ دوسرے ایرانی تھے جو ہندوستانیوں کی اپنے سامنے
کچھ ہستی نہیں سمجھتے۔ تیسرے وہ بڑے طمطراق سے باتیں کرتے تھے آواز بلند
تھی اور اس کے ساتھ خوش لہجہ تھے چوتھے ابھی ان کا عنفوان شباب تھا۔ عمر
پورے تیس برس کی بھی نہ ہوگی۔ اور سب سے بڑی بات یہ تھی کہ شہر کے بڑے
بڑے صاحب اثر لوگ ان کے طرفدار تھے برخلاف اس کے ان کے حریف
معالج خاں کی یہ قطع تھی۔ کہ اول تو پستہ قد اور ضعیف تھے۔ اور پیٹھ جھکی ہوئی
تھی۔ دوسرے بوڑھے اور ناتوان تھے۔ تیسرے کئی سال ہوئے۔ انھیں لقوہ مار
گیا تھا۔ جس کی وجہ سے گردن ٹیڑھی ہوکے رہ گئی تھی۔ اور صرف دواؤں کے
زور پر جی رہے تھے۔ بات کرتے وقت گردن کی رگیں پھول جاتیں۔ اور بڑی
دشواری کے ساتھ زبان سے لفظ نکلتا۔ چوتھے ان کی حمایت پر کوئی نہ تھا
بلکہ شہر کے ادنیٰ بازاری لوگ ان کی بڑھاپے کی کمزوریوں اور بگڑی
ہوئی صورت کا مضحکہ اڑاتے۔ اور سب سے بڑا نقصان ان میں
یہ تھا کہ کبھی انھیں کسی مجمع عام میں بحث کرنے کا اتفاق نہیں پیش
آیا تھا۔

مناظرہ کا شروع اور آغاز یوں ہوا کہ آغا صاحب نے گلے پھلاکے۔ فضول طمطراق
اور دم وخم کے ساتھ پوچھا "جناب حکیم صاحب! امام کے فرزند کی شہادت
کے بارے میں جناب کیا فرماتے ہیں؟" جواب دینے کی کوشش میں حکیم
صاحب نے گلے کی رگیں پھلائیں۔ اینٹھی ہوئی زبان کو کئی بے نتیجہ حرکتیں دیں۔
چہرے نے کئی قطعیں بدلیں۔ پھر کچھ دیر تک ہکلائے۔ اور بہت زور لگاکے

کہا "تم اُن پر لعن کرنا درست ہے؟" آغا صاحب "اُس کی دلیل؟" حکیم صاحب نے اُنھیں پہلی دشواریوں اور چہرے کی مضحکانہ تبدیلیوں کے ساتھ کہا "یہ معتبر حدیث ہے" مگر قبل اس کے کہ حدیث کے الفاظ زبان سے نکلیں۔ آغا صاحب نے بات کاٹ کے کہا "معتبر حدیث۔ وہ کون سی حدیث ہے؟" حکیم صاحب کو چونکہ بات کرنا دشوار تھا کاغذ کا ایک پرزہ ملّا کے ہاتھ میں دیدیا اب کسی کو اس کی خبر نہیں کہ اُس پرزے میں کوئی حدیث لکھی بھی تھی یا نہیں اور لکھی تھی تو وہ کون سی حدیث تھی۔ اور نہ کسی نے اُس کاغذ کے دیکھنے کی کوشش کی۔ مگر چالاک ایرانی ملّا صاحب نے وہ پرزہ اپنے پیچھے پھینک دیا۔ اور چلّا کے کہا "میں یہ نہیں جانتا۔ زبانی جواب دیجیئے؟"

اب حکیم صاحب خاموش تھے۔ بدشواری کچھ بولتے بھی مگر جھنجلاہٹ نے رہی سہی زبان بند کردی۔ اُن کے صاحبزادے نے جو برابر بیٹھے تھے باپ کی زبان بند دیکھ کے کچھ لب ہلائے تھے کہ آغا صاحب بولے "تم کون ہو جو بیچ میں بولتے ہو؟" حکیم صاحب اس موقع پر جلدی سے بول اُٹھے یہ میرا بیٹا ہے۔ آغا نے کہا "میں باپ بیٹا نہیں جانتا۔ گفتگو تو مجھ سے آپ سے ہے آپ جواب دیں؟" اب باپ بیٹے دونوں بے زبان تھے۔ اور چالاک آغا صاحب نے بہ آوازِ بلند کہا "حضرات! حکیم صاحب کی بحث پر فاتحہ!" اور یہ کہتے ہی دونوں ہاتھ اُٹھا کے سورۂ فاتحہ پڑھنا شروع کردی۔ فاتحہ سنتے ہی سب لوگ ایک ساتھ اُٹھ کھڑے ہوئے۔ سب کے کھڑے ہو جانے سے اندھیرا ہوگیا۔ گھبراہٹ کے ساتھ لوگ اِدھر اُدھر ٹاپنے لگے۔ کسی کو خبر نہ تھی کہ کون کہاں ہے کون آگے ہے اور کون پیچھے۔ سب ایک دوسرے کو ڈھکیل کے نکلنے کی کوشش کر رہے تھے۔ مگر زور کسی کا نہ چلتا تھا۔ تمام حاضرین پر ایسی بدحواسی طاری تھی کہ نہ آقا نوکر کو پہچانتا تھا۔ نہ نوکر آقا کو۔

اس پردگی یہ ہوئی کہ جو لوگ باہر صحن میں کھڑے تھے وہ سمجھے کہ کسی سے چل گئی۔ اور سب کے سب بے تحاشا اندر گھسنے کی کوشش کرنے لگے۔ مگر راستہ کسی کو نہ ملتا تھا۔ سب ٹھٹھ لگائے کھڑے تھے۔ اور غل مچا رہے

تھے۔ ان کا غل شن کے فوج کے سپاہی جو پھاٹک کے باہر تھے سمجھے کہ اندر کوئی مار ڈالا گیا۔ اور سب کے سب ایکبارگی اندر کیطرف لپکے۔ پھاٹک کھلا ہوا تھا مگر ایک ہی پھاٹک تھا۔ اور ہر سپاہی چاہتا تھا کہ سب سے پہلے پہونچے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سب پھنسے کھڑے تھے۔ اور لوگوں کی پیش قبضیں تلواریں جو لوگوں کی کمروں میں تھیں اور بندوقیں جو ہاتھوں میں تھیں اُن کے ایک دوسرے سے کھٹا کھٹ لڑنے اور اُلجھنے سے عجب شور بلند تھا۔ جتنے تھے پریشان و مضطر تھے اور کسی کا کچھ زور نہ چلتا تھا۔

اُن کی یورش اور مضطربانہ شورش سُن کے سارے شہر میں غل مچ گیا کہ مناظرے میں چل گئی۔ اور دونوں حریفوں کے طرفدار شہر کے ہر کونے ہر محلے سے تلوار۔ چھُری کلہاڑی۔ لاٹھی یا جو ہتھیار ہاتھ میں آگیا لے کے دوڑے۔ اور سب نے بہار علی خاں کے مکان پر دھاوا کر دیا۔ شیخ احمد علی عنبر علی خاں کے دیوانخانے میں تلوئی اور سلون کے راجاؤں اور کئی اور چھوٹے چھوٹے زمینداروں سے بیٹھے معاملہ کی باتیں کر رہے تھے۔ اور کاروبار ریاست میں مصروف تھے۔ ثابت خانی پٹھانوں کے کچھ مسلح سپاہی اُن کے پاس کھڑے ہوئے تھے کہ یکایک غل سُنا اور خبر آئی جواہر علی خاں پر لوگوں کا نرغہ ہے۔ فوراً اُٹھ کھڑے ہوئے اور تین سو مسلح سپاہیوں کو لے کے وہ بھی آپہنچے۔ مگر باہر ہی کھڑے تھے۔ اندر گھسنا غیر ممکن تھا

غرض ایک قیامت بپا تھی اور کسی کو خبر نہ تھی کہ واقعہ کیا ہے بعض دغا بازوں نے مکان کے اندر اندھیرے اور لوگوں کی بدحواسی سے موقع پا کے یہ دغا کی کہ جس کے سر پر ہاتھ پہونچا۔ اُس کی پگڑی اُچھال کے ایک گہرے حوض میں پھینک دی جو پاس ہی تھا اور خشک پڑا تھا۔

جب دیر تک یہ حالت رہی تو اکثر بگڑے دل سپاہیوں نے تلواریں کھینچ لیں۔ اور جب دو چار نے تلواریں کھینچیں تو سب کے ہاتھ اپنے اپنے اسلحہ کے قبضوں پر جا پڑے۔ تلوار۔ خنجر۔ پیش قبض۔ قرابین غرض جو حربہ جس کے پاس تھا اُسے تان کے کھڑا ہو گیا اور اکثر نے پھکیتی کی مشاقی دکھانے کے لئے پینترے

بدل بدل کے چاروں طرف خالی ہاتھ مارنا شروع کر دئے۔

سب سے زیادہ کثرت جواہر علی خاں کے طرفداروں کی تھی۔ اور سب کا خیال تھا کہ جواہر علی خاں پر کسی نے حربہ کر دیا اس بات کو جواہر علیخاں سمجھ گیا اور دل میں خیال کیا کہ جب تک لوگ میری صورت نہ دیکھ لیں گے یہ ہنگامہ موقوف نہ ہوگا یہ خیال آتے ہی وہ ایک اندرونی زینے پر سے ہو کے کوٹھے پر چڑھ گیا اور بالاخانے کے دروازے کھول کے سب کو اپنی صورت دکھائی۔ اور اطمینان دلایا کہ کوئی گھبرانے کی بات نہیں۔ میں خیریت سے ہوں" اُس کی صورت دیکھتے ہی سب نے خوشی کے نعرے بلند کئے اور اطمینان کے ساتھ اپنے اپنے گھروں کی طرف چلے۔ جب کہیں خدا خدا کر کے امن وامان قائم ہوا۔ اور لوگوں کو جانے کا راستہ ملا۔

لیکن طلوع آفتاب سے دوپہر تک اس مناظرے نے فیض آباد میں عجب گرم جوشی اور قیامت خیز پریشانی قائم رکھی۔ ایسا دنگے کا ہنگامہ بپا تھا۔ کہ لوگ مدتوں تک یاد کرتے رہے اور یہ ۱۱ ذی قعدہ ۱۱۹۳ھ کا دن لوگوں کو جب یاد آتا مارے ہنسی کے لوٹ جاتے۔ اس واقعہ پر انشا پردازوں نے زور قلم دکھائے۔ شعراء نے مثنویاں تصنیف کیں۔ اور بھاٹوں نے گیت بنائے۔ جو برسہا برس سال تک فیض آباد کی سڑکوں پر گائے جاتے رہے۔ افسوس اُن میں سے کوئی نظم ہماری نظر سے نہیں گزری۔ ورنہ ضرور نذر ناظرین کرتے۔

## روحانی جاسوس

اگر انسان کا کانشنس درست ہو اور اُس میں سچی جستجوئے حق ہو۔ تو اُس کی روحانی قوت ہی سچی جاسوس بن جاتی ہے۔ یہی قوت ہے جو انبیا و اتقیا میں معجزات و کرامات کی شان دکھاتی ہے لیکن سچ یہ ہے کہ وہ خلاف فطرت چیز نہیں۔ بلکہ روحانی جاسوس ہے۔ جو اکثر بہت سچی مخبری کیا کرتا ہے۔

چنانچہ اس روحانی جاسوسی کی مخبری کا ایک واقعہ یہ ہے کہ معتضد باللہ عباسی ایک دن دوپہر کو سوتے سوتے چونک پڑا۔ گھبرایا ہوا اُٹھا اور خدام کو

آواز دی۔ اور جیسے ہی لوگ حاضر ہوئے حکم دیا کہ اسی وقت دوڑتے ہوئے دجلہ
کے کنارے جاؤ۔ سب کے پہلے جو کشتی ملے اُسے حراست میں کرلو۔ اور ملاح
کو پکڑ کے میرے پاس لاؤ"۔ لوگ گئے۔ اور ایک ملاح کو دیکھا۔ کہ بدحواس اور
گھبرایا ہوا سا ہے۔ اور کشتی کو ایک طرف بھگائے لئے جاتا ہے۔ فوراً اُس
کی کشتی کو روک کے اُس پر پہرہ مقرر کردیا۔ اور اُسے لے کے معتضد کی خدمت
میں حاضر ہوئے۔

اُس کی صورت دیکھتے ہی معتضد نے بڑی ہی زور سے اُسے ڈانٹ بتائی اور
کہا "بدمعاش جلدی بتا کہ جس عورت کو تو نے آج مار ڈالا ہے اُس کا کیا واقعہ
ہے اور سچ سچ بتانا۔ نہیں تو اسی وقت سر اُڑا دوں گا"۔ ملاح خلیفہ کی ڈانٹ سُن
کے سہم گیا۔ اور بولا "امیر المومنین قصور تو ہوا ہے۔ آج صبح میں فلاں گھاٹ پر
تھا۔ کہ ایک نہایت ہی حسین پری جمال عورت میری کشتی پر سوار ہوئی اور فلاں
مقام پر لیجانے کو کہا۔ حسن و جمال کے ساتھ وہ نہایت ہی معزز و دولتمند معلوم
ہوتی تھی اس لئے کہ بہت ہی بھاری کپڑے پہنے تھی۔ اور سر سے پاؤں تک
مرصع زیور سے لدی ہوئی تھی۔ اُس کو تنہا دیکھ کے مجھے لالچ معلوم ہوا۔ کشتی کے
اندر گرا کے فوراً چھاپ بیٹھا۔ وہ چیخنے نہیں پائی تھی کہ منہ بند کر کے گلا گھونٹ
دیا۔ پھر اُس کے کپڑے اور سارا زیور اُتار لیا اور لاش دریا میں بہا دی۔ اس کے
بعد ارادہ کیا کہ ان کپڑوں اور زیور کو گھر پہنچاؤں۔ مگر اندیشہ ہوا کہ اس وقت
اُنھیں لے کے کشتی سے نکلوں گا تو ممکن ہے کہ کوئی راستے میں پکڑ لے اس
لئے کشتی کو سیدھا شہر واسط کی طرف بھگائے گیا دوپہر کو جب دیکھا۔ کہ دریا
کشتیوں سے خالی ہے تو پلٹ آیا اور عنقریب کشتی چھوڑ کے گھر جانے کو تھا۔ کہ ا
لوگوں نے پکڑ لیا"۔ معتضد نے کہا "اور وہ زیور اور کپڑے کہاں ہیں؟" کہا "کشت
کے بیچ میں تختوں کے نیچے رکھے ہیں"۔

معتضد نے خدام کو حکم دیا کہ "اسی وقت جا کے اُن کپڑوں اور زیور کو لے
آؤ اور میرے سامنے حاضر کرو"۔ دم بھر میں وہ سب چیزیں آگئیں۔ اور ملا
نے دیکھتے ہی پہچان کے کہا کہ "ہاں یہی ہیں"۔

اب معتضد کے غصے کی کوئی انتہا نہ تھی۔ اُس ملاح نے جس طرح اُس خاتون کو مارا اور ڈبو دیا تھا۔ اُسی طرح اُسے دجلہ میں ڈبوا دیا اور بغداد میں ڈھونڈی پٹوا دیا کہ "جس گھر کی کوئی جوان عورت آج صبح کو بھاری کپڑے اور زیور پہنے ہوئے فلاں گھاٹ پر جا کے غائب ہو گئی ہو اُس کے لوگ بارگاہ خلافت میں حاضر ہوں۔" دوسرے دن اُس عورت کے گھر والوں نے آ کے اطلاع کرائی۔ فوراً دربار میں بلائے گئے۔ خلیفہ نے اُن سے اُس عورت کی کیفیت و حالت دریافت کی۔ پھر وہ کپڑے اور زیور منگوا کے دکھائے جنھیں اُنھوں نے دیکھتے ہی پہچان لیا۔ تب معتضد نے وہ سب زیور اور کپڑے اُن کے حوالے کئے۔ اور بتایا۔ کہ وہ خاتون شہید ہوئی۔ اُس کی لاش دریا میں بہا دی گئی۔ اور قاتل کو بھی سزا دی جا چکی۔"

اس وقت دربار میں ابو محمد حسین بن محمد صالحی موجود تھا۔ جو اس کارروائی کو اوّل سے آخر تک دیکھتا رہا تھا۔ اُس نے بہ ادب عرض کیا۔ "یا امیر المؤمنین! حضور کو اس واقعہ کی کیونکر اطلاع ملی؟ کیا حضور پر آسمان سے وحی اترتی ہے؟" معتضد نے کہا "کل دوپہر کو میری ذرا یونہیں سی آنکھ لگ گئی تو خواب میں کیا دیکھتا ہوں کہ ایک مقدس و معزز صورت کا پیر مرد جس کے سر کے بال برف کے سے ہیں۔ سفید داڑھی نہایت ہی نورانی ہے۔ اور سر سے پاؤں تک سفید براق کپڑوں میں لپٹا ہوا ہے میرے سامنے آ کے کہہ رہا ہے اے احمد (یہ معتضد باللہ کا اصل نام ہے) اس گھڑی سب سے پہلے جو ملاح دریا میں کشتی لے کے آئے اُسے گرفتار کر لے جس حسینہ کو اُس نے قتل کیا ہے اور اُس کے زیور اور کپڑے لئے ہیں اُس کے قتل کا اقرار کرا۔ اور اُس پر حد شرع جاری کرا۔" یہ سنتے ہی میری آنکھ کھل گئی۔ پھر اُس کے بعد جو کچھ واقعات پیش آئے تم دیکھ ہی چکے ہو۔

یہ پیر مرد جو معتضد کے خواب میں آیا کون تھا؟ یہی [illegible] جاسوس تھا جو ایک مقدس بزرگ کے بھیس [illegible] آیا۔ اور معتضد و اُس کے [illegible]

سے مطلع کر گیا۔

## ایک قاضی صاحب کا فتویٰ

اس سے پہلے نمبر میں ہم فیض آباد کا ایک مذہبی اور علمی مناظرہ دکھا چکے ہیں اب کی یہ دکھانے ہیں کہ انھیں دنوں وہاں ایک قاضی صاحب کے فتوے نے کیسا مزے کا چوکھا رنگ دکھایا۔

شجاع الدولہ کی وفات اور نواب آصف الدولہ کے لکھنؤ چلے آنے کے بعد فیض آباد میں صرف معزز بیگموں کی بڑی بڑی سرکاریں رہ گئی تھیں۔ جن کی ذات سے شہر کی رونق ایک بڑی حد تک برقرار تھی۔ اُن میں سب سے اوّل شجاع الدولہ کی والدہ نواب صدر النسا بیگم صاحبہ کی سرکار تھی۔ دوسری سرکار اُن کی بیوی جناب عالیہ متعالیہ نواب بہو بیگم صاحبہ کی تھی۔ جو سب سے بڑی سرکار تھی۔ تیسری بنی خانم صاحبہ تھی یہ نجم الدولہ کی بیوی تھیں۔ دربار لکھنؤ سے پانچ ہزار ماہوار پاتی تھیں اور اس کے علاوہ بہت سے جواہرات اور لاکھوں روپیہ کا اندوختہ تھا۔ ان تینوں خاتونوں کے علاوہ برہان الملک کے خاندان کی تمام معزز و محترم بیگمیں فیض آباد ہی میں تھیں۔ جن میں سے ہر ایک کی بجائے خود ایک مستقل سرکار تھی۔

بنی خانم صاحبہ نے اپنی کسی پیش خدمت کی بیٹی نور جہان کو بڑی محبت اور لاڈ پیار سے پالا تھا۔ وہ بڑی خوبصورت تھی اور اُس کے ساتھ نہایت ہی شوخ و چالاک۔ جب بڑی ہوئی تو بنی خانم کو اس کی شادی کی فکر ہوئی۔ دروازے پر ایک سید صاحب بچوں کی تعلیم پر نوکر تھے۔ اُنھوں نے اپنے بیٹے میر محمد صالح کے لئے پیام دیا۔ بنی خانم نے اس نسبت کو اس خیال سے پسند کر لیا کہ لڑکی کہیں باہر نہ جائے گی میرے ہی پاس بنی رہے گی۔ اور شادی ہو گئی۔

یہ میر محمد صالح جاہل۔ بدصورت۔ بے عقل۔ متلوّن مزاج اور اللہ میاں کی گائے تھے۔ اور بی بی نور جہاں آفت کی پرکالہ۔ جو بڑی ہوشیار عقل کی پتلی۔ شوخ و شریر

بامذاق وسخن فہم۔ اور اس کے ساتھ بلا کی خود رائے اور ضدی تھی۔ میاں کو خاطر ہی میں نہ لاتی تھی۔ اس نے میاں کی کبھی نوکر سے زیادہ وقعت نہ سمجھی۔ یہاں تک کہ محمد صالح کی جورو ہونے پر شرماتی۔ اور کوئی منہ پر کہدیتا تو بُرا مانتی تھی۔ میاں نے ڈیوڑھی کی خاک اڑادی اور وہ کبھی پاس نہ پھٹکتی۔

چند روز بعد بی خانم نے نورجہان کو اپنے گھر کا داروغہ کردیا۔ اب سارا لینا دینا اسی کے ہاتھ تھا۔ اندر باہر کی مالک تھی۔ روپیہ پیسہ خزانہ اور جواہرات جو کچھ سامان دولت تھا سب اسی کے قبضہ میں تھا۔ اس سے اس کا دماغ اور آسمان پر چڑھ گیا اور میاں سے کسی قسم کا تعلق ہی نہ باقی رہا۔ صورت دیکھنے تک کی روادار نہ تھی۔ بی خانم کے سگے بھائی آغا علی خاں بیرونی کاروبار کے مختار تھے۔ اور محل میں ان کی اکثر آمد و رفت رہتی تھی۔ وہ شوخ ادا نورجہان پر ایک جان چھوڑ سو جان سے عاشق ہو گئے۔ دونوں کا تعلق نوکر چاکروں کے ذریعے باہر مشہور ہوا۔ اور ہر صحبت میں ان دونوں کے ناجائز عشق کا تذکرہ ہونے لگا۔

بی خانم کی سرکار میں ایک اور عورت نوکر تھی جس کا نام ساجدہ خانم تھا۔ اُسے نورجہان نے کسی الزام پر برطرف کردیا۔ وہ محل سے نکل کے اپنے داماد مرزا شیخا کے گھر میں آئی جنھیں بہو بیگم صاحبہ کے خواجہ سرا جواہر علی خاں کی سرکار میں رسوخ حاصل تھا اُس نے داماد کے سامنے اپنا دکھڑا رو تے روتے نورجہان کی آوارگیوں کا ذکر کیا۔ اور کہا "سارا فساد اُسی مردار کا ہے" میرزا شیخا نے یہ سنا تو انتقام لینے کے درپے ہو گئے۔

چند روز پہلے اتفاقاً ایک ایسا واقعہ پیش آیا تھا جس سے جواہر علی خاں اور آغا علی خاں کے دلوں میں کدورت پیدا ہو گئی تھی۔ آغا علی خاں کا ایک حمام جواہر علی خاں کے مکان سے ملا ہوا تھا۔ اور وہیں پر آغا علی خاں کا مکان بھی تھا۔ جواہر علیخاں نے اپنے آرام کے خیال سے کئی بار اُس حمام کی مرمت کرادی تھی۔ ان کے اس تصرف سے آغا علی خاں کو دل میں اندیشہ ہوا کہ یوں ہی مرمت کراتے کراتے جواہر علیخاں اُس پر قبضہ نہ کرلیں۔ اس اندیشہ کے مٹانے کے لئے اُنھوں نے ایک مدت

اپنے آدمی بھیج کے اُس حمام کے روشندانوں کے شیشے اور کھڑکیاں تڑوا دائیں اور جابجا توڑ پھوڑ کے اس قابل ہی نہ رکھا۔ کہ اُس میں کوئی نہا سکے۔ جواہر علی خاں کو یہ دیکھ کے بڑا ملال ہوا۔ ظاہر میں تو خاموش ہو رہا مگر دل میں سوچنے لگا کہ آغا علی سے کیونکر اس کا بدلہ لے۔

اسی سوچ میں تھا۔ کہ مرزا شیخا نے اپنی ساس کا دکھڑا رونے کے ساتھ نور جہاں اور آغا علی خاں کی عشق بازیوں کا حال بیان کیا اور اسی وقت سے نور جہاں اور آغا علی خاں کے عشق کے خلاف سازش شروع ہو گئی۔ مرزا شیخا نے نور جہاں کے شوہر میر محمد صالح کو اکیلے میں بلوا کے کہا "تم بڑے بے غیرت ہو! اپنی جورو کی آوارگیاں اور آغا علی خاں کے ساتھ اُس کے ناجائز تعلقات سنتے ہو۔ اور دم نہیں مارتے!"

محمد صالح نے کہا "میں کیا کروں؟ میرا کچھ زور ہے؟ نہ مجھ میں طاقت ہے۔ اور نہ میرے پاس دولت ہے۔ غریب کی کون سنتا ہے؟ آغا علی خاں قوت اثر روپیہ پیسہ سب ہی کچھ رکھتے ہیں اور میرے پاس کیا ہے؟ پہاڑ کے سامنے تنکے کی کوئی اصل و حقیقت ہے؟" مرزا شیخا نے کہا "اچھا ایک کام کرو۔ ایک عرضی جواہر علیخاں کی معرفت بہو بیگم صاحبہ کے ملاحظہ میں پیش کرادو جس میں یہ سب حال لکھا ہو جواہر علی خاں تمہاری چارہ جوئی بھی کریں گے۔ اور تمہارا کچھ وظیفہ بھی مقرر کرادیں گے۔ دوسری طرف تم یہ کرو کہ قاضی صاحب کے محکمہ میں بھی درخواست پیش کردو۔"

محمد صالح نے فوراً بہو بیگم صاحبہ کی خدمت عرضی دی۔ اور اسی وقت قاضی صاحب کے محکمہ میں رجوع کیا۔ قاضی ایک معمولی درجے کے مفتی تھے۔ اور اُن کی سماعت ہی کون کرتا تھا؟ درخواست دیکھتے ہی ان کا دم نکل گیا۔ بولے "میں آغا علی خاں کے خلاف کیا کرسکتا ہوں؟ مجھے رہنے دو گے یا فیض آباد سے نکلواؤ گے" مگر جواہر علی خاں کی طرف سے انھیں شہ دی گئی۔ اور یقین دلایا گیا۔ کہ آپ فتویٰ تو دیں ہم آپ کی پوری پوری مدد کریں گے۔

اب ایک مناسب موقع پر جواہر علی خاں نے وہ عرضی لے جاکے بہو بیگم صاحبہ کو سنائی۔ اور پورا واقعہ سمجھایا۔ بہو بیگم سے اگرچہ بیجی خانم سے بڑی ملاقات اور

رسم وراہ تھی۔ مگر آغا علی خاں کی اس حرکت پر بہت بگڑیں۔ اور کہا "میں شرع کے معاملے میں کسی کی مروت نہ کرونگی۔ اس معاملے کو قاضی صاحب کے وہاں پیش کرد اور سارے شہر والوں کو بھی خبر کر دی جائے۔ جو خدا رسول کا حکم ہوگا وہی ہوگا"!

یہ سب کچھ ہوا۔ مگر بنی خانم کو ابھی تک کانوں کان خبر نہ تھی۔ آغا علی خاں نے کچھ سن گن پائی مگر یقین نہ آیا کہ میرے مقابلے میں کوئی کاروائی کی جاسکے گی۔

آخر وہ دن آیا جو کاروائی کے لئے مقرر کیا گیا تھا۔ میر محمد صالح صبح صبح نئی درخواست لیے ہوئے قاضی صاحب کے پاس پہونچے۔ اور دادخواہ ہوئے۔ جواہر علی خاں کی شہ تو تھی ہی۔ قاضی صاحب نے فوراً زور شور سے آکے خود آغا علی خاں کی مسجد میں اپنا شرعی اجلاس جمایا۔ اور "بشارت" و "سعادت" نام بہو بیگم کی سرکار کے دو خواجہ سرا بجا آوری احکام کے لئے سامنے دست بستہ کھڑے ہوگئے۔ اب قاضی صاحب نے شرع کے مطابق فتویٰ دیا۔ اور اس فتویٰ کی بنا پر ایک قطعی حکمنامہ لکھ کے ان دونوں خواجہ سراؤں کے ہاتھ بنی خانم کے پاس بھیجا کہ "نورجہاں اسی وقت اپنے شوہر میر محمد صالح کے حوالے کر دی جائے۔ جو ہماری عدالت میں دادخواہ ہوا ہے تعمیل حکم میں اگر تاخیر ہوئی۔ تو سلطان محل میں گھس کے زبردستی حکم شرع کی تعمیل کرائیں گے۔

بنی خانم اس وقت تک واقعات سے بے خبر تھیں یہ حکمنامہ پہونچا۔ تو ششدر رہ گئیں۔ اور برافروختہ ہو کے بولیں "ایں! محمد صالح کی بھی اتنی مجال ہوئی کہ موا میری مرضی کے خلاف کہیں درخواست دے! اور یہ قاضی موا دیوانہ تو نہیں ہوگیا۔ نورجہاں اور محمد صالح دونوں میرے نوکر ہیں۔ اور میں اُن کی مالک ہوں۔ جو چاہونگی کرونگی۔ مونڈی کاٹا قاضی بیچ میں دخل دینے والا کون ہے" یہ کہہ کے حکمنامہ ہاتھ سے پھینک دیا۔ اور پروا بھی نہ کی۔

خواجہ سراؤں نے جیسے ہی واپس آکے یہ حال بیان کیا قاضی صاحب نے بے تحاشا غل مچایا "دین محمد! مسلمانوں دین اسلام کی مدد کو دوڑو! اور میرا ساتھ دو! اب کیا تھا جس نے سنا مرنے اور جان دینے پر تیار ہوگیا۔ اس وقت گرد و پیش جواہر علی خاں کی فوج کے لوگ تھے۔ جو کالی وردیاں پہنے ہوئے تھے

اُنھوں نے وردیاں اُتار اُتار کے پھینک دیں۔ اور سفید کپڑے پہن کے موجود ہو گئے۔ قاضی صاحب نے دین محمدی کا جھنڈا بلند کیا۔ اور بہت سے بے فکرے کندھوں پر جھنڈے رکھ رکھ کے آگئے۔ غرض ہزاروں کا غول جمع ہو گئے۔ "دین! دین!" کے نعرے لگاتے ہوئے بنی خانم کے مکان کی طرف چلے۔ آخوند احمد علی اپنا دربار جمائے بیٹھے تھے اور کچھ پیدل فوج اُن کے ساتھ تھی۔ دین دین کے نعرے سنتے ہی وہ بھی اُٹھ کھڑے ہوئے۔ اُن کے بہت سے بھائی بند اور شہر کے خوش باش اُن کے غول میں آملے۔ اور وہ کوئی تین سو آدمیوں کے ساتھ قاضی صاحب کے لشکر مجاہدین میں آکے شریک ہو گئے۔ آگے بڑھے تو بہت سے تماشائی ہندو مسلمان بھی آملے۔

الغرض یہ ہزارہا مجاہدین کا پُرشور گروہ بنی خانم کی محلسرا کے قریب پہونچا۔ سڑک تنگ تھی۔ اور مجمع اس قدر زیادہ تھا کہ لوگ گھسے اور کھچے ہوئے جارہے تھے۔ ہتھیاروں کے لے چلنے کی گنجائش نہ ہونے کی وجہ سے سب لوگ ڈھالوں اور تلواروں کو ہاتھ سے اوپر اُٹھائے اور سروں کے اوپر بلند کیے ہوئے تھے۔

بنی خانم کی ڈیوڑھی پر اس وقت ڈیڑھ سو سپاہی تھے جو اُن کے ملازم تھے۔ اُنھوں نے جو ساری خدائی کو اپنے اوپر نرغہ کر کے آتے دیکھا۔ تو جانیں لے لے کے بھاگ کھڑے ہوئے۔ میدان صاف دیکھ کے ان لوگوں نے محلسرا گھیر لی خواجہ سرا محل کے اندر گھس گئے۔ اور نور جہاں جس جگہ بیٹھی تھی وہاں پہونچ کے اُسے گود میں اُٹھا لیا۔ اور باہر لا کے ایک ڈولی میں بٹھا کے پردہ باندھ دیا اور بڑی شان و شوکت سے لے کے واپس چلے۔ بنی خانم یہ تماشا دیکھتی رہ گئیں اُن کے بنائے کچھ نہ بنی۔ آغا علی خاں اپنے گھر میں جا کے چھپ رہے جو بنی خانم کی محلسرا کے پچھواڑے تھا۔ اور نور جہاں کو مجاہد بلوائیوں نے لا کے خرم خواجہ سرا کے مکان میں بند کر دیا۔

اب مجمع منتشر ہو گیا۔ لوگ اپنی دینی کامیابی اور زبردست غزا پر فخر کرتے ہوئے گھروں کو گئے۔ قاضی صاحب نے اجرائے حکم شرع کے صلے میں جواہر علی

خاں کی سرکار سے بھاری دوشالہ پایا اور شوہر آبدار محمد صالح کو پچاس روپیہ دیے گئے کہ گھر گرہستی کا سامان درست کرے اور اپنی جورو کو رکھے۔ مگر نورجہاں میاں کی منحوس صورت و قطع دیکھ کے کچھ ایسی جھنجھلائی۔ اور ضد بائی ہوئی تھی کہ اتنی آفت بھگتنے پر بھی محمد صالح کو چلا چلا کے کوستی اور گالیاں دیتی تھی اور کسی کی کچھ پروا نہ کرتی تھی۔

تین چار روز کے بعد وہ جواہر علی خاں کے حکم کے مطابق خرم کے مکان سے نکال کے ایک دوسرے مکان میں پہنچا دی گئی۔ جو عنبر علی خاں کے اصطبل سے ملا ہوا تھا اس اصطبل میں جواہر علی خاں کے گھوڑے اور سائیس رہتے تھے۔ اس وقت تک نورجہان میاں کو اٹھتے بیٹھتے گالیاں دیتی تھی مگر اب سوچ سمجھ کے اس نے وضع بدلی۔ اور میاں کو شیشے میں اتارنا شروع کیا۔ یکایک ایسی محبت کرنے اور اس طرح جان فدا کرنے لگی کہ عقل کے پورے میاں اس کا دم بھرنے لگے۔ یقین آگیا کہ یہ سچ مچ مجھ پر مرتی ہے۔ وہ جو کہتی منظور کر لیتے۔ اور جو کام کہتی کرنے کو تیار ہو جاتے۔

نورجہان کی خوش نصیبی سے جس مکان میں وہ رکھی گئی تھی اس کے کوٹھے پر مغرب طرف ایک کھڑکی تھی۔ اور اس کے مقابل حمام کے کوٹھے پر لکڑی کا ایک اوٹ کھڑا تھا جس کے ادھر آغا علی خاں کی نشست رہا کرتی تھی۔ آغا علی خاں نے اوٹ کا ایک تختہ نکال ڈالا اور معمول ہو گیا کہ ادھر اپنے کوٹھے پر نورجہاں آکے بیٹھتی۔ ادھر اوٹ کی آڑ میں یہ بیٹھتے۔ اور دونوں میں دور ہی دور سے اشاروں میں باتیں ہوا کرتیں۔ اب روز کا یہ مشغلہ تھا۔ دونوں کوٹھوں پر جمے رہتے۔ اور جب دیکھیے اشارے بازیاں ہو رہی ہیں۔

ان عاشقانہ دلچسپیوں کو چند ہی روز ہوئے تھے کہ سلون کے فوجدار میر غلام امام فیض آباد میں آئے۔ اور عنبر علی خاں کے مکان کے پھاٹک کے اوپر جو چھپر پڑا تھا اس میں اترے۔ اس بالا خانہ کے چھپر سے ان دونوں مکانوں کا سامنا تھا۔ انھوں نے ان عاشقانہ اشارہ بازیوں کا سین دیکھا۔ اور منشی فیض بخش مصنف تاریخ فیض آباد سے تذکرہ کیا۔ انھوں نے چھوٹتے ہی

جواہر علی خاں کو خبر کی۔ اور اُس نے اپنے سائیسوں کو بلا کے حکم دیا کہ "نور جہاں جس مکان میں رہتی ہے۔ اُس کے کوٹھے کی کھڑکی بند کرا دو۔ اور دیکھتے رہو کہ پھر کبھی نہ کھلنے پائے۔"

اب وہ دُور کی نظر بازیاں بھی موقوف ہوئیں۔ جن سے دونوں ہجراں زدہ دلوں کی تھوڑی بہت تسلی ہو جایا کرتی تھی۔ جب اروزن دید بھی بند ہوئے۔ اور دیدار یار کی کوئی صورت نہ نظر آئی۔ تو نور جہاں نے احمق میاں ہی سے کام لے کے دوسرا رستہ نکالا۔ ایک دن جواہر علی خاں کے پاس اُس کا شوہر محمد صالح آیا۔ اور بیوی کی طرف سے پیام دیا کہ "انھوں نے حضور میں عرض کیا ہے کہ میں اس مکان میں اکیلی گھٹ گھٹ کے مری جاتی ہوں اور نہ کوئی یہاں آنیوالا ہے نہ کوئی جانے والا۔ کوئی اتنا بھی نہیں جس سے دو گھڑی باتیں کر کے دل بہلاؤں۔ لے دے کے جو کچھ میاں ہیں وہ بھی اکثر حضور میں حاضر رہتے ہیں۔ پھر کہیے میں کیا کروں اور کیوں کر دل بہلاؤں؟ اور نہیں تو اتنی ہی اجازت دیجیے۔ کہ یہاں شہر میں میری ایک جان پہچان والی ہیں۔ وہ کبھی کبھی ڈولی میں بیٹھ کے میرے پاس چلی آیا کریں۔" اس درخواست کے ساتھ نور جہاں نے اس قدر خوشامد کر دی تھی کہ جواہر علی کا دل نرم ہو گیا۔ اور اُس نے اجازت دیدی۔ کہ ڈولی پر بیٹھ کے جو عورت آئے نہ روکی جائے۔ اور اُسے آنے جانے اور رہنے کی اجازت ہے۔ اس اجازت کے مطابق اکثر ایک ڈولی کی آمد و رفت رہتی اور جو نیک بخت آتی دو دو تین تین دن رہ کے چلی جاتیں اور کوئی تعرض نہ کرتا۔

اتنی آزادی حاصل کرنے کے بعد نور جہاں نے اس بات کی کوشش شروع کی کہ مرزا شیخی کو اپنا دوست اور طرفدار بنائے۔ اُن کے پاس چپکے سے کہلا بھیجا۔ کہ اگر میں پھر بیگی خانم کے محل میں پہنچ گئی۔ تو وعدہ کرتی ہوں کہ تمہاری ساس کو پھر دوبارہ نوکر رکھا دونگی۔ اور اُسی قدر نہیں بلکہ اُن کی تنخواہ بھی کچھ بڑھا دونگی۔" مرزا شیخی لالچ میں آ گئے۔ اور ایک دن رات کو سب کی آنکھ بچا کے نور جہاں سے ملے باہمی دوستی و اتحاد کا اقرار کیا۔ اور دونوں میں سچے دل سے مضبوط عہد و پیماں ہوا اور مرزا شیخا نے کہا "مجھ سے جہاں تک بنے گا آپ کو آزادی دلانے کی کوشش

کروں گا۔" اس عہد و پیمان کے بعد نور جہاں نے آغا علی خاں کے پاس کہلا بھیجا۔ کہ "میں نے اپنے میاں اور مرزا شیخا دونوں کو ہموار کر لیا ہے اب تم خانم صاحبہ سے کہو کہ میرے بلانے کی کوشش کریں۔"

کامیابی کا یہ پہلو نکلتے ہی آغا علی خاں نے بھی محمد صالح کو بلا کے اُس پر چارا پھیرا۔ ایسی باتیں بنائیں۔ کہ وُہ اُن کا دم بھرنے لگا۔ اور اُنھوں نے زیادہ دلدہی کے لئے بیس روپیہ مہینہ اُس کی تنخواہ بھی مقرر کر دی۔ اور اُس کے بعد جا کے بنی خانم کو نور جہاں کا پیام دیا۔

بنی خانم کے بھی دل سے لگی ہوئی تھی۔ فوراً تیار ہو گئیں۔ اول تو انھیں اپنے گھر کے کاروبار میں جتنا بھروسہ نور جہاں پر تھا کسی پر نہ تھا۔ اُن کے کام جیسے نور جہاں سے نکلتے تھے کسی سے نہ نکلتے تھے۔ اُس کی جگہ پر جو اب عورت کام کرتی تھی اُس سے وُہ خوش نہ تھیں۔ اور بات بات پر نور جہاں یاد آتی تھی۔ علاوہ اسکے جن زبردستیوں کے ساتھ نور جہاں اُن سے چھینی گئی تھی۔ اُس میں انھیں اپنی سُبکی اور بے وقعتی نظر آتی تھی اس کا خار دل میں تھا اور کہتی تھی کہ کسی طرح ہو جواہر علی خاں سے اس کا بدلہ ضرور لونگی۔ بہر تقدیر نور جہاں کا پیام سنتے ہی تیار ہو گئیں۔ اور اُسی وقت سوار ہو کے بہو بیگم صاحبہ کے پاس پہونچیں۔ دو تین دن وہاں رہیں۔ چوتھے دن بہو بیگم کے سامنے یہ معاملہ چھیڑا۔ اور کہا "آپ جانتی ہیں کہ محمد صالح میرا خانہ زاد اور میرے غلام کا لڑکا ہے۔ اور اُسے اس میں کچھ عذر نہیں کہ نور جہاں میرے پاس رہے جس کے بغیر مجھے بڑی تکلیف ہے۔ جو کچھ فساد ہے اور پر دانوں کا ہے۔" بیگم نے پوچھا "محمد صالح اس پر راضی ہے کہ اُس کی جورو تمہارے یہاں رہے؟" بنی خانم بولیں "میرے کہے کا یقین نہ ہو۔ حضور خود اُس سے بلا کے دریافت فرمائیں۔ بلکہ ڈیوڑھی پر حاضر ہے پوچھوا لیجئے۔"

محمد صالح اس سازش میں پڑ کے دس بارہ دن سے جواہر علیخاں کے پاس نہیں گیا تھا۔ اور بنی خانم کا طرفدار تھا۔ اس وقت بہو بیگم صاحبہ نے دریافت کرایا تو اُس نے بنی خانم کے بیان کی پوری پوری تصدیق کر دی۔ اُس کا بیان سُن

کے بہو بیگم صاحبہ بولیں "جب اُسے نور جہاں کے تمہارے یہاں رہنے میں اطمینان
ہے۔ تو پھر کون روک سکتا ہے؟ اُسے اختیار ہے۔ جہاں چاہے لے جا رکھے
اس حکم پر بنی خانم کو اطمینان ہو گیا۔ اور نور جہان کو اپنے ساتھ لے کے سوار ہونے
کو تھیں۔ دروازے پر گاڑی کھڑی تھی۔ جلوس کے سوار بھی وردیاں پہنے ہوئے
تیار تھے کہ پانی برسنے لگا۔ اور انھیں ٹھہرنا پڑا۔ کہ مینہ تھمے تو سوار
ہوں۔

یہ رات کا وقت تھا۔ اور جواہر علی خاں مغربین کی نماز پڑھ کے بیٹھا ہی
تھا کہ ایک سائیس نے کہا "نور جہاں بھاگ گئی! ہم سمجھے کہ جو بی بی اکثر آیا کرتی
تھیں۔ وہی ڈولی میں سوار ہو کے جا رہی ہیں۔ لیکن جب دیر تک مکان میں سناٹا
رہا۔ تو ہمیں شک ہوا۔ جا کے پکارا اور کوئی نہ بولا۔ تب اندر جا کے دیکھا۔ اور
معلوم ہوا۔ کہ وہ ہمیں چل دیکے نکل گئی"۔ جواہر علی خاں نے حکم دیا کہ "جاؤ
ڈھونڈو۔ اور جہاں ہو لے آؤ"۔ اتنے میں مرزا تیغی آ گئے۔ اور جواہر علی خاں نے
اُن کی طرف دیکھ کے جوش کی آواز میں کہا "حضور عالیہ بیگم صاحبہ نے خدا ترسی
کی راہ سے [illegible] کی خبر لی تھی۔ اور اس کا انھیں اجر ضرور ملے گا۔ اب اُسے اختیار
ہے جو چاہے کرے۔ مگر ہم نے اُس کے حق میں اچھا ہی کیا تھا"۔ یہ کہہ کے اُس نے
سپاہیوں اور جاسوسوں کو بلا کے حکم دیا کہ سارے شہر میں پھر کے پتہ لگاؤ
کہ یہ عورت کہاں گئی ہے"۔ صدہا آدمی ہر طرف پھیل گئے۔ اور گلی کوچوں میں ہر جگہ
ڈھونڈ ڈھونڈ ہونے لگی۔

یہ ہو ہی رہا تھا۔ کہ بہو بیگم کی ڈیوڑھی کے پہرے کے سپاہیوں میں سے
ایک نے ان کو خبر دی کہ "کوئی آدھا گھنٹہ ہوا نور جہان محل کے اندر داخل ہوئی
ہے۔ اور عنقریب بنی خانم اُسے گاڑی میں ساتھ بٹھا کے اپنے گھر لے جانے
والی ہیں"۔ یہ سنتے ہی جواہر علی خاں کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ حکم دیا کہ "خبر
جانے نہ پائے۔ جو کچھ ہو گا میں سمجھ لونگا۔ بنی خانم اپنے گھر میں پہونچ بھی جائیں تو
بھی تم بلا تامل گاڑی میں ہاتھ ڈال دینا۔ نور جہان کو کھینچ کے گاڑی سے نکال
لینا۔ اور چاہے پانی برسے۔ بجلی گرجے۔ بادل کڑکے جو ہو تم اُسے اسی وقت

پکڑ کے میرے پاس حاضر کردینا۔"

جواہر علی خاں کا حکم کوئی معمولی چیز نہ تھا۔ بے قاعدہ فوج کے ہزاروں سپاہی سڑکوں پر پھیل گئے اور منتظر تھے کہ بنی خانم کی گاڑی آئے۔ اور دھاوا کردیں۔ لیکن بنی خانم کے لوگوں نے اس ناکہ بندی کی خبر انھیں پہونچائی۔ سنتے ہی انھیں بھی ضد ہوگئی۔ دل میں کہا "اب تو میں لے ہی کے جاؤں گی۔" چلتے چلتے رک گئیں۔ اور سارے واقعات جاکے بہو بیگم صاحبہ سے کہہ دیئے۔ انھوں نے برہم ہوکے خواجہ سرا کی زبانی جواہر علی خاں کے پاس کہلا بھیجا "تمہیں کیا ہوگیا ہے جو راستہ روکتے ہو! اپنی اس بیہودہ ضد کو چھوڑ دو۔"

جواہر علی خاں اس وقت اس قدر غصہ میں بھرا ہوا تھا کہ آپے سے باہر تھا۔ یہ بھی بھول گیا تھا کہ بہو بیگم      میری آقا اور مالک ہیں، اور میں اُن کا غلام ہوں۔ بیگم صاحبہ کے پیام کا کچھ جواب نہ دیا۔ بلکہ جب محل کا خواجہ سرا واپس جاچکا تو اپنے سرداران فوج کو دوبارہ تاکید کی کہ "خبردار بنی خانم جانے نہ پائیں۔ تم لوگ اُسی طرح مستعد رہو۔ میں منع بھی کروں تو تم نہ ماننا بے تکلف گاڑی پکڑ لینا اور کہنا ہم نہ جواہر علی خاں کو جانتے ہیں نہ کسی اور کو۔ ہم تو مسلمان ہیں اور ہمارا دین اسلام ہے۔ زیادہ روک کی گئی، تو ہم غدر مچادیں گے۔ اور سید کی جائز منکوحہ کو اُس کے آشنا سے چھین کے شوہر کے حوالے کردیں گے۔ پھر وہ جانے اور اس کا کام جانے۔ دین کا حکم ہے۔ ہم چاہیں مر جائیں مگر سیدانی سید ہی کے پاس رہے گی۔"

بہو بیگم صاحبہ کو جب معلوم ہوا۔ کہ جواہر علی خاں نے کچھ جواب نہیں دیا تو متردد ہوئیں کہ کیا کریں۔ کسی اور خواجہ سرا کے پاس اتنی فوج نہ تھی کہ جواہر علی خاں کا وہ مقابلہ کرسکے۔ بار بار جواہر علی خاں ہی کے پاس آدمی بھیجتی تھیں۔ اور وہ کچھ جواب نہ دیتا تھا۔ غصہ میں بھرا بیٹھا تھا۔ منھ میں کف تھا۔ اور آنکھوں سے شعلے نکل رہے تھے۔ آخر دیر تک کے نامہ و پیام کے بعد جواہر علی خاں نے قبول کیا کہ "اگر خود محمد صالح آکر کہہ دے۔ کہ میں نے اپنی جورو

کو پایا۔ اور اُسے جہاں چاہو لگائے جا کے رکھوں گا۔ تو میں نہ روکوں گا۔ بیگی خانم نور جہاں کو لے جائیں۔ لیکن بعد اس کے نور جہاں کو کوئی نہیں لے جا سکتا۔"

اس قرارداد کے مطابق محمد صالح کی تلاش شروع ہوئی۔ اُس سے لوگوں نے کہہ دیا تھا کہ "جواہر علی خاں کے سامنے نہ جانا وہ تمہیں مار ہی ڈالیں گے۔" یہ سنتے ہی ایسا بدحواس بھاگا۔ کہ ایک ذلیل چابک بچانے والے کے تنگ و تاریک مکان میں جہاں اندھیرا گھپ تھا۔ دبک کے بیٹھ رہا۔ اور ڈر کے مارے زور سے سانس بھی نہ لیتا تھا۔ چاروں طرف لوگ اُسے ڈھونڈتے پھرتے تھے۔ اور اُس نے ایسی چپ سادھی تھی کہ کسی طرح سراغ نہ لگتا۔ بڑی دیر کے بعد خدا خدا کر کے ملا اور لوگ کھینچتے ہوئے پھاٹک پر لائے۔ یہاں پہونچتے ہی اُس نے دہائیاں دینا شروع کیں کہ "للہ مجھے جواہر علی خاں کے سامنے نہ لیجاؤ۔"

آخر جواہر علی خاں کی نظر قہر سے بچنے کے لئے وہ ایک ڈولی میں بٹھایا گیا جس میں پردہ باندھ دیا گیا۔ اور پردہ کی بو بو بنا کے ڈیوڑھی میں لایا گیا۔ جواہر علی خاں بھی اب معمول کے موافق محل کے اندر آ چکا تھا۔ اُس کے سامنے محمد صالح نے پردے کے اندر سے چلّا کے کہا "خدا حضور کو سلامت رکھے! حضور کی مہربانی سے مجھے اپنی جورو مل گئی۔ اور اب چاہتا ہوں۔ کہ وہ بیگی خانم صاحبہ ہی کے پاس رہے وہ میری آقا اور میرے جان و مال کی مالک ہیں۔"

خوش عقیدہ مصنف تاریخ فرح بخش کا بیان ہے۔ کہ جیسے ہی یہ کلمات محمد صالح کی زبان سے نکلے بادل زور سے گرجا۔ بجلی کڑک کے زمین پر گری۔ جواہر علی خاں کی زبان سے بے تحاشا آہ نکل گئی اور جتنے لوگ کھڑے تھے مبہوت و ششدر رہ گئے۔

اب کیا تھا؟ بیگی خانم نور جہاں کو لے کے اپنے گھر پہنچیں۔ اپنی کامیابی پر خوشیاں منانے لگیں۔ نور جہاں کے یہاں گھی کے چراغ جل گئے۔ اور آغا علی خاں کی آرزو بر آئی۔ اب نہ کہیں قاضی صاحب کے فتوے اور شرعی فیصلے کا پتہ تھا۔ نہ وہ دین محمدی کا جھنڈا بلند تھا۔ اور نہ فیض آباد میں وہ "دین دین!" کے نعرے

بلند ہو رہے تھے۔ لیکن ہاں اس واقعے کے طفیل میں بارھویں صدی ہجری کے
آخر کی ایک شرعی عدالت کی وضع۔ حالت۔ شان اور حکومت نظر آگئی۔

## ہیجڑوں کا بادشاہ

ہندوستان میں معمول ہے۔ کہ لوگوں کا ہر گروہ اور ہر طبقہ بہ اعتبار اپنے خصوصیات و اطوار کے دوسروں سے جدا رہتا ہے۔ اور اس کے اخلاقی تعلقات اپنے ہی گروہ میں محدود رہتے ہیں۔ اسی امتیاز کی وجہ ہے کہ ہر گروہ کی بجائے خود ایک گورنمنٹ قائم ہو جاتی ہے۔ جس میں ایک بادشاہ یعنی چودھری ہوتا ہے۔ اور اس کی منسٹر ایک مجلس وزرا ہوتی ہے۔ جسے پنچایت کہتے ہیں۔

اس قسم کا نظام تمدن بعض دیگر ممالک میں بھی قائم ہے۔ مگر وہاں اس نظام کو ایسی قوت نہیں حاصل ہو سکتی جیسی کہ ہندوستان میں ہے۔ اس کی زیادہ تر وجہ یہ ہے۔ کہ ہندوستان کے فرزندوں میں ذات اور برادری کی ایسی تفریقیں واقع ہوئی ہیں۔ کہ وہ بالطبع اسی نظام کے خواستگار ہیں۔

ہمیں اپنے ایک قدامت پرست دوست سے معلوم ہوا۔ کہ پچیس تیس سال کا زمانہ ہوا۔ سندیلہ میں ایک پرانے ہیجڑے کے مرجانے پر قریب قریب شمالی ہند کے کل ہیجڑے جمع ہوئے تھے۔ جن میں ایک ہیجڑوں کا بادشاہ بھی تھا جس کی شاید نواح فرخ آباد میں بہت بڑی جاگیر تھی۔ اور اس کی نسبت یہ روایت مشہور تھی کہ شہنشاہان دہلی میں سے کسی تاجدار کا کوئی بیٹا ہیجڑا ہو گیا تھا۔ جسے تو باپ کی نظر میں وہ ذلیل و خوار رہا۔ لیکن آخر بادشاہ کا بیٹا تھا مجبوراً اسے دہلی سے دور ایک بڑی جاگیر عطا کی گئی تاکہ گھر سے الگ وہیں بیٹھ کے اپنی بے شرمی کی زندگی ختم کر دے۔ ہیجڑوں نے اس کی یہ قدر کی کہ اپنا بادشاہ بنا لیا اور اس وقت سے جو ہیجڑا اس گدی پر بیٹھا ہیجڑوں کا بادشاہ قرار پا گیا۔

غرض ہندوستان میں قریب قریب ہر ذلیل و حقیر گروہ کی ایک جماعت قائم ہوتی ہے جس کا کوئی فرمان روا بھی ضرور ہوا کرتا ہے۔ چنانچہ ہر گروہ

اور ہر طبقہ کی شاہیاں یہاں مدت ہائے دراز سے چلی آتی ہیں۔ لیکن تعجب یہ ہے کہ ایک سب سے ذلیل گروہ کی بادشاہی کبھی ہندوستان میں نہیں سُنی گئی تھی۔ جس کا تکملہ انگلستان نے کر دیا۔

ہندوستان میں کبھی کوئی فقیروں کا بادشاہ نہیں سُنا گیا۔ اگرچہ تصوف کے عام مذاق اور درویش پرستی کے رجحان نے یہاں ہر فقیر کو "شاہ جی" کا لقب دے کے شاہی دلوا دی۔ اور ہر فقیر اپنی گدی اور اپنے تکیے کا بادشاہ بن گیا۔ اور جب ہر فقیر یہاں ایک بادشاہ بن گیا۔ تو پھر کیونکر ممکن تھا۔ کہ وہ کسی ہمعصر کے آگے سر نیاز جھکائے؛ اور کسی کو ان کی بادشاہی کا فخر حاصل ہو؟ لیکن انگلستان میں فقیروں کا ایک نامی گرامی بادشاہ ہو چکا ہے۔ جس کی وجہ غالباً یہ ہوگی۔ کہ وہاں کے عام فقرا "شاہ صاحب" نہیں مانے جاتے۔

ان انگلش شاہ گدایان کے حالات غالباً دلچسپی سے خالی نہ ہونگے۔ ان شاہ صاحب کا نام "کارلو بام فائلڈ مُور" تھا اور لقب "فقیروں کا بادشاہ" آپ ایک گرجے کے مہتمم پادری صاحب کے فرزند دلبند تھے۔ مگر سیاحت کا اس قدر شوق تھا۔ کہ سوا شہروں شہروں مارے پھرنے کے کسی ایک جگہ قدم نہ جمتا۔ ہنوز وطن ہی میں تھے۔ کہ جپسی لوگوں نے بستی کے باہر آ کے پڑاؤ ڈالا۔

جپسی ایک خانہ بدوش قوم ہے جو نہ کہیں گھر بناتے ہیں۔ اور نہ کہیں پاؤں توڑ کے بیٹھتے ہیں۔ متمدن لوگوں کے خلاف وہ نہایت ہی بے پروا۔ بے تکلف اور سادہ مزاج ہوتے ہیں۔ گداگری کرتے ہیں۔ اور ہاتھ دیکھ کے آئیندہ زندگی کے حالات بتانا۔ اور انسان کو تقدیری واقعات اور پیش آنے والے سوانح سے مطلع کرنا اُن کا کام ہے۔ انگلستان میں مشہور ہے۔ کہ جپسی بچوں کو پکڑے جاتے ہیں۔ اور جب اُن کا کوئی خاندان کسی بستی میں ہو کے گزرتا ہے تو بائیں بچوں کو گھروں میں پکڑ کے بٹھا لیتی ہیں۔ اور اکثر بچہ خود ہی ایسے سہمے ہوتے ہیں۔ کہ اُن کا نام سُنتے ہی کونوں میں دبک جاتے ہیں

بہ خلاف عام اہل انگلستان کے جو جپسی لوگوں سے الگ ہی الگ رہتے ہیں یہ شاہ کاریو صاحب اُن سے جا کے ملے۔ ملاقات پیدا کی اور چند روز میں ایسا ربط وضبط پیدا کر لیا۔ کہ ان کو اُن سے اور اُن کو ان سے ملنے میں لطف آنے لگا۔ ان ملاقاتوں میں شاہ کاریو کو جپسیوں کی زندگی بہت پسند آئی۔ اُن کی خانہ بدوشی کی روا روی اور اُن کی سادی زندگی میں کچھ ایسی دلکشیاں نظر آئیں۔ کہ جس طرح اگلے دنوں ہمارے یہاں بعض بگڑے شریف زادے شہدوں کی زندگی پسند کر کے اُنھیں میں رل مل جاتے۔ اور اُن کی معاشرت اختیار کر لیا کرتے تھے آپ نے اُن کی زندگی اختیار کر لی۔ تمام دوستوں اور عزیزوں کو خیر باد کہہ دی۔ اور جپسیوں کے ساتھ ہو لیے۔

اس زندگی کے اختیار کر لینے کے بعد شاہ کاریو نے طرح طرح کے کارنامے دکھائے۔ ہر گھڑی ایک نئی وضع میں آتے۔ اور ایک نیا فقرہ بنانے میں ایسے کمالات دکھائے۔ کہ لوگ اُن کی باتوں کو جادو یا کرامت ماننے لگے۔ ایک ہی صحبت کے سامنے دن میں چار چار پانچ پانچ بار آتے۔ ہر دفعہ ایک نئی بات بنا کے پیش کرتے اور کسی کے وہم و گمان میں بھی نہ آتا۔ کہ یہ وہی شخص ہے۔ جو ابھی چند گھڑیاں ہوئیں دوسری وضع میں آیا۔ اور کوئی اور فقرہ دے کے کچھ وصول کر کے گیا ہے۔ کبھی وہ ایک ستم زدہ مہتمم کنیسہ بن کے آتے اور کہتے "میں قاعدے کے موافق حلف نہ اُٹھا سکا اور اپنی خدمت سے محروم رہ گیا"۔ دوسری بار دوسرے بھیس میں آ کے فرماتے "میں ایک کویکر[ع] ہوں تجارت میں گھاٹا ہونے سے تباہ ہو گیا"۔ تیسری بار تیسری وضع میں آ کے فرماتے "میں ایک کشتی شکستہ ہوں۔ جہاز ڈوب گیا اور مجھے تختوں یا موجوں نے ساحل پر پھینک دیا"۔ چوتھی بار چوتھے بہروپ میں آ کے کہتے "میں فلاں گاؤں کا لوہار ہوں۔ بھٹی کے بھڑک اُٹھنے سے آگ لگ گئی اور سارا گھر جل کے خاک ہو گیا۔ بی بی بچے شعلوں کی نذر ہوئے۔ مصیبت کے ایام کاٹنے کے لیے

[ع] کویکر مسیحیوں کا ایک نیا مبتدع گروہ تھا۔ جو لوگ حلف اُٹھانے کو بُرا سمجھتے۔ اور اپنی راست بازی میں مشہور ہیں۔

میں زندہ ہوں"

ہر گھڑی نیا روپ بھرنے میں ان شاہ صاحب کی اس قدر شہرت تھی کہ تمام لوگوں کی زبان پر تھا ع ہر لحظہ بوضع دگر آں یار برآمد۔ اور متحیر ہو ہو کے کہتے کہ پروطیوس[ع] [illegible] بھی [illegible] ایسی صورت نہ بدل سکتا ہوگا۔ جس قدر جلد یہ حضرت روپ بدل لیا کرتے تھے۔ ایک خاص طریقہ آپ نے یہ اختیار کر رکھا تھا کہ کسی خاص تدبیر سے لوگوں کے کتّوں کو پھسلا لے جاتے۔ اور کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوتی۔ اس جرم میں آپ دو دفعہ گرفتار ہو کے سزایاب اور امریکہ میں جلا وطن کر دیئے گئے مگر دونوں دفعہ کوئی نہ کوئی جتن کر کے وہاں سے بھاگ آئے۔

انھیں جلا وطنیوں میں سے ایک دفعہ کا واقعہ ہے کہ آپ علاقۂ ورجینیا سے چلے تو بڑا بھاری جنگل قطع کیا۔ امریکہ کے مشہور دریائے ڈیلاوار کے اس پار اس وضع میں آئے کہ ایک گھوڑے کی پیٹھ پر سوار تھے۔ اور لگام کے عوض صرف ایک رومال اس کے سر سے اٹکا ہوا تھا۔

مملکت گدائی کے اس نامی فرماں روا کی نسبت کہتے ہیں کہ بلا کا حافظہ پایا تھا اور جس سے بات کرتا اس کا دل اس طرح لبھا لیتا کہ مجال نہ تھی وہ دھوکا نہ کھا جائے۔ نہایت ہی خوش اسلوبی کے ساتھ کبھی ایک رئیس اعظم بن جانا اور کبھی ایک درویش بے نوا۔

آپ نے اپنے ہم مذاق لوگوں یعنی مکّار فقیروں کی ایک بڑی بھاری جماعت پیدا کر لی۔ جو ملک کے لئے ایک زبردست فتنہ تھی اور چونکہ تمام باتوں میں آپ سب سے زیادہ قابلیت اور کمال رکھتے تھے۔ اس لئے سب نے مل کے آپ کو اپنا بادشاہ منتخب کیا۔ اور اسی وقت سے آپ فقیروں کے بادشاہ مشہور ہو[ئے] اور آخر زندگی تک اس معزز خدمت کو ایسی خوش اسلوبی سے انجام د[یا]

ع پروطیوس یونانیوں کا ایک دریائی دیوتا تھا۔ جسے گھڑی گھڑی اپنی صورت بدل لینے [کا] کمال بتایا جاتا ہے۔ وہ لوگوں کا آئندہ قسمت کا حال بتاتا تھا۔ جزیرۂ فاردس کے ایک غار میں رہتا [تھا] وہاں اس سے غیب کی باتیں پوچھنے کو جاتے لیکن صرف اسی صورت میں کامیاب ہوتے جبکہ د[یوتا] سوتا ہوا ملتا۔ کیونکہ اگر جاگتا ہوتا تو اپنی ایسی صورت بنا لیتا کہ کوئی پہچان ہی نہ سکتا۔

کہ جیتے جی آپ ہی اُن کے فرماں روا رہے۔ کسی اور کے منتخب کرنے کی ضرورت نہیں پیش آئی۔

آخر اسی حکومت و فرماں فرمائی کے ساتھ سنہ [illegible]ء میں ستتر برس کی عمر پاکے آپ دُنیا سے رخصت ہوئے۔ اور انگلستان میں علاقۂ ڈیون شائر کے قصبۂ بِکس لے میں سنہ ۱۶۹۳ء عیسوی میں پیدا ہوئے تھے۔

مئی سنہ ۱۹۱۴ء

## خلفائے بنی اُمیہ کا ادبی مذاق

خالص عربی مذاق کو قائم رکھ کے جیسی شانداری و کرّ و فر کے کرشمے بنی اُمیہ کے خلفانے دکھائے۔ اور کوئی اسلامی سلطنت نہیں دکھا سکی ہے۔ اور یہی سبب تھا۔ کہ اصلی عربی لٹریچر اور ادبی علم و فضل کا جتنا بڑا مرکز مملکت ہسپانیہ بن گئی تھی۔ بغداد کی عباسی خلافت بھی نہ تھی۔ خلافت بغداد کی قلمرو بے شک بڑی تھی اور اس کا دربار بھی زیادہ پُرسطوت و جبروت نظر آتا ہے۔ لیکن بغداد کے خلفانے اپنے علمی ذوق میں جو کچھ کیا یہ تھا۔ کہ دیگر زبانوں کے علوم کثرت سے عربی میں نقل کر لیے۔ اس کے سوا اور تمام باتوں میں ساسانی مذاق اور ایرانی معاشرت کا اُن پر اس قدر اثر پڑ گیا تھا۔ کہ اُن میں نہ عربی وضع قطع ہی باقی رہی تھی۔ نہ عربی سخن سنجی۔ نہ عربی سادگی معاشرت باقی تھی نہ عربی آزادی و حریت اب اُن میں نہ وہ اگلا لٹریچر تھا۔ نہ وہ عرب العرباکی پرانی پرجوش و ولولہ خیز شاعری ہر چیز میں عجمیت کی بو آرہی تھی۔ اور بعض یورپین مورخین کا کہنا بالکل بجا ہے کہ دربار خلافت کا بغداد میں قائم ہونا عربی سطوت کا بڑھنا نہ تھا۔ بلکہ دراصل عربیت پر عجمیت کی ایک زبردست فتح تھی۔

بہ خلاف عباسیوں کے بنی اُمیہ کے دربار ابتدا سے آخر تک جہاں رہے۔ خالص عربیت کے رنگ میں ڈوبے رہے۔ اور اسی وجہ سے اُن کے عہد میں عربی زبان اور عربی لٹریچر نے بڑی ترقیاں حاصل کیں دمشق

میں خلفائے بنی اُمیہ شام اگرچہ سطوت قیصری سے بڑھ کے شان و شوکت دکھا رہے تھے۔ اور عیش و عشرت کے سامانوں میں گھرے ہوئے تھے۔ مگر اپنے مذاق عربیت کے قائم رکھنے کا یہاں تک اہتمام تھا۔ کہ شاہزادے اور اعیان خلافت کے فرزند بچپن سے صحرائے عرب میں بھیج دئے جاتے تاکہ قدیم قبائل عرب میں رہ کے عربی فصیح و خالص زبان کے ساتھ عربی خصائل و عادات کو سیکھیں۔ اور بدوی شجاعت سے ناآشنا نہ ہونے پائیں۔ مگر بنی عباس کے زمانے میں یہ طریقہ تعلیم مفقود ہو گیا تھا۔

غالباً کہا جائیگا کہ اُن خلفا کے عہد تک عرب لوگ بجز قوموں کے مذاق و معاشرت سے آشنا نہیں ہونے پائے تھے۔ اس لئے کہ وہ فتوحات عرب کا ابتدائی زمانہ تھا۔ لیکن نہیں بنی اُمیہ اندلس نے بھی جو بنی عباس کے معاصر اور پورے رقیب تھے۔ سرزمین اندلس میں پہونچنے کے بعد جو جزیرہ نمائے عرب سے ہزارہا کوس کی مسافت پر تھی اپنے عربی مذاق کو نہیں چھوڑا تھا۔

یہ دیکھ کے نہایت حیرت معلوم ہوتی ہے۔ کہ گاتھ لوگوں کی سرزمین پر اور مسیحیت کے آغوش میں جہاں ایکطرف فرانسیسی ولاطینی معاشرت تھی اور دوسری طرف صحرانشینان افریقہ کی رومی آمیز بدویت چند خانہ بدوش عربوں نے پہونچ کے ایک ایسی زبردست سوسائٹی قائم کرلی جس کا مذاق خالص عربی تھا۔ اور جسکا لٹریچر عربی ادب کا ایسا اعلیٰ نمونہ تھا۔ جو کسی بیرونی اثر سے مغشوش نہ تھا۔ وہاں ان پر نہ شارلمین کے دربار کا اثر پڑا نہ رومیوں کے علم و فضل کا۔ نہ گاتھک۔ معاشرت نے اُن کی عادات و اطوار کو بگاڑا نہ یونانی علوم نے ان کی سادگی مذاق و سادگی عقاید میں تفرقہ ڈالا۔ وہ خالص عرب تھے۔ اور صدیاں گزرنے کے بعد بھی خالص عرب رہے۔ بلکہ اگر غور سے دیکھئے تو اُن کا مذاق سخن مصر و شام اور عراق وغیرہ کے شعرا کے مذاق سے اچھا اور سچا تھا۔

اندلس میں عربی ادب و شاعری کا سب سے بڑا قدردان خلیفہ الحکم المستنصر باللہ تھا جس کی وجہ یہ تھی کہ وہ خود بہت بڑا عالم و ادیب

تھا۔ اور تصنیف و تالیف اور کتب بینی میں جیسا انہماک اُس کو تھا۔ شاید
دنیا کے کسی بادشاہ میں نہ دیکھا گیا ہوگا۔ اُس کا باپ مشہور خلیفہ اندلس عبدالرحمٰن
ثالث الناصر لدین اللہ اگرچہ اپنی پچاس سال سے زیادہ زمانے کی حکومت
میں ہمیشہ فتوحات اور فوج کشیوں میں مصروف رہا۔ لیکن اس پر بھی
اسپین میں اس کی قدردانی سے بڑے بڑے گراں پایہ فاضلوں کا مجمع
ہوگیا تھا۔ خلف بن ایوب بن فرج کی شاعری کی ساری عربی دنیا میں
دھوم تھی۔ اور اس کی نظمیں اُن علمی محفلوں میں (جنھیں ولی عہد خلافت
الحکم شاہی "قصر مروان" میں منعقد کیا کرتا تھا اور جن میں تمام علما و فضلای ملک
جمع ہوتے تھے) نہایت ذوق و محویت کے ساتھ سُنی اور سنائی جاتی تھیں۔ اسی
قسم کی ایک صحبت وزیر سلطنت عبیداللہ بن یحیی بن ادریس کے گھر پر بھی اکثر
مرتب ہوا کرتی اور ابن فرج اور دیگر مشہور شعرا کے اشعار لطف کے ساتھ
پڑھے جاتے۔

ابوبکر اسماعیل بن بدر بھی اُس زمانے کا ایک فاضل گراں پایا تھا جس کی
خلیفہ الناصر بڑی قدر و منزلت کرتا۔ جس کے اشعار پر بادشاہ نے شعر کہے تھے
ایک اور گراں پایہ صاحب علم و فضل سلیمان بن عبدالغافر الفرسی تھا۔ یہ عالم
ہونے کے ساتھ ایک زبردست سپہ سالار بھی تھا۔ بڑے بڑے میدانوں میں
فتح کے جھنڈے اُڑا چکا تھا۔ مگر اب دُنیا سے علیحدہ ہو کے لذات دنیوی سے کنارہ
کش ہوگیا تھا۔ بہت ہی سادی زندگی بسر کرتا۔ جوتا پہننا چھوڑ دیا تھا بھیڑ کی
کھال اُس کا لباس تھا۔ اور شب و روز زہد و تقویٰ میں مصروف رہتا
اور باوجود اس شان کے اُس سے خلیفہ الناصر سے اکثر صحبت رہتی۔ جسے
اُس پر اس قدر وثوق تھا کہ غربا میں اکثر خیرات اُسی کے ہاتھوں سے تقسیم ہوتی
اور بہت سے مفلوک الحال خاندانوں کی خبرگیری و دستگیری کا ذریعہ وہی
تھا۔ الناصر نے ایک دن بر سبیل تذکرہ اُس سے کہا "مجھے اپنی پچاس سال کی
کامیاب اور فتحمندیوں کی سلطنت میں صرف چودہ دن ایسے نظر آتے ہیں جنھیں
پورا اطمینان قلب حاصل تھا۔"

عبدالرحمن الناصر آخر عمر میں اپنی زندگی مدینۃ الزہراء میں بسر کرتا جس چھوٹی سی خوبصورت بستی کو اُس نے قرطبہ کے پاس آباد کر کے اور اپنی ایک محبوبۂ خاص زہراء کے نام سے نامزد کر کے بڑے بڑے خوبصورت قصروں اور عالیشان جامع مسجد سے آراستہ کر دیا تھا۔ یہیں اس کے گرد بڑے بڑے علما وزہاد کا مجمع رہتا۔ اور اُس کی ترک دنیا کی زندگی علمی صحبتوں میں گزرتی۔ ایک بڑا صاحب علم مصاحب والی اشبیلیہ ابوبکر اسماعیل بن بدر بن اسماعیل بن زیادہ تھا۔ جو اموی النسل تھا۔ اُس کی نسبت ابن فرج نے اپنی کتاب "جنات" میں لکھا ہے۔ کہ خیال آفرینی وسخن سنجی میں تمام معاصرین سے بڑھا ہوا تھا"۔

مرد تو مرد اُن دنوں بہت سی صاحب علم عورتیں الناصر کی متقیانہ صحبت علم میں موجود تھیں جن کے نام دنیائے اسلام میں ہمیشہ مشہور رہیں گے۔ بادشاہ کی اس پاک بازی کی صحبت کو اکثر محسنہ کا دلکش نغمہ شگفتہ رکھتا۔ محسنہ صاحب علم وفضل تھی۔ اور محل میں بادشاہ کی معتمدی یا پیش دستی کی خدمت انجام دیتی۔ فن موسیقی میں کمال رکھتی تھی۔ اور اس کے ساتھ گلا بھی بڑا پیارا پایا تھا۔ دوسری خاتون عائشہ بنت احمد بن قاسم تھی۔ جو قرطبہ کی ایک نازک بدن ونازک طبع نازنین تھی۔ اس کی شاعری کی ان دنوں سارے اندلس میں دھوم تھی۔ اس کی نسبت عام خیال تھا کہ یہ اعتبار عصمت وعفت، حسن وجمال اور علم وفضل کے سارے ملک میں اپنا جواب نہیں رکھتی۔ صفیہ بنت عبدالرائع بھی اس عہد کی ایک بڑی صاحبہ علم خاتون تھی۔ اُس کے اشعار میں شاعرانہ نازک خیالی کے ساتھ ایسی عالمانہ متانت وبلند پروازی تھی۔ کہ خلیفہ الناصر کو نہایت ہی لطف آتا۔ اسی درجہ کی ایک قابل کنیز نائرا شید یا تھی (غالباً یہ اندلسی زبان کا نام ہوگا۔ یا ایسا بگڑا ہے۔ کہ ہم نہیں پہچان سکتے) جو بادشاہ کی محبوبہ تھی۔ اور اُس کی خوش طبعی وظرافت بذلہ سنجی ولطافت سے الناصر کے آخری ایام زندہ دلی ولطف میں بسر ہوتے۔

سنہ ۳۵۰ھ میں جب عبدالرحمٰن الناصر نے سفر آخرت کیا تو خلیفہ الحکم کا علمی ذوق و شوق پہلے سے بدرجہا زیادہ بڑھ گیا۔ ابتدائے عمر سے اُسے علم کا بڑا شوق تھا۔ دنیا کے تمام عیش درکنار اُسے حکمرانی و فتحمندی میں اتنی دلچسپی نہ تھی۔ جتنی کہ کتابوں کے جمع کرنے اور اُن کے مطالعہ میں تھی اس بات کی دھن تھی۔ کہ دنیا بھر کی عربی کتابیں اُس کے کتب خانے میں جمع ہو جائیں۔ چنانچہ اُس کی مسلسل کوششوں سے شاعری ادب دینیات و اخلاق۔ تاریخ و جغرافیہ اور تمام علوم و فنون کی کتابوں کا اتنا بڑا ذخیرہ جمع ہو گیا۔ جو دنیا کے کسی شہر میں نظیر نہ رکھتا تھا۔ اُس کے نائب اور ایجنٹ کتابوں کو تلاش کرتے ہوئے ساری دنیا میں مارے مارے پھرتے تھے۔ اور اسی مضمون کے نامہ و پیام لے کے اس کے سفیر افریقیہ و مصر۔ شام و عراق۔ اور فارس و عرب کے اسلامی درباروں میں پہونچے اور انھیں عام اجازت حاصل تھی۔ کہ جتنا روپیہ درکار ہو خرچ کریں۔ مگر کسی قیمتی کتاب کو ہاتھ سے نہ جانے دیں۔

چند ہی روز میں شاہی قصر مروان کتابوں سے بھر گیا۔ کتابوں کے سوا اُس کے کمروں میں کوئی چیز نہ نظر آئی۔ اور فرنیچر وغیرہ جو کچھ تھا۔ کتابیں تھیں۔ غرض سوا خلیفۂ اندلس الحکم بن عبدالرحمٰن الناصر الملقب بہ مستنصر باللہ کے کوئی مسلمان فرمانروا دنیا میں نہیں گذرا ہے جسے کتابوں اور علم و فضل کا اس قدر شوق ہوا ہو۔ اُس کے پاس کتابوں کے ذریعہ سے عربوں کے اُن تمام قبائل کے انساب جمع ہو گئے۔ جو عرب و افریقیہ میں آباد تھے۔ اور اُن کے عرب سے نکل کے دیگر ملکوں میں آباد ہونے اور مختلف مشاغل میں مصروف ہونے اور اُن کی نقل و حرکت کی پوری تاریخ موجود تھی اُس کے قصر کا دروازہ اہل علم کے لئے ہمیشہ اور ہر وقت کھلا ہوا تھا۔ جن میں سے اکثر کو وہ بہت کچھ دولت دے کے روانہ کرتا۔ کہ دنیا کی سیر کریں اور جو نئی کتابیں ملیں۔ اُس کے کتب خانے کے لئے لے آئیں۔

اسی قسم کے جویائے علم علمائے دربار میں سے ایک علامہ ابو اسحٰق

محمد بن ابو القاسم الشیبانی تھے۔ جو مصر میں اُس کے لئے کتابیں تلاش کرتے۔ شام میں اس کے ایجنٹ علامۂ ابو عمر محمد بن یوسف بن یعقوب الکندی تھے جو غالباً مشہور فیلسوف عرب یعقوب کندی کے بڑے پوتے تھے۔

علامہ ابو الفرج اصفہانی نے جو نسل بنی اُمیہ سے تھے۔ انھیں دنوں اپنی مشہور کتاب "اغانی" تصنیف کی تھی جس کی تصنیف کے ساتھ ہی ساری دنیا میں شہرت ہو گئی۔ خلیفہ الحکم نے علامۂ موصوف کے پاس خاص اپنی دستخطی تحریر ایک ہزار اشرفیوں کے ساتھ بھیجی جس کا مضمون تھا کہ "یہ تھوڑی رقم ابتداءً نذر کی جاتی ہے۔ اور اسکے سوا جس قدر مطلوب ہو خزانے سے روانہ کیجائیگی۔ مہربانی کر کے اپنی کتاب کا ایک نسخہ میرے پاس بھیج دیجئے"۔ علامہ ممدوح نے فوراً اپنی کتاب مذکور کا ایک نسخہ روانہ کر دیا۔ اور اُس کے ساتھ ہی خاندان بنی اُمیہ کی ایک تاریخ مرتب کر کے بھیجی جس میں تمام شاہانِ بنی اُمیہ کے حالات و انساب ایسے استیعاب کے ساتھ درج تھے۔ کہ کوئی جزئی واقعہ بھی مصنف کے قلم سے نہیں چھوٹا تھا۔ اور ملوک بنی مروان کی تعریف کے قصائد بھی تصنیف کر کے بھیجے۔

خاص بغداد میں بھی اُس کے ایجنٹ کی حیثیت سے محمد بن طرخان موجود تھا۔ جو ہر کتاب کو چاہے کتنے داموں ہی پر ملے بلا تامل خرید لیتا۔ اسی قدر نہیں الحکم نے دنیا کے ان تمام اسلامی شہروں میں جو علم و فضل کے اعتبار سے شہرت رکھتے کاتب مقرر کر رکھے تھے۔ اور اُن کو حکم تھا کہ جو کتابیں قیمتہً دستیاب نہ ہو سکیں تو جس طرح بنے اُن کی نقلیں کرا لائیں۔

اس کوشش اور ایسے ذوق شوق سے الحکم نے قرطبہ کا کتبخانہ جمع کیا جسمیں کتابیں نہایت ہی صفائی اور اہتمام سے رکھی جاتیں۔ جو علموں اور فنوں کے لحاظ سے جدا جدا مرتب تھیں۔ قصر مروان کے ہر کمرے اور بڑے ہال میں لکھ کے لگا دیا گیا تھا۔ کہ اس میں کن کن فنوں کی کتابیں

ہیں۔ان کتابوں کی اُس نے جو فہرست خود ہی مرتب کی تھی۔ اُسمیں صرف کتابوں اور مصنفوں ہی کے نام نہ تھے بلکہ یہ بھی درج تھا کہ مصنف کون تھا؟ کہاں کا تھا؟ اُس کا نسب کیا تھا؟ اس کے کمالات کیا تھے؟ اور علم و فضل کی دنیا میں اس کا کیا پایہ تھا؟

اس جستجو و تدقیق کا یہ نتیجہ تھا کہ الحکم کو اُن تمام عربوں کے انساب ازبر تھے۔ جو اندلس کے مختلف شہروں میں جا جا کے آباد ہو گئے تھے۔ اور علم انساب میں وہ اپنے زمانے کا بے نظیر و بے ہمتا عالم تھا۔ اس علمی تحقیق میں اُسے اپنے معتمد ابو عبدالسلام غالب بن محمد بن عبدالواہب سے نہایت ہی بیش قیمت مدد ملتی تھی۔ اسی ابو عبدالسلام نے بادشاہ کے اشارے سے اندلس کے ہر ہر شہر اور قریے کا ایک ایک گزیٹر مرتب کیا تھا۔ جس سے سارے ملک کی حالت آئینہ ہو گئی تھی۔

علامہ ابو محمد ابن حزم جو اُن چند منتخب علمائے اسلام میں ہیں۔ جن پر دنیائے اسلام کو ناز ہے اپنی کتاب "الفصل فی الملل والاہواء والنحل میں" خلیفہ الحکم کی نسبت لکھتے ہیں کہ "یہ خلیفہ اپنی پندرہ سالہ فرماں روائی میں علم اور اہل علم کا حامی و مربی رہا۔ جس کے ساتھ رعایا کو دلی محبت تھی۔ اور لوگ اس کی علم پروری پر ناز کرتے تھے۔"

اندلس کا نامور مورخ ابن حیان الحکم کے اس کتب خانہ کا نام "کتب خانہ مروانیہ" بتاتا ہے۔ اس لئے کہ وہ قصر مروان میں تھا اور لکھتا ہے کہ "اس کی فہرست چوالیس جلدوں میں تھی۔ اور ہر جلد میں پچاس تختے لگے تھے۔ اور یہ جلدیں اوّل سے آخر تک کتابوں اور مصنفوں کے ناموں سے بھری ہوئی تھیں۔" ایک اور مصنف طلید الفتحی کہتا ہے کہ "کتب خانے کی فہرست الحکم کے زمانے میں پوری طرح مکمل نہیں ہونے پائی تھی۔ اس لئے الحکم کے بعد اُس کے بیٹے خلیفہ ہشام نے اسے تکمیل کو پہونچایا۔"

ان واقعات کو سن کے انسان کے دل میں خیال گذر سکتا ہے کہ الحکم صرف کتاب کا کیڑا تھا اور ملاؤں اور کتابوں میں حد سے زیادہ مصروف ہوجانے کے باعث فوج کشی خوش تدبیری اور دیگر امور سلطنت کی طرف سے بالکل غافل ہوگیا ہوگا۔ لیکن ایسا نہ تھا۔ الناصر نے اپنی زندگی ہی میں فرماں روائی سے گوشہ گیر ہوکے نظام سلطنت فاضل بیٹے کے ہاتھ میں دیدیا تھا۔ اُس وقت اُس نے اپنی علمی مشاغل کے لئے وقت مقرر کرکے حکمرانی کے لئے کافی زمانہ نکال لیا تھا۔ اور تمام انتظامات نہایت ہی حسن و خوبی سے انجام دئے۔ لیکن اس میں بھی قدردانی علم کا وہی حال تھا۔ افریقہ اور ممالک اسلامیہ مشرق کے تمام علما و فضلا کے پاس اُس نے پیام بھیجا کہ یہاں آکے قیام کیجئے۔ اور ہسپانیہ کو اپنا گھر بنائیے۔ اُس کے دو بھائی تھے۔ عبدالعزیز اور المنذر جو علم و فضل میں اُس کے ہم مذاق تھے۔ کتب خانہ کو اُس نے عبدالعزیز کے انتظام میں دیا۔ اور المنذر کو صرف اس کام پر مامور کیا۔ کہ علما فضلا کی خدمت و خبرگیری کیا کرے۔ اور اس طرح اُن کی دلدہی کرے۔ کہ وہ شوق سے یہاں رہیں۔ اور اپنے وطنوں کو بھول جائیں۔

ان دنوں برخلاف عام سلاطین اور دولت مندوں کے اندلس کی شاہی شہر مدینۃ الزہرا کے قصروں اور کوشکوں میں بجائے اس کے کہ عیش و عشرت کے کرشمے نظر آئیں۔ اور رقص و سرود کی محفلیں گرم ہوں۔ ہر وقت علمی صحبت قائم رہتی۔ اور سوا علوم و فنون کے کسی چیز کا چرچا نہ تھا۔ رضیبہ نام ایک ماہ جبین عورت الحکم کی محبوبۂ خاص تھی۔ اس کے سوا اور کسی پری وش نازنین کی صحبت میں اُس کا دل نہ لگتا۔ اس مہ جبیں عورت کی نسبت مورخین اندلس کہتے ہیں۔ کہ جس طرح حسن و جمال اور ناز و انداز میں جواب نہ رکھتی تھی اسی طرح علم و فضل اور تاریخ دانی و سخن سنجی میں بھی یکتائے روزگار تھی جس سے صاف پتہ چلتا ہے۔ کہ اُس کے ساتھ الحکم کو اس کی خوبصورتی کی وجہ سے نہیں۔ بلکہ اُس کے علم و فضل کی وجہ سے محبت تھی۔ الحکم نے اُسے "نجم السرور" خطاب دیا تھا۔ اس لئے کہ اس کی صبح عید کا مطلع رضیبہ ہی کا دلکش

چہرہ تھا۔

الحکم کی خدمت میں سب سے زیادہ رسوخ علامہ محمد بن یوسف کو تھا جو وادی الحجارہ کے رہنے والے تھے۔ اور ایک مشہور زمانہ مورخ تھے۔ انھوں نے اسپین اور افریقہ کی ایک ضخیم و مستند تاریخ لکھی تھی۔ جسمیں بادشاہوں اور مشاہیر ملک کے حالات درج تھے۔ اسی عہد کا ایک اور ادیب محمد بن یحییٰ تھا۔ جس پر بادشاہ کو ناز تھا۔ اس کی علمی قدردانی کی یہ حالت تھی۔ کہ تخت نشینی کے دوسرے ہی برس سرحد کے مسیحی باغیوں کی سرکوبی کے لئے زبردست فوج لے کے روانہ ہوا۔ تو طلیطلہ (ٹالڈو) میں پہونچ کے سُنا۔ کہ فوج کا کوئی نوجوان بیماری کے عذر پر شرکت جہاد سے معافی چاہتا ہے۔ دریافت کرنے سے معلوم ہوا کہ وہ قاضی عبد الولید یونس بن عبداللہ شہیر بہ ابن الصفر کا بیٹا عبد اللہ ہے اور نوعمری ہی میں علم و فضل اور ذوق تاریخ کے لحاظ سے فرید زمانہ بن گیا ہے۔ سامنے بُلوا کے اُس کی صورت دیکھی۔ حالات دریافت کئے۔ اور اپنے سپہ سالار سے کہا "انھیں رہنے دو۔ ان کی صحت بہت قیمتی ہے۔ اچھے ہو گئے تو ان سے ایسے کاموں کی اُمید ہے جو مجھے بہت عزیز ہیں"۔ پھر اُس سے کہا "عبداللہ! تم اُن لوگوں میں ہو جن کی ذات سے مجھے اُمید ہے کہ بنی عباس کی قلمرو کی علمی ترقیوں کو حسد کی نگاہ سے نہ دیکھونگا۔ بہتر یہ ہوگا کہ تم قرطبہ میں چلے جاؤ۔ اور وہاں میرے قصر مطلا میں جو دریا کنارے ہے قیام کرو۔ وہاں کی آب و ہوا میں جب میرے اطبا پوری توجہ سے علاج کرینگے تو جلدی اچھے ہو جاؤ گے"۔ نوجوان نے شکر گزار ہو کے عرض کیا "میں اپنے گھر کی خاموشی میں زیادہ اچھا کام کر سکونگا"۔ اور خلیفہ کی نظر عنایت کا اس قدر اثر پڑا تھا۔ کہ وہ نوجوان تندرست ہوتے ہی شعرائے سلف کے قصائد جمع کرنے اور مکمل تاریخ مدون کرنے میں مصروف ہو گیا۔ اور اس قدر جلد اس علمی خدمت کو انجام دیا۔ کہ ادھر الحکم فتح کے پھریرے اڑاتا ہوا قرطبہ میں آیا اور اُدھر نوجوان عبداللہ اپنی کتاب لے کے حاضر دربار ہوا۔ جو علما و فضلا کے مجمع میں پسند کی گئی۔ اور عبداللہ بھی اُن مستند صاحب علم لوگوں میں شامل

ہوگیا۔ جنھیں خاص مدینۃ الزہرا کی اکیڈمی میں جگہ دی گئی تھی۔

جو اہل علم وہاں جمع تھے۔ ان میں ایک احمد بن سعید الہمدانی تھے جنھو
نے اسپین کی تاریخ لکھی تھی۔ ایک یوسف بن ہارون الآرامدی تھے۔ جو ابو
کے لقب سے مشہور تھے۔ اسی طرح کے اور صدہا عالم تھے جو مختلف علوم
باکمال تسلیم کئے جاتے۔ ان دنوں اسپین میں علم وفضل کو اس قدر ترقی
کہ مرد تو مرد عورتیں بھی اپنی علمی قابلیتوں سے ناموری حاصل کر رہی تھیں۔
کے عہد کی صاحب علم عورتوں کے حالات ہم بتلا چکے ہیں۔ الحکم کے زمانے
یہ نئی عورتیں شہرت کے شہ نشین پر آئیں۔ الحکم کے قصر شاہی میں ایک بہت بڑ
صاحب علم نازنین تھی جو نحو صرف ادب اور شاعری میں مشہور تھی۔ ان علو
کے علاوہ اُسے علوم ہندسہ وریاضی میں بھی اچھا دخل تھا۔ عبارت نہا
ہی پاکیزہ لکھتی تھی اور اس کی ہر ہر ادا کی طرح اس کا ہر ہر فقرہ بھی د
ہوتا تھا۔ بادشاہ جب محل میں ہوتا۔ تو اُس کے ہاتھ کے لکھے ہوئے فر
جاری ہوتے الحکم اُس کے زور قلم زور بیان اور اُس کی رائے صائب
نہایت ہی معترف تھا۔

محل ہی میں ایک اور لائقہ وفاضلہ فاطمہ بنت زکریا ای شبلیری
اُس کے زور قلم اور عبارت آرائی کی بھی اندلس میں دھوم تھی۔ ایک خا
عائشہ بنت احمد بن محمد تھی جس کے علم وفضل اور ساتھ ہی اُس
دیگر محاسن کا قرطبہ میں بہت شہرہ تھا۔ ابن حبان اس خاتون کا
اپنی تاریخ میں لکھتا ہے۔ کہ سارے اسپین میں اُن دنوں کوئی عورت
جو حسن وجمال عفت وعصمت اور فضیلت وعلمیت میں اس کی مدمقا
ہوسکے۔ خوبی عبارت کے ساتھ اُس کی خوشخطی بھی ایسی اعلیٰ درجہ کی تھی
سے آنکھیں روشن ہوجاتیں۔

شہر میں ایک اور صاحب علم خاتون تھی۔ حفصہ بنت جعفر
التمیمی اُس نے علمی کتابوں کا ایک بہت اچھا کتب خانہ جمع کر رکھا تھا
اُس کے اشعار مقبول عام تھے۔ چونکہ وہ نہایت خوش گلو تھی۔ اسلئے

اشعار ایسے دلکش نغمہ کے ساتھ سنایا کرتی کہ سننے والے وجد میں آجاتے۔
ایک عالمہ خاتون مریم بنت ابو یعقوب الفیصولی الشعبی تھی۔ اس نے اشبیلیہ میں ایک مدرسۂ نسواں جاری کر رکھا تھا جس میں وہاں کے تمام معززین کی لڑکیاں تعلیم پاتیں۔ اور چند روز میں یہ ہوگیا۔ کہ قرطبہ کی قریب قریب تمام امیرزادیاں اور معزز خاتونیں اسی مدرسہ کی "اولڈ گرل" تھیں۔

الحکم کی وفات کے بعد رضیہ نے محض علمی شوق میں مشرق کا سفر اختیار کیا۔ مصر و شام و عراق کے تمام شہروں میں گئی۔ اور جہاں پہونچتی اُس کا نام ہر جگہ اس سے پہلے پہونچ چکا ہوتا۔

جون ۱۹۱۴ء

# عالمگیر قتال مغرب

دنیا والوں کی آج تک ہمیشہ کٹتے مرتے ہی گزری ہے۔ یہ سب جانتے ہیں۔ کہ امن و امان سے بہتر کوئی نعمت نہیں۔ تہذیب اور علمی ترقی ہمیشہ یہی تعلیم دیتی ہے۔ کہ صلح جوئی سے بہتر کوئی اخلاقی خوبی نہیں ہے۔ انسان کا نام انسان اسی لئے رکھا گیا ہے۔ کہ اس میں اُنس اور میل جول کے جذبات ہیں۔ اور وحشی درندوں کی طرح ایک دوسرے کے خون کا پیاسا رہنا اُس کا کام نہیں۔ لیکن حیرت اور بڑے تعجب کی بات ہے۔ کہ یہی انسان جس نے اپنا نام انسان رکھا ہے اُس سے بھی بے لڑے بھڑے نہیں رہا جاتا۔ تعلیم۔ تہذیب۔ مذہب اخلاق سب خاموشی کی زندگی بسر کرنے کی ہدایت کرتے ہیں۔ مگر اس کی یہ حالت ہے کہ علم و فضل اور تہذیب و معاشرت میں جس قدر ترقی کرتا جاتا ہے اسی قدر زیادہ لڑاکا اور خونخوار ہوتا جاتا ہے۔

موجودہ دور تہذیب سب سے زیادہ مدعی امن ہے کہا جاتا ہے۔ کہ آجکل کی شائستگی نے خونریزی موقوف کردی ہے اور جہاں کہیں اس جدید تہذیب کا اثر پڑا ہے وہاں قتل و خون کا بازار سرد پڑ گیا ہے اور لوگ نہایت ہی امن وامان کی زندگی بسر کرنے لگے ہیں۔ اگلی خونریزیوں کا الزام مذہب کو دیا جاتا ہے کہ صرف اپنے عقائد کے تسلیم کرانے اور اپنے گروہ کی بات بالا کرنے کیلئے وہ

ملکوں میں شمشیر قتال بلند کرایا کرتا تھا۔ اور موجودہ تہذیب نے چونکہ مذاہب کا اثر کمزور کردیا ہے اس لئے لوگوں میں خونریزی موقوف ہوگئی اور دنیا کو پنپنے کا موقع ملا ہے۔

لیکن تجربہ نے آخرکاران دعووں کو بھی توڑ دیا۔ اور ہم دیکھ رہے ہیں کہ ان حاملان لوائے تہذیب اور برہم کنان صفوف ادیان کے ہاتھوں سے ایسی خونریزی ہورہی ہے جیسی کہ آج تک دنیا میں کبھی نہیں ہوئی تھی۔ اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ علم و فضل اور تہذیب و تمدن میں جرمن اور فرانس کا مرتبہ آجکل دنیا کی تمام قوموں سے بڑھا ہوا ہے۔ اور ان کے بعد سب سے اعلیٰ درجہ انگلستان اور امریکہ کا خیال کیا جاتا ہے۔ جن کی نسبت یہ رائے قائم کی گئی ہے۔ کہ تحصیل زر کو علمی ترقی کے شوق پر ترجیح دیتے ہیں۔ لیکن انھیں میں اکثر کے ہاتھوں سے آج کل دنیا پر ایسے ظلم ہورہے ہیں اور نوع انسان اس بے رحمی سے قتل ہورہی ہے کہ اس کی نظیر سے دنیا کی تاریخ خالی ہے اور کبھی مذاہب کے ہاتھوں سے ایسا قتل عام نہ ہوا تھا۔ دولت برطانیہ نے بہت الگ رہنا چاہا۔ مگر نہ بن پڑی اور مجبوراً اُسے بھی اپنے ہاتھ خون میں رنگنا پڑے۔

تاریخ عالم کے آغاز میں ہمیں مشرق میں مہابھارت اور رامائن کی لڑائیاں اور مغرب میں ٹرائے کی معرکہ آرائیاں نظر آتی ہیں۔ اول الذکر دونوں لڑائیوں کے مرد میدان ہندو اور تیسری جنگ کے سورما یونانی تھے۔ دونوں کے شعرا اپنی ان لڑائیوں کو دنیا بھر کی لڑائیوں سے بڑا بتاتے ہیں۔ لیکن سچ پوچھیے تو تینوں میدان قوی الوالعزمی اور مقامی سپہ گری کے اعلےٰ ترین دنگل ضرور تھے۔ مگر ان کے حالات کے بیان کرنے میں شعرائے قوم نے بہت ہی مبالغہ کیا ہے کیونکہ اُس عہد کی قلت آبادی کے لحاظ سے نہ ان میں جانبازوں کی اتنی کثرت ہوسکتی تھی اور نہ موجودہ ذرائع سفر کے مفقود ہونے کی وجہ سے اُن کی خونریزی کا میدان اتنا وسیع ہوسکتا تھا۔

اُس کے بعد ہزاروں سال تک اسی قسم کی حملہ آوریوں اور خونریزیوں کا میدان گرم رہا۔ اسیریا و بابل والوں کا ارض یہودا پر آنا اور ساری نسل اسرائیل

کو تباہ کر دینا۔ زرکشیز کا جسے بعض محققین کیخسرو ثم خیال کرتے ہیں ا بیس لکس لاکھ سپاہیوں کے ساتھ یونان پر چڑھائی کرنا اور بحری لڑائی میں بالکل تباہ ہو جانا۔ رومیوں کا قرطاجنہ والوں سے لڑنا اور اُنھیں تباہ کرنا۔ گوتھ اور ہن کی سی وحشی قوموں کے سیلاب کا مملکت روم میں آنا۔ اور رومی تمدن و تہذیب کا غارت ہونا۔ صحرانشینان عرب کے عالمگیر لشکروں کا عرب سے نکلنا اور مشرق سے مغرب تک ساری متمدن دنیا کو زیر و زبر کر دینا۔ صلیبی مجاہدوں کے ٹڈی دل کا کوہستان آلپس سے نکل کے بنی اسرائیل کی موعودہ زمین پر گرنا۔ اور صدیوں تک خالص دینی مقاصد پر نوع انسان کی قربانی ہوتی رہنا اور سب کے آخر میں قراقرم کی گھاٹیوں اور دشت قپچاق کے صحرا سے تاتاری درندوں کے طوفان کا اُٹھنا اور عربی تہذیب کے ساتھ لاکھ آدمیوں کو عدم آباد میں اُڑا لے جانا۔

یہ سب ہُوا۔ اور اس میں خدا کی کروڑوں مخلوق تلوار کے گھاٹ اُتری مگر وہ وحشی تھے۔ جاہل تھے۔ غیر مہذب تھے۔ اور تمدن سے مس نہ رکھتے تھے لیکن مہذب دنیا میں تعلیم و تہذیب کے اعلیٰ ترین کمال پر پہونچنے کے بعد بھی خون کا سیلاب بہے۔ اور انسان کی سی بے نظیر امانت خاک میں ملائی جائے تو پھر ہمیں یہ کہنا بنتا ہے۔ کہ یہ مثل "لاکھ طوطے کو پڑھایا پر وہ حیوان ہی رہا" جانوروں ہی تک محدود نہیں بلکہ انسان کو ہزار لکھایئے پڑھایئے لاکھ مہذب و شائستہ بنایئے اصل میں وہ ایک خونخوار درندہ ہی ہے۔ صلح کی برکتوں کا یقین رکھنے اور امن و امان کے فائدوں سے واقف ہونے پر بھی ادنیٰ سی چھیڑ پر لڑ ہی پڑتا ہے۔

اگلی غیر مہذب لڑائیوں کے بعد اب ہم مہذب لڑائیوں کا ذکر کرتے ہیں۔ ان کا آغاز نپولین بوناپارٹ کی اولوالعزمی سے ہوا جس نے سارے یورپ اور مصر و شام میں ہل چل ڈال دی اور اپنی ملک گیری کی ہوس پر لاکھوں آدمیوں کی قربانی چڑھائی۔ اُس کے بعد اسی تہذیب کا تقاضا ہوا۔ کہ دولت عثمانیہ کو جس سے یوں جیتنا دشوار تھا رفتہ رفتہ کمزور کیا جائے۔ پہلے

نویرینو کی بحری لڑائی میں زبردست دول یورپ نے مل کے عثمانی بیڑے کو بالکل تباہ وغرق کر دیا۔ اور ہزاروں آدمی بحر فنا میں غرق ہوئے۔ پھر کریمیا کی لڑائی ہوئی جس میں مہذب دول یورپ کا یہ مقصد تھا کہ روسی اثر جنوب میں بڑھنے نہ پائے۔ اور ترکوں کو کسی قسم کا فائدہ نہ ہو۔ لکھوکھا خلقت اس لڑائی میں بھی ضائع ہوئی۔ اس کے بعد فرانس و جرمن کی پہلی لڑائی ہوئی جس میں لاکھوں بندگان خدا جرمنی کے شوق ملک گیری پر بھینٹ چڑھے۔ بعد ازاں روسیوں اور ترکوں کی لڑائی ہوئی جس کے لئے ایک زمانے سے اُن کے صوبوں میں فساد کرایا جاتا تھا۔ اُن کے وزرا کو رشوتیں دی جاتی تھیں۔ اُن کی رعایا میں شورش پیدا کرائی جاتی تھی۔ آخر لڑائی چھڑ گئی۔ اور تہذیب و بدتہذیبی دونوں طریقوں سے لاکھوں آدمی دونوں حریفوں کی فوجوں اور رزم گاہ کی رعایا میں سے قتل ہوئے۔ ترکوں نے آخر کئی صوبے آزاد کر کے جان چھڑائی۔ اور امن و امان قائم کرنے کی فکر کرنے لگے۔ مگر زبردست فتنہ پردازوں کی سازشوں کے سامنے ایک کمزور صلح جو کا کیا زور چل سکتا تھا کبھی چین سے بیٹھنا نہ نصیب ہوا۔ مہذب دنیا کا یہ عام مشغلہ تھا کہ جب اور کوئی فکر نہ ہوتی۔ تو جزیرہ نمائے بلقان اور قلمرو عثمانیہ کے پالٹکس میں مفسدانہ دخل دہی شروع ہو جاتی۔ یہ سلسلہ جاری تھا کہ جاپان نے جس نے مغربی عقابوں کی نظر سے بچ بچ کے اپنے آپ کو سنبھال لیا تھا۔ اور مہذبان مغرب ہی کا سا مہذب بن گیا تھا) سر اٹھایا اور خم ٹھوک کے روس کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ بحری و برّی دونوں لڑائیاں ہوئیں۔ اور لکھوکھا آدمی دونوں کے اغراض حکمرانی پر قربان ہوئے آخر بڑی مصیبت سے روس نے جان بچائی۔ اب چند روز بعد تہذیب کا یہ تقاضا ہوا۔ کہ اسلامی سلطنتوں کا خاتمہ کر دیا جائے۔ ایران سے مراکش تک ہر جگہ لڑائی چھڑ گئی۔ روس نے ایران کی پھڑ پھڑانے والی بے بس رعایا کو دبوچا۔ اٹلی نے بے پوچھے گچھے اور بے وجہ موجہ طرابلس کے ساحلی شہروں پر قبضہ کر لیا۔ فرانس نے بڑھ کے مراکو کا گلا دبایا۔ پھر جب اقصای تہذیب کے صلح پسندوں نے دیکھا کہ اٹلی کا طرابلس پر کوئی زور نہیں چلتا۔ ہمت ہارے

دیتا ہے۔ اور اُس کے حواس بجا نہیں۔ تو سب طرف سے تقاضا ہوا کہ دولت عثمانیہ طرابلس سے دست بردار ہو کے صلح کر لے اور کچھ ایسی ریشہ دوانیاں چالاکیاں اور سازشیں کی گئیں کہ عثمانی وزرات نے اس کو قبول بھی کر لیا۔

اِدھر مہذب احباب یورپ کی صلاح سے اس صلح نامہ پر دستخط ہوئے اور اُدھر انھیں کرم فرماؤں کی عنایت سے تمام ریاستہائے بلقان نے دولت عثمانیہ کے مقابلہ میں اشتہار جنگ دیدیا۔ اور سارے جزیرہ نمائے بلقان میں خون کی ندیاں بہنے لگیں۔ دولت عثمانیہ ان سب کے مقابلہ میں کمزور نہ تھی مگر حسن تدبیر سے وہ کمزور کر دی گئی۔ جانباز سپاہیوں کو پیٹ کی روٹی اور سامان جنگ دونوں سے محروم رکھ کے پٹوایا گیا۔ اور آخر نتیجہ یہ ہوا کہ سوا تھوڑے سے مشرقی علاقہ یورپ کے جو قسطنطنیہ کے حوالی میں ہے۔ تمام مقبوضات یورپ دولت عثمانیہ کے قبضہ سے نکل گئے اور جن علاقوں پر نصرانی ریاست ہائے بلقان کا قبضہ ہوا تھا اُن میں مسلمان رعایا پر ایسے مظالم ہونے لگے۔ کہ سننے سے روئیں کھڑے ہو جاتے ہیں۔ غرض لاکھوں خلقت امن کے زمانے میں بھی تہذیب یورپ کی نذر ہوئی۔

لیکن جو دولت ترکان آل عثمان سے چھینی گئی تھی اُس کا ہضم ہونا آسان نہ تھا۔ غیر منقولہ مال غنیمت کی تقسیم میں دشواریاں آئیں اور اُسی کا نتیجہ ہے کہ جرمنی کی ایسی صاحب علم و فضل قوم نے جو موجودہ ترقیوں کا اعلیٰ ترین نمونہ تصور کی جاتی تھی۔ روس کے مقابل اشتہار جنگ دیا۔ اور فرانس پر صرف اس لئے کہ وہ سلطنت روسیوں کی دوست ہے فوج چڑھائی۔ بیجیم کی غیر جانبداری کے قائم رکھنے کا جو پرانا عہد نامہ تھا۔ اُس کے ساتھ خود بیجیم کو بھی پامال کر ڈالا جس کی وجہ سے انگلستان کی ایسی صاحب علم و صلح جو سلطنت کو بھی اس کے خلاف اشتہار جنگ دیدینا پڑا۔ اور ایک ایسی لڑائی چھڑ گئی جو دنیا کی تمام گذشتہ لڑائیوں سے زیادہ خوفناک ہونے کے ساتھ ساری دنیا میں پھیلی ہوئی ہے۔ یورپ میں چار طرف شمال و مشرق میں روس و جرمن کی

سرحد پر وسط یورپ میں روس و آسٹریا کی سرحد پر۔ شمالی بلقان میں سرویا و آسٹریا کی سرحد پر۔ اور مغربی یورپ میں بلجیم اور فرانس میں کئی ہزار میل کی مسافت تک خون کا مینھ برس رہا ہے۔ ایشیا اور انتہائے مشرق میں سواحل چین پر افریقہ میں زنجبار سے لے کے شمالی و مغربی سواحل افریقہ تک۔ اوشینیا یعنی جزائرستان میں آسٹریلیا اور نیوزیلینڈ کے پاس کے جزائر میں خونریزی ہو رہی ہے۔ اور سمندر جو اگلے دنوں آزاد رہا کرتا تھا۔ آج کل عموماً خطرناک ہے اور جو خطرہ بالٹک اور نارتھ سی کے سواحل سے شروع ہوا۔ اُس سے اٹلانٹک اوشن پے سفک اوشن۔ آرٹک اوشن اور انڈین اوشن تک خطرے سے خالی نہیں ہیں۔

بلقان کے مظلوم مسلمان سعدی کا یہ شعر پڑھ رہے ہیں

دیدی کہ خون ناحق پروانہ شمع را  ــ  چنداں اماں نہ داد کہ شب سحر کند

اور ہمیں مہذب قوموں کا یہ رنگ دیکھ کے یہی ماننا پڑتا ہے کہ تہذیب و شائستگی سوا اس کے کہ انسان کو لڑائی کے لئے زیادہ تیار کرے۔ اور اس کی خونریزی کی قوت و ہوس کو اور بڑھا دے اور کچھ نہیں کرتی۔"

جولائی ۱۹۱۴ء

## عربوں کی فطری جمہوریت

اہل عرب بالطبع جمہوریت پسند واقع ہوئے ہیں۔ اور اسی سبب سے قدیم الایام میں نہ کبھی کسی سے وہ مفتوح ہوئے اور نہ کبھی انہیں کسی غیر قوم کی غلامی کرنی پڑی ان میں ہزارہا سال سے ایک قسم کی طبعی اور فطری جمہوریت چلی آتی تھی۔ باہمی ربط و ضبط قائم رکھنے کے لئے وہ اپنے شیوخ کا حکم ضرور مان لیا کرتے تھے مگر شیخ کی حیثیت قبیلہ کے ایک وکیل یا آجکل کی جدید اصطلاح میں نمائندے کی سی ہوتی جس کی سرداری و سرگروہی کو زیادہ تر سیاسیات خارجہ اور بین الاقوامی معاملات سے تعلق ہوتا۔ مخالفہ (یعنی دو قبیلوں کا باہم دوستی و یکجہتی کا عہد و پیمان کرنا) اُن کے تمام شیوخ کو اور اُن کے ساتھ کل قبائل کو ملا کے ملک میں ایک عام پارلیمنٹ قائم کرا دیتا اور قبائل کے شیوخ اُس پارلیمنٹ کے ارکان بن جاتے

اُن میں قومی آزادی اس قدر بڑھی ہوئی تھی کہ ارض عرب میں اکیلا ہاؤس آف کامنز ہی رہا ہاؤس آف لارڈز کبھی نہ قائم ہو سکا۔

اسلام نے عربوں کی اس فطری جمہوریت کے لئے ایک بین الاقوامی قانون بنادیا جس سے انھیں اور زیادہ آزادی مل گئی۔ اور نظام مملکت قائم ہونے میں خدا اور رسول کی فرمانبرداری کے سوا وہ ہر قسم کی غلامی سے محفوظ ہو گئے۔ پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد جو خلیفہ منتخب ہوئے اُن کی حیثیت بالکل پریسیڈنٹ کی سی تھی۔ جن کی حکومت اُسی حد تک تھی جہاں تک شرعی قانون کے اجرا کا تعلق تھا۔ قرآن مجید نے اُن کی نسبت "اولوالامر منکم" کہہ کے اُن کی پریسیڈنٹ کی حیثیت اور زیادہ مضبوط کر دی۔ اور خدا و رسول کے بعد انھیں بھی حکومت کرنے کا حق مل گیا۔ چنانچہ اسی قرآنی اصطلاح سے اُن کے لئے "امیر المؤمنین" کا خطاب ماخوذ کر لیا گیا۔

کہتے ہیں کہ اولوالامری کی شان خلفائے راشدین کے زمانے تک قائم رہی۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ خلافت راشدہ بھی اس کو آخر تک نہیں نباہ سکی جس کی وجہ یہ تھی کہ اسلامی خلافت اب وہ اگلی عرب ہی کی پارلیمنٹ نہ تھی بلکہ عربوں کو دنیا کی ایک زبردست سلطنت مل گئی تھی۔ اور عربوں کی پارلیمنٹ کو جو صرف علاقہ ہائے عرب کے لئے موضوع تھی دنیا کے بڑے بڑے آباد اور متمدن ملکوں پر فرماں فرمائی کرنی پڑی اور روم و عجم کی سی شخصی سلطنتوں کی رعایا سے سابقہ پڑا جو بادشاہ کو ظل اللہ اور بجائے خلیفہ رسول کے خدا کا نائب اور اس کے کارخانے کا مختار کل بلکہ معبود و مسجود خیال کرتی تھی۔ اور ایسی رعایا سے سابقہ پڑنے کا لازمی نتیجہ تھا کہ عرب کی پارلیمنٹ کے پریسیڈنٹوں سے شخصی فرمان رواؤں اور خود سر تاجداروں کی وضع ظاہر ہونے لگی۔ اور جس طرح سکندر اعظم یونان کو فتح کر لینے کے بعد اہل یونان کے مذاق کا قائم نہیں باقی رہا تھا ویسے ہی عرب کے یہ خلفا دنیا کے بڑے بڑے ملک فتح کر لینے کے بعد صرف ہر نی عربی پارلیمنٹ کے پریسیڈنٹ نہیں رہ سکتے تھے۔ بلکہ لازمی تھا کہ شخصی سلطنتوں کے تاجدار بن جائیں۔

پہلے دو خلیفوں نے اپنی پرانی وضع کو آخر تک نباہا۔ مگر حضرت عثمان کی عبادت گزاری و ترتیب قرآن ہی نے یہ شان دکھادی کہ ممالک مفتوحہ و مقبوضہ کی شکایتوں سے کان بہرے کرلیے۔ اور نتیجہ یہ ہوا کہ حرم مدینہ میں خونریزی ہوئی بازار فتنہ گرم ہوا اور وہ خود کمال مظلومی و استقلال کے ساتھ شہید ہوئے حضرت علی کی خلافت کا آغاز ہی اندرونی جھگڑوں سے ہوا۔ اور ان اندرونی جھگڑوں ہی نے اُس کا خاتمہ بھی کردیا۔ ان جھگڑوں اور خونریزیوں کو عام مؤرخین سول وار بتاتے ہیں۔ مگر دراصل یہ عرب کی قدیم جمہوریت کا جدید شخصیت سے مقابلہ تھا جس میں بہ ظاہر شخصیت کو اور باطناً جمہوریت کو فتح ہوئی۔ اس لئے کہ عرب نے اس خلافت ہی کو جو شاہی بنتی جاتی تھی۔ اپنے آغوش سے نکال کے باہر پھینک دیا۔ خلافت مدینہ سے گئی اور پھر نہ آنے پائی۔

حضرت علی ہی کے عہد میں عرب کے باہر دو دربار قائم ہو گئے تھے۔ ایک کوفہ میں جو ارض عراق میں عربوں کی ایک نو آبادی تھی۔ اور دوسرا دمشق میں جو ارض شام کا بہت ہی پرانا تاریخی شہر تھا۔ کوفے میں آزاد قبائل عرب کے بڑے بڑے شرفا آباد تھے۔ اور جنہوں نے حکومت کی آزادیوں کو ہمیشہ روکا یہاں تک کہ حضرت علیؑ کبھی اُنکو اپنا سچا مطیع و منقاد نہ بنا سکے۔ مگر دمشق و ارض شام کا نشو و نما بھی شخصی حکومتوں کے آغوش میں ہوا تھا۔ لہذا وہاں جب امیر معٰویہ نے اپنے شخصی اقتدارات بڑھائے۔ اور قیاصرۂ روم کی شان و شوکت اختیار کرکے اپنے دربار میں ڈسپلن اور شخصیت بڑھائی۔ تو کسی نے چوں نہ کی۔ اور ساری رعایا غلامی اختیار کرنے کے لئے تیار ہو گئی۔ اور جو دو چار آزاد مشرب عرب وہاں موجود تھے۔ اور دربار کا رنگ دیکھ دیکھ کے بگڑنے لگتے تھے۔ اُن کو معٰویہ نے اپنے حلم اور اپنی فیاضی سے مطیع بنالیا۔ اگرچہ اُن دونوں درباروں میں نہ وہ عربوں کی سادی الولا مری اور نہ وہ اگلی امیر المومنینی مگر کوفہ اور دمشق کی آب و ہوا کا فرق اُس وقت صاف نظر آگیا۔ جب ایک سرکش موذی کی تلوار نے حضرت علی کی خلافت کا خاتمہ کردیا۔ اور اُن کے جانشین حضرت امام حسنؑ کو خود اپنے لشکر کے باہمی اختلافات سے تنگ آکے خلافت چھوڑ دینا پڑی۔ مگر معٰویہ کا شخصی دربار

آخر تک قائم رہا۔

حضرت علی ہی کے عہد میں عربوں کی فطری جمہوریت کا پہلا نمونہ خوارج تھے۔ جن کا خیال تھا کہ علی اور معٰویہ قومی حقوق کی طرف سے بے پروا ہو کے اپنے ذاتی اغراض اور مقاصد کے لیے لڑ رہے ہیں۔ پھر جب دونوں کی مسلمہ پنچایت میں حضرت علی ہی کے نائب نے کہہ دیا کہ دونوں مدعیان خلافت علیحدہ کر دیے جائیں اور کوئی تیسرا شخص خلیفہ منتخب کر لیا جائے اور پھر اس پر حضرت علیؑ نے عمل نہ کیا تو علانیہ بغاوت کر دی۔ آیۂ کریمہ "ان الحکم الا للہ" کو اپنا شعار بنایا اپنے جھنڈے پر اُسے لکھا اور دعویٰ کیا کہ "سوا اُس خلافت کے جو قرآن و حدیث کی پابندی میں حکومت کرے اور سچی اولوالامری ہو۔ کسی حاکم کی تقلید اور غلامی کرنا حرام ہے"۔ یہ لوگ شکستیں کھانے پر بھی فنا نہ ہو سکے۔ اور کوفہ و بصرہ کے اطراف میں بیٹھ کے ہر سلطنت اور خلافت سے سرتابی کرتے رہے۔

اب دمشق میں خلافت کے نام سے شخصی حکومت کا دربار قائم تھا۔ جو قوانین شریعت اور عربی آزاد مشربی سے روز بروز زیادہ دور ہوتا جاتا۔ اس کے فرماں روا بنی اُمیہ تھے۔ جن کی زبان قانون تھی۔ اور سارے ممالک دور دراز ان کے آگے سربسجود تھے۔ مگر عرب کے اندرونی قبائل کو یہ دیکھ دیکھ کے تاب نہ آتی تھی کہ ہماری ہی قائم کی ہوئی خلافت اولوالامری سے فرعونیت بنتی جاتی ہے۔ اور ہم کچھ نہیں کر سکتے۔ اسی جوش نے حضرت امام حسین کو شہید کرایا۔ اور اسی نے چند روز کیلئے عبداللہ بن زبیر کی خلافت خاص مکہ معظمہ میں قائم کرائی۔ مگر دمشق کی شاہانہ فوجوں کے مقابل میں وہ بھی زندہ نہ رہ سکی۔

ابن زبیر کی خلافت کا خاتمہ ہونے کے بعد وسط عرب کے لوگوں کو صبر آگیا کہ۔ خلافت اولوالامری نہیں رہی تو اب وہ ہمارے ملک میں بھی نہیں۔ ہم اپنے ملک میں آزاد ہیں۔ اور وہی پرانی قبیلہ بندیاں موجود ہیں۔ دمشق کا شاہانہ تمرد دوسرے ملکوں کے ساتھ جیسا سلوک چاہے کرے ہماری آزادیوں میں فرق نہیں ڈال سکتا اور جب وہ ہماری آزادیوں میں فرق نہیں ڈالتا تو ہمیں کیا پڑی ہے کہ خواہ مخواہ کو جھگڑے مول لیں۔ مگر اطراف کوفہ و بصرہ کے خوارج کا جوش کسی طرح دھیما پڑنے کو نہ

آتا تھا۔ وہ برابر مقابلہ کئے جاتے تھے۔ اور کوئی بادشاہ ہو اُس کی جان کے دشمن تھے۔ رہ رہ کے بھڑتے تھے۔ گر گر کے سنبھلتے تھے۔ شکستیں کھاتے تھے اور پھر اُٹھ کھڑے ہوتے تھے۔ مارے جاتے تھے اور پہلے سے زیادہ جوش خونخواری کے ساتھ حملہ آور ہوتے تھے۔

دیگر خلفائے بنی اُمیہ نے فوج کشی ہی کے ذریعہ سے اُنھیں دبانا چاہا۔ مگر عمر بن عبدالعزیز نے اُن سے مناظرہ کر کے اپنی علمی قابلیت اور اپنے دینداری کے اثر سے اُن پر فتح حاصل کی جس کا بیان لطف سے خالی نہیں۔ اُس کی خلافت کا آخری سال تھا کہ والی کوفہ عبدالحمید نے رپوٹ کی کہ "بسطام بن یشکر خارجی نے جو شوذب کے لقب سے مشہور ہے۔ اپنے دلیر ساتھی جمع کر کے عراق میں سر اُٹھایا ہے۔ اور برسر پرخاش ہے" عمر نے عبدالحمید کے نام فرمان بھیجا کہ "ان لوگوں کو اپنی طرف سے نہ چھیڑو۔ کسی بہادر اور محتاط سردار کو فوج دے کے اُن کے مقابلے میں بھیج دو۔ مگر تاکید کر دو کہ جب تک وہ لوگ فتنہ انگیزی اور خونریزی کے مرتکب نہ ہولیں۔ اُن سے مقابلہ نہ کرے"۔ اس حکم کے مطابق عبدالحمید نے محمد بن جریر بن عبداللہ بجلی کو احکام خلافت کی پابندی کی تاکید کر کے دو ہزار سپہ گروں کے ساتھ روانہ کر دیا۔ جس نے بسطام کے مقابل میں جا کے پڑاؤ ڈال دیا۔ اور خاموشی سے حریف کے حملے کا انتظار کرنے لگا۔

عمر بن عبدالعزیز نے جس وقت یہ فرمان عبدالحمید کو بھیجا ہے اُسی وقت ایک دوسرا فرمان بدست بسطام کو بھیجا تھا۔ جس کا مضمون یہ تھا کہ "میں نے سُنا ہے تم نے خدا اور رسول کے حکم کے خلاف بغاوت اختیار کی ہے۔ حالانکہ تمہیں مجھ سے زیادہ استحقاق خلافت کا نہیں ہے۔ اچھا آؤ ہم تم مناظرہ کر لیں۔ اگر ہم حق پر ثابت ہوں تو ساری دنیا کے مسلمانوں کی طرح تم بھی میری خلافت کو خاموشی سے قبول کر لو۔ اور اگر تم حق پر ثابت ہو تو ہم غور کریں کہ اس معاملے میں کیا کرنا چاہیئے"۔ بسطام نے معمول کے خلاف جب یہ رنگ دیکھا کہ خلافت کی زبردست فوج سامنے خاموش پڑی ہے اور خود خلیفہ بحث کرنا چاہتے ہیں۔ تو عمر ابن عبدالعزیز کو خط لکھا "آپ جو کچھ فرماتے ہیں بجا درست ہے اور آپ کی خواہش کے مطابق میں اپنے دو معتمد علیہ شخصوں کو یہ خط دے کے بھیجتا ہوں۔ ایک تو بنی شیبان کا ایک حبشی غلام عاصم ہے۔ اور دوسرا میرے

قبیلہ بنی یشکر کا ایک معمولی شخص ہے" دونوں بسطام کا خط لے کے مقام خناصرہ میں پہنچے۔ جہاں اُن دنوں عمر بن عبدالعزیز تھا۔ اور حاضر دربار ہوئے۔

عمر اُن سے اخلاق کے ساتھ پیش آیا۔ اور اطمینان سے قریب بٹھا کے پوچھا "تم لوگوں نے کس لئے بغاوت اختیار کی ہے؟ اور سرتابی کا اصلی سبب کیا ہے"

**عاصم** "ہمیں آپ کے ذاتی افعال و خصائل کی شکایت نہیں۔ جانتے ہیں کہ آپ نیک نفس پابند شرع عدالت گستر ہیں۔ اور لوگوں کے ساتھ اچھا سلوک کرتے ہیں۔ مگر یہ بتایئے کہ آپ اولوالامر کس حق سے بن گئے؟ کیا ساری دنیا کے مسلمانوں نے مشورہ کر کے اور بہ رضا و رغبت آپ کو امام منتخب کیا ہے"؟

**عمر** "نہیں۔ مگر حالت یہ ہے کہ نہ میں نے لوگوں سے خلافت مانگی۔ اور نہ جبراً حاصل کی مگر مجھ سے پہلے وہ جس شخص کے ہاتھ میں تھی۔ عام اس سے کہ اُس نے جائز طور پر حاصل کی ہو یا ناجائز طور پر اُس نے میری جانشینی کی وصیت کر دی تھی اُس وصیت کے بموجب میں نے اس کو قبول کر لیا۔ کسی نے اس سے اختلاف نہیں کیا۔ اور نہ تمہارے سوا کوئی آج تک جھگڑا کرنے والا پیدا ہوا تھا۔ تم لوگوں کی بھی یہ رائے ہے۔ کہ ایسے شخص کو خلیفہ ہونا چاہیئے۔ جو انصاف کرے اور عدالت گستری سے کام لے تو پھر مجھی کو وہ منصف شخص خیال کر لو۔ اور اگر میں حق کے خلاف کوئی کارروائی کروں یا صراط مستقیم سے گمراہ ہو جاؤں تو پھر میری اطاعت تم پر فرض نہ رہیگی"۔

یہ تقریر سُن کے بسطام کے دونوں نائبوں نے کہا "اچھا تو پھر ہمارا آپ کا ایک بات پر فیصلہ ہو جائے"۔

**عمر** "وہ کون سی بات ہے"؟

**عاصم** "ہم دیکھتے ہیں۔ کہ آپ اُن تمام افعال و حرکات و سکنات کو بُرا سمجھتے ہیں۔ جو آپ کے گھرانے کے اگلے حکمرانوں سے سرزد ہوتے رہے۔ اور اُن کو ظالم و جابر مانتے ہیں۔ لہذا اگر یہ آپ کے نزدیک صحیح ہے کہ وہ ضلالت پر تھے۔ اور آپ حق پر ہیں تو اُن پر لعنت بھیجیے"!

**عمر** "میرا خیال ہے کہ تم لوگوں نے دنیا طلبی کے لئے ہتھیار نہیں اُٹھائے ہیں۔ بلکہ فلاح اُخروی کے خواستگار ہو"!

**عاصم:** بیشک ہم دنیا نہیں چاہتے۔"

**عمر:** مگر تمہاری اس درخواست سے تو معلوم ہوتا ہے کہ راہِ راست سے بھٹکے ہوئے ہو۔"

**عاصم:** کیوں؟"

**عمر:** حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ اللہ جل شانہ نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو لعنت بھیجنے والا پیغمبر بنا کے نہیں مبعوث کیا تھا۔ اور ابراہیم خلیل اللہ کا قول تھا۔ کہ بارالہا جو میری پیروی کرے میرا ہے اور جو میرا کہنا نہ مانے اُس کے لئے تو بخشنے والا مہربان ہے۔ اور ان دونوں بزرگوں کی نسبت وہ رب العزت فرماتا ہے یہ وہ لوگ ہیں جنھیں خدا نے ہدایت کی ہے۔ اس لئے تم بھی اُن کی پیروی کرو۔ میں نے ان گذشتہ خلفا کے افعال کو ظلم مان لیا۔ مذمت اور عیب چینی کے لئے اتنا کافی ہے۔ رہا گنہگاروں پر لعنت بھیجنا تو یہ کوئی ایسا فرض نہیں ہے جس سے مسلمان کو مفر ہی نہ ہو۔ اور اگر تمہارے نزدیک فرض ہے۔ تو بتاؤ تم نے فرعون پر کب اور کتنی بار لعنت بھیجی ہے؟"

**عاصم:** ہمیں تو یاد نہیں کہ فرعون پر ہم نے کبھی لعنت بھیجی ہو۔"

**عمر:** تو پھر تمہارے لئے تو اگر فرعون پر بھی لعنت نہ بھیجو جو بدترین خلق تھا کوئی مضائقہ نہیں اور میرے لئے اتنی بھی گنجائش نہیں کہ اپنے اُن خاندانی لوگوں اور قرابت داروں پر لعنت نہ بھیجوں جو مسلمان تھے۔ نمازی تھے۔ روزہ دار تھے۔ اور عبادت گذار تھے؟"

**عاصم:** جور و ظلم کرنے کی وجہ سے کیا وہ کافر نہیں ہو گئے۔

**عمر:** ہرگز نہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو اسلام کی دعوت کی اور جن لوگوں نے وہ دعوت قبول کر لی۔ اور آپ کی شریعت کو مان لیا۔ اُن کے ایمان کو آپ نے تسلیم فرما لیا پھر اس کے بعد اگر اُن سے کوئی گناہ سرزد ہوا تو اُن پر صرف حد جاری کی گئی اسلام سے خارج نہیں کئے گئے۔"

**عاصم:** رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو توحید کی طرف بلایا تھا۔ اور اس کے ساتھ یہ شرط تھی کہ آپ پر خدا جو احکام نازل کرے۔ اُنکے ماننے کا اقرار کریں۔"

**عمر:** بے شک۔ مگر گذشتہ خلفائے بنی اُمیہ میں سے تو ایک بھی ایسا نہیں گذرا جس نے کہا ہو میں احکام نبوت کو نہ مانونگا یا سنت رسول اللہ پر عمل نہ کرونگا

اصل حقیقت یہ ہے کہ شقاوت اُن پر غالب تھی۔ اور جن امور کو حرام جانتے تھے جان بوجھ کے اُن کے مرتکب ہوئے۔"

عاصم: "اچھا لعنت بھیجنے میں آپ کو تامل ہے تو اُن کے افعال پر تبرا کیجیے۔ جو آپ کے عمل کے خلاف ہیں۔ اور اُن خلفا کے احکام کی تردید کیجیے۔"

عمر: "اچھا بتاؤ تم ابوبکر و عمر (رضی اللہ عنہما) کو کیسے سمجھتے ہو؟ حق پر تھے یا باطل پر؟"

عاصم: "حق پر تھے۔ اُن کے افعال کو کون باطل کہہ سکتا ہے؟"

عمر: "تمہیں اس کی خبر ہے کہ ابوبکر نے جب مرتدوں پر حملہ کیا تھا تو اُن کا قتل و قمع کیا۔ اُن کے اہل و عیال کو لونڈی غلام بنایا۔ اور اُن کی جائداد پر قبضہ کر لیا؟"

عاصم: "جی ہاں معلوم ہے۔"

عمر: "اور یہ بھی جانتے ہو کہ ابوبکر کے بعد عمر نے مرتدوں کے اہل و عیال کو فدیہ لے کے چھوڑ دیا تھا؟"

عاصم: "یہ بھی جانتے ہیں۔"

عمر: "تو کیا عمر نے ابوبکر کے اس فعل سے تبرا کیا تھا؟"

عاصم: "نہیں۔"

عمر: "انھوں نے نہ کیا سہی۔ خود تم اُن دونوں خلیفوں میں سے کسی ایک کے فعل سے تبرا کرتے ہو؟"

عاصم: "ہم بھی نہیں کرتے۔"

عمر: "اچھا اب ایک اور بات بتاؤ۔ غالباً تمہیں معلوم ہوگا کہ تمہارے بزرگان دین سب سے پہلے خوارج جو حضرت علی سے لڑتے تھے ان میں سے کوفہ والوں نے کوئی سرکشی پر آمادہ تھے نہ خونریزی کی اور نہ کسی کا مال لوٹا۔ بخلاف اس کے بصرے والے خارجیوں نے یہاں تک بیرحمی اختیار کی کہ عبداللہ بن خباب اور اُن کی لونڈی کو بھی نہ چھوڑا جو حاملہ تھی۔"

عاصم: "ہاں یہ تو ہوا تھا۔"

عمر: "تو کیا جن خوارج نے خونریزی کی تھی خونریزی نہ کرنے والوں نے یا جن لوگوں نے خونریزی نہیں کی تھی خونریزی کرنے والوں سے تبرا کرتے تھے؟"

عاصم: "نہیں۔"

عمر: "انھوں نے نہ کیا تو مضائقہ نہیں تم اُن دونوں فریقوں میں سے کسی ایک سے

تبرا کرتے ہو؟"

عاصم: "نہیں ہم بھی نہیں کرتے۔

عمرؔ: "تو پھر تمہارے لئے تو اسقدر گنجائش ہے کہ ابوبکر و عمر اور اپنے کوفے اور بصرے والے دونوں گروہوں کے ساتھ باوجود اُن کے باہمی اختلاف اعمال کے تولا کرتے ہو مگر مجھے اپنے اُن عزیزوں سے جو مسلمان اور دیندار تھے تبرّا کئے بغیر مفر نہیں؟"

اس کے بعد عمر بن عبدالعزیز نے اُنھیں لاجواب دیکھ کے سمجھانا شروع کیا کہ "خدا سے ڈرو! سچ یہ ہے کہ تم لوگ جاہل ہو۔ اور سمجھ سے کام نہیں لیتے۔ جن باتوں کو رسول اللہ صلعم نے منع کیا ہے اُنھیں تو جائز کر لیتے ہو۔ اور جن باتوں کو جائز بتایا ہے اُن سے لوگوں کو منع کرتے ہو جس شخص کے لئے رسول اللہ صلعم سے خوف تھا۔ اُسے تمہارے یہاں امان ملتی ہے اور جسے آپ نے امان دی تھی اُس کے تم جانی دشمن ہو! کلمہ گو کو تمہارے یہاں امان نہیں ملتی حالانکہ آنحضرت اُسے امان دیتے تھے۔ اور اُس کی جان و مال پر دست درازی کرنا حرام بتاتے تھے۔ تمام مذاہب کے پیرؤوں کا خون تم اپنے اوپر حرام سمجھتے ہو تمہارے یہاں ایک حلال ہے تو کلمہ گو کا خون!"

یہ تقریر سن کے بسطام کے وہ دونوں سفیر عاجز اور لاجواب تھے۔ اور سر جھکائے ہوئے سوچ رہے تھے۔ آخر وہ یشکری شخص سر اُٹھا کے بولا: "اچھا ایک بات بتایئے فرض کیجئے کہ ایک شخص کسی قوم کی جان و مال کا مالک ہوا۔ اُن لوگوں کے ساتھ انصاف اور نیکی کرتا رہا لیکن آخر میں اپنی وہ حکومت اُس نے ایک شخص کو دیدی جو اُس کا اہل نہ تھا آپ ایسے شخص کی نسبت کیا کہتے ہیں؟ اُس نے خدا ترسی کا حق ادا کیا یا نہیں؟"

عمرؔ: "ہرگز نہیں ایسے شخص کی نسبت کون کہہ سکتا ہے کہ اُس نے خدا ترسی کا حق ادا کر دیا؟"

یشکری: "ایسا ہے تو پھر آپ یہ خلافت یزید بن عبدالملک ؏ کو کیوں دیے جاتے ہیں۔

؏ آل مروان کا سب سے زبردست خلیفہ عبدالملک بن مروان وصیت کر گیا تھا کہ اُس کے بیٹے ولید سلیمان اور یزید ایک دوسرے کے بعد وارثِ تخت و خلافت ہوں۔ عمر بن عبدالعزیز عبدالملک کا بھتیجا تھا۔ سلیمان نے وصیت کر دی کہ اُس کے بعد اُس کا ابن عم اور پھر اُس کے بعد سگا بھائی یزید خلیفہ ہو۔

جس کی نسبت آپ جانتے ہیں کہ حق پر نہ رہے گا؟"

**عمر**: "مگر اُسے میں نے اپنا ولی عہد نہیں قرار دیا ہے بلکہ اُس کے بارے میں عبدالملک اور سلیمان مجھ سے پہلے وصیت کر گئے ہیں میں اس بارے میں کچھ نہیں کہتا۔ جب اُس کا زمانہ آئیگا تو مسلمانوں کو اختیار ہوگا کہ اُس کی اطاعت کریں یا نہ کریں۔"

**یشکری**: "یہ میں نے مانا کہ آپ نے اُسے ولی عہد نہیں بنایا۔ مگر جس کسی نے بنایا اُس کے اس فعل کو آپ کیسا خیال کرتے ہیں جائز یا ناجائز؟"

یہ الفاظ سُن کے عمر بن عبدالعزیز کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے پھر ضبط کر کے کہا "اس کے جواب کے لئے مجھے تین دن کی مہلت دو۔" بسطام کے دونوں سفیروں نے قبول کیا یہ صحبت اسی پر ختم ہو گئی۔ اور وہ دونوں رخصت ہو کے اپنی فرودگاہ کو گئے۔

اس کے بعد جب وہ دونوں عمر بن عبدالعزیز سے ملے تو عاصم نے صورت دیکھتے ہی کہا "میں تو اعتراف کرتا ہوں کہ آپ بالکل برسر حق ہیں۔" عمر نے یشکری سے پوچھا اور تم کیا کہتے ہو؟ بولا "آپ کی جو کچھ تعریف کی گئی ٹھیک ہے مگر میرا ابھی اطمینان نہیں ہوا میں نے جو کچھ کہا ہے اسے عام لوگوں کے سامنے پیش کیجئے اور دیکھئے کیا کہتے ہیں۔"

یہ کہہ کے وہ یشکری واپس گیا اور عاصم عمر ہی کے پاس رہ گیا۔ عمر نے اُسے انعام دیا اور اچھی طرح رکھا مگر اس کی عمر نے وفا نہ کی۔ آنے کے پندرھویں ہی دن مرگیا لیکن اس واقعہ کے بعد سے عمر بن عبدالعزیز کی یہ حالت تھی کہ بار بار زبان سے نکل جاتا تا۔ "یزید بن عبدالملک کے معاملہ نے مجھے خاک میں ملا دیا۔" یہ سُن کے بنی اُمیہ کو اندیشہ ہوا کہ ایسا نہ ہو۔ عمر بن عبدالعزیز دینداری کے جوش میں آ کے کسی غیر کو ولی عہد مقرر کر دے یہ ہوا تو غضب ہی ہو جائیگا اور پھر خلافت بنی اُمیہ کے گھرانے میں نہ رہیگی۔ اسی خطرے سے بچنے کے لئے لوگوں نے سازش کر کے عمر بن عبدالعزیز کو ایک شخص کے ہاتھ سے زہر دلوا دیا۔ اور چند ہی روز میں اس کا خاتمہ ہو گیا۔ مگر اُس کی وفات سے پہلے ہی اُس کی باتوں سے متاثر ہو کے بسطام سرکشی سے باز آگیا۔ اور جو خلافت کی فوج اس کی روک تھام کے لئے گئی تھی واپس آئی۔

اگست ۱۹۱۴ء

# اَکْرِمُوا عَزِیزَ قَومٍ ذَلَّ

یہ ایک فرمان رسالت ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ "کوئی معزز شخص ذلیل ہو جائے تو اُس کی عزت کرو" انقلابات عالم نے صدہا ایسے واقعات پیش کیے ہیں جو مایۂ عبرت ہیں۔ اور جن کو دیکھ کے بڑے بڑے سنگدل لوگوں کے دل تھرا اُٹھے ہیں۔ مگر افسوس ہمارے دل ایسے سخت ہو گئے ہیں کہ ہمیں کسی چیز سے عبرت نہیں ہوتی۔ ہم خاندان تیموریہ کی بیسیوں یادگاروں اور اگلے دولتمند گھرانوں کے بہت سے باقیات الصالحات کو حد سے زیادہ تباہی و مفلوک الحالی اور انتہا سے گزری ذلت و مسکنت میں دیکھتے ہیں اور دل نہیں پسیجتا۔

اگر سلطنت اُن کے ہاتھ سے نکل گئی اور سطوت و جبروت نے اُن کا ساتھ چھوڑ دیا تو کیا قوم میں بھی اتنی قوت نہیں ہے کہ اپنی تاریخ کے ان بوسیدہ و کرم خوردہ تبرکات کو عزت سے نہیں تو حفاظت ہی سے رکھے! موجودہ گورنمنٹ کو الزام دینا یا ایسے ستم کشوں کا بار برٹش گورنمنٹ کے سر ڈالنا حماقت ہے۔ کیونکہ سلطنت پر اُن کے کوئی حقوق نہیں۔ مگر ہم پر اُن کے حقوق ہیں۔ دراصل یہ ہماری قومی زندگی کی موتیں ہیں۔ اور ہماری قومی زندگی ہی فیصلہ کر سکتی ہے کہ ان یادگار صورتوں کو اچھی طرح رکھیں یا بری طرح۔ سچ یہ ہے کہ ہم میں ایسی نفسی نفسی پڑ گئی ہے کہ قومی زندگی باقی ہی نہیں رہی۔ ورنہ کیا ممکن تھا کہ ہمارے تاجداران سلف کی نسل یوں غارت ہو! اور آغوش سلطنت میں پلے ہوؤں کی اولاد دردر دریوزہ گری کرے؛ ہرگز نہیں۔ ہم بد نظمی اور بے اصولی کے ساتھ صدہا فیاضیاں کر رہے ہیں۔ اور کسی ایسے قومی فنڈ کا قائم ہو جانا دشوار نہ تھا کہ ملوک سلف کی نسل عزت سے رکھی جائے۔ اور اس کی اولاد کو اچھی تعلیم و تربیت دے کے سنبھالا جائے۔ مگر اپنے ذاتی اغراض پر قومی مقاصد کو قربان کر دیا ہے۔ اور اپنی نفس پروری کے آگے اس کی مطلق پروا نہیں کرتے کہ ہماری قومی عزت کس طرح خاک میں مل رہی ہے اور ہمارے نامورانِ سلف کی نسل کا کیا حال ہے۔

مگر ہم ہمیشہ ایسے بے حس نہ تھے عبرتناک واقعات کا ہم پر اثر ہوتا تھا۔ اور

نوعی فلاح اور قومی وقار کو شخصی جذبات پر ہم قربان نہیں کیا کرتے تھے۔

جب بنی امیہ کی سلطنت کا خاتمہ ہو گیا اُس بد نصیب خاندان کے تمام لوگ چُن چُن کے مار ڈالے گئے۔ نئی خلافت عباسیہ کے دو تاجدار کامرانی و اطمینان سے حکومت کر کے دنیا سے رخصت بھی ہو گئے۔ اور بنی اُمیہ کا مشرق میں کہیں نام و نشان نہ تھا تو تیسرے عباسی خلیفہ مہدی کے زمانے کا واقعہ ہے کہ اُس کی لونڈی خیزران (جسے خاص محل کا رتبہ حاصل تھا۔ سارے حرم کی مالک اور ولی عہد سلطنت کی ماں تھی) ایک دن محل میں شان و شوکت سے بیٹھی حکومت کر رہی تھی کہ ایک لونڈی نے آکے ادب سے عرض کیا، "خدا ملکۂ عالم کو سلامت رکھے ڈیوڑھی پر ایک حسین عورت کھڑی ہے اور باریابی کی اُمیدوار ہے۔ ہزار پوچھا نہ اپنا نام و نشان بتاتی ہے نہ نسب و خاندان کا پتہ دیتی ہے۔ اور نہ یہ کہتی ہے کہ غرض کیا ہے۔ عبداللہ بن عباس کی پر پوتی زینب بنت سلیمان جو خاتونانِ بنی عباس میں صاحب ذہن رسا مانی جاتی تھیں پاس بیٹھی تھیں۔ خیزران نے اُن سے کہا "تم اس عورت کے بارے میں کیا کہتی ہو؟ آنے دوں یا نہ آنے دوں؟" زینب نے کہا "بلوا لیجئے۔ کوئی مفید ہی بات ہو گی" اس مشورے کے مطابق لونڈی کو حکم دیا گیا کہ "جاؤ بلا لاؤ"

چند منٹ گزرے ہوں گے کہ اُس لونڈی کے ساتھ ایک نہایت ہی حسین و صاحب جمال مگر فلاکت زدہ اور شکستہ حال عورت شریف زادیوں کے انداز سے آئی۔ مگر خیزران کا سامنا ہوتے ہی دروازے کے دونوں پٹوں کے درمیان ہی ٹھٹک کے کھڑی ہو گئی اور وہیں سے کہا "اے ملکۂ عالم آپ کی خدمت میں آداب عرض کر کے التماس ہے کہ میں آخری تاجدار بنی اُمیہ مروان بن محمد کی بیٹی مزنہ ہوں" یہ نام سنتے ہی جیسے خیزران کے تن بدن میں آگ لگ گئی اور جھنجھلا کے کہا "تیرے لئے نہ مرحبا ہے اور نہ سلام کا جواب۔ خدا تجھے غارت کرے۔ وہ گھڑی بھی تجھے یاد ہے جب ابراہیم بن محمد عباسی کی لاش بے گور و کفن پڑی تھی اور بنی عباس کی بوڑھی عورتوں نے تیری خدمت میں حاضر ہو کے التجا کی تھی کہ اپنے باپ سے سفارش کر کے اُن کے دفن کی اجازت دلوا دے۔ لیکن بجائے

ترس کھانے کے تو غصے سے اُنھیں مارنے کو دوڑی۔ اُنھیں گالیاں دیں۔ اور اپنے محل سے نکلوا دیا! خدا کا لاکھ لاکھ شکر کہ اُس نے اپنی نعمت تجھ سے چھین لی۔ اور تجھے ذلیل و خوار کر کے اس دہاڑے کو پہونچایا!" خیزران کی زبان سے یہ طیش کا جواب اور یہ کلمات غیظ و غضب سُن کے مزنہ نے بجائے اس کے کہ ڈرے یا کچھ مرعوب ہو زور سے ایک قہقہہ لگایا۔ اور بولی "بہن۔ آپے سے باہر نہ ہو۔ اچھا یہ تو بتاؤ۔ کہ میری اس بدسلوکی پر خدا نے مجھے جو جو ایذائیں دی ہیں اُن میں سے تمھیں کون سی سزا پسند ہے۔ جو میرا ہی سا سلوک تم بھی میرے ساتھ کر رہی ہو؟ تم جو کچھ کہتی ہو سچ ہے۔ خدا کی قسم میں نے یہی کیا تھا۔ اور اُس کی سزا یہ ملی کہ خدا نے مجھے ذلیل و خوار اور ننگا بھوکا کر کے تمھارے سامنے لایا ہے۔ کہ جو سلوک چاہو کرو۔ اُس وقت تم نے میرے اُس سلوک پر جو صبر و شکر کیا تھا اُس کا انعام تمھیں یہ ملا کہ ملکۂ عالم ہو اور میں تمھارے سامنے عاجز و خوار بنی کھڑی ہوں" اتنا کہتے ہی مزنہ نے کہا "لو بہن خدا حافظ جاتے ہیں"! اور پیٹھ پھیر کے چلی کہ جھپٹ کے محل سے نکل جائے۔

اُس کی ان باتوں کا خیزران کے دل پر کچھ ایسا اثر پڑا تھا کہ بے تحاشا دوڑی۔ لپک کے روکا اور چاہا کہ گلے لگا لے۔ مگر مزنہ نے دونوں ہاتھوں سے الگ کر کے کہا "میں اس قابل ہی نہیں ہوں کہ تم سی بلکہ مجھے گلے لگا لے۔ چیتھڑے لگائے ہوں۔ اور ان کپڑوں میں ایسی تعفن آ رہی ہے کہ آپ کا دماغ خراب ہو جائے گا" یہ سُن کے خیزران نے لونڈیوں کو حکم دیا کہ "فوراً انھیں حمام میں لے جا کے غسل کراؤ اس کے بعد پُر تکلف جوڑا پہنا کے اور عطر میں بسا کے لے آؤ"!

یہ کہہ کے خیزران چلی آئی اور محل کی لونڈیوں نے نہایت ہی تعظیم و تکریم سے مزنہ کو نہلایا۔ کپڑے پہنائے عطر لگایا۔ اور خوب بنا چُنا کے لے آئیں۔ صورت دیکھتے ہی خیزران اس کے سینے سے لپٹ گئی۔ پھر اپنے برابر مسند پر جہاں خود خلیفہ مہدی آ کے بیٹھا کرتا تھا بٹھایا اور پوچھا "دستر خوان بچھواؤں؟" مزنہ نے صاف صاف کہا "آپ پوچھتی کیا ہیں؟ شاید مجھ سے زیادہ بھوکا سارے

اس محل میں کوئی نہ ہوگا۔" فوراً دستر خوان بچھا۔ قسم قسم کے کھانے لا کے چن دیئے گئے۔ اور مزنہ نے خوب سیر ہو کے کھایا۔ خواصوں نے ہاتھ دھلوائے۔

اور جب ہر طرح کی خاطرداریوں سے فراغت ہولی تو خیزران نے کہا "اب بہن بتاؤ تمہارا خبر گیراں کون ہے؟" بولی "خبر گیراں! سنو جو کچھ قرابت ہے اسی گھر سے ہے۔ اس کے سوا میں ساری دنیا میں کوئی عزیز قریب نہیں رکھتی۔" یہ جواب سُن کے خیزران بولی "تو پھر تم یہیں رہو۔ چلو میں اپنے محل تمہیں دکھاتی ہوں۔ اُن میں سے جو محل پسند آئے لے لو۔ اور اس میں رہو۔"

اس تجویز کے مطابق خیزران نے اُسے اپنے سارے محل دکھائے۔ جن میں سے ایک خوبصورت وسیع اور پُرفضا قصر اُس نے پسند کیا۔ خیزران نے وہیں کھڑے کھڑے فرنیچر سے اُسے خوب آراستہ کرایا۔ اور ہر طرح کا سامان زندگی فراہم کر کے کہا "لو بی تم یہاں آرام سے رہو سہو۔ اور آج سے مجھ میں تم میں بہنا پا ہوگیا۔ جب تک جیتے ہیں ساتھ نہ چھوڑیں گے۔" مزنہ نے شکریہ ادا کیا۔ اور خیزران اُسے وہاں چھوڑ کے اپنے محل میں آئی۔ پھر دل میں کہنے لگی "کبھی اس عورت کی جو کچھ شان تھی تھی۔ لیکن زمانے نے سرد مہری کی۔ اور دل شکستہ ہوگئی۔ اب اس کے دل کی کلفت صرف دولت سے دور ہو سکتی ہے۔" یہ خیال کرتے ہی پانچ لاکھ درہم اُس کے پاس بھجوا دیئے۔

خیزران ان کاموں سے فارغ ہو کے بیٹھی ہی تھی کہ اس کا صاحب تاج و تخت شوہر خلیفہ مہدی آگیا اور حالات پوچھنے لگا۔ خیزران نے مسکرا کے کہا "آج عجیب واقعہ پیش آیا۔ ایک لونڈی دوڑتی ہوئی آئی۔ وہ کہا کہ کوئی عورت اندر آنا چاہتی ہے۔ میں نے بلوالیا۔ کیا دیکھتی ہوں کہ ایک جوان اور خوبرو مگر نہایت ہی شکستہ حال عورت ہے۔ آتے ہی اُس نے مجھے ملکۂ عالم کے لقب سے خطاب کر کے سلام کیا اور بتایا کہ مروان بن محمد کی بیٹی مزنہ ہے نام سنتے ہی میں مارے غصے کے آپے سے باہر ہوگئی۔ خوب گالیاں دیں اور کہا "وہ وقت یاد کرو کہ ابراہیم بن محمد کی لاش پڑی تھی۔ اور عباسی گھرانے کی

پڑھیوں نے تجھ سے تجہیز وتکفین کی اجازت دلوانے کی درخواست کی تو تو انھیں مارنے کو دوڑی۔ خوب ہوا جو خدا نے تجھے اس دہاڑے کو پہونچا دیا" یہ سُن کے وہ قہقہہ مار کے ہنسی اور کہا "میں نے بے شک یہی کیا تھا اور خدا سے اس کا بدلہ بھی پایا۔ اب کیا تم بھی خدا سے ایسا ہی بدلہ لینا چاہتی ہو جو میرے ساتھ یہ سلوک کر رہی ہو!" یہ کہہ کے وہ واپس چلی"

خیزران یہیں تک کہنے پائی تھی کہ مہدی کو زیادہ سننے کی تاب نہ رہی بات کاٹ کے بولا "افسوس۔ خدا نے تمہیں ان نعمتوں پر شکر گزار ہونے کا موقع دیا تھا مگر تم نے وہ موقع ہاتھ سے کھو دیا۔ میرے دل میں تمہاری اس قدر جگہ نہ ہوتی تو قسم کھا کے کہتا ہوں کہ تمہاری اس حرکت پر پھر کبھی زندگی بھر تم سے بات نہ کرتا"

خیزران نے کہا "امیرالمومنین۔ آپ سُنیں تو سہی۔ میں نے یہ سُن کے اُس سے بے انتہا معذرت کی۔ روک کے اُسے حمام میں نہلوایا۔ اچھے کپڑے پنھائے عطر لگایا کھلایا پلایا۔ پھر راضی کر کے اس سے بہنا پا کر لیا۔ اور اپنے سارے محل دکھا کے جس محل کو اُس نے پسند کیا اُس کے حوالہ کیا۔ اُس کو آراستہ اور ضروری سامان سے مرتب کیا۔ یہ وعدہ کر کے آئی کہ اب زندگی بھر تمہارا ساتھ نہ چھوڑوں گی اور یہاں آتے ہی خرچ کے لئے اُس کے پاس پانچ لاکھ درہم بھیج دیئے ہیں"

یہ سُن کے مہدی بہت خوش ہوا۔ خیزران کے حسنِ سلوک کی تعریف کی اور اپنے ایک خادم کو بلا کے حکم دیا کہ "اسی وقت جا کے اشرفیوں کے سو توڑے میری طرف سے بھی اُسے دے آؤ۔ میرا سلام کہو۔ اور کہو کہ تمہاری خدمت کرنے کی وجہ سے جس قدر خوش میں آج ہوا ہوں کبھی زندگی بھر نہ ہوا تھا" کہنا "تمہاری قدر و منزلت کرنا امیرالمومنین پر واجب ہو گیا ہے اور اگر تمہارے ناراض ہونے کا اندیشہ نہ ہوتا تو وہ خود تمہارے سلام کو حاضر ہوتے" یہ پیام سُنتے ہی مزنہ خود چلی آئی۔ ادب سے سلام کیا۔ خیزران کے احسانات بیان کر کے اُس کی محبت و شرافت کی تعریف کی۔ اور بولی "میں بھلا حضور سے کیا ناراض

ہوں گی! میری حیثیت ہی کیا ہے! محل کی لونڈیوں میں سے ایک میں بھی ہوں"
مہدی اس پر بہت خوش ہوا۔ اور مزنہ اپنے نئے قصر میں واپس گئی۔

اس کے بعد مزنہ ہمیشہ خیزران ہی کے ساتھ رہی۔ یہاں تک کے مہدی کے سفر آخرت کے بعد اُس کے پہلے بیٹے ہادی کے عہد خلافت میں بھی اُسی سے وابستہ تھی۔ پھر جب خیزران کے دوسرے اقبال مند فرزند ہارون رشید کا عہد شروع ہوا۔ تو رشید بھی مزنہ کی بڑی خاطر داشت کرتا تھا۔ جو پاس خاطر تمام عباسیہ اور ہاشمیہ خاتونوں کا تھا وہی اُس کا بھی تھا۔ اور خلافت رشید کے اوائل میں جب مزنہ کا انتقال ہوا تو رشید اُس کے جنازے پر زار و قطار رویا۔ اور شاہانہ کر و فر سے جنازے کو قبرستان میں لے گیا۔

آہ! خدا کی نعمتوں کا شکریہ ادا کرنے میں کبھی ہمارا یہ سلوک دشمنوں کے ساتھ تھا۔ کاش اب اتنا نہیں تو اُس کا عشر عشیر دوستوں ہی کے ساتھ ہوتا۔ مگر نہیں۔ اب ہم نفس کے بندے ہیں۔ صرف اپنے نفس کو دیکھتے ہیں۔ اور نہیں پتہ لگتا کہ ہم میں اور بہائم میں کیا فرق رہ گیا ہے؟

## عبرتناک عیش

عشق و محبت نے دنیا میں مختلف کرشمے دکھائے ہیں۔ ہجراں نصیبوں کو آزار پہونچایا ہے۔ اور ہمکناران شام آرزو کو بڑے بڑے لطف دکھائے ہیں جس عشق کے یہی دو نمایاں پہلو ہیں جن سے ہمارا لٹریچر بھرا ہوا ہے۔ اور مشرق و مغرب کے تمام خیال آفریں انھیں کیفیتوں پر طبع آزمائی کرتے اور زور قلم دکھاتے رہے ہیں مگر کبھی کسی موقع پر اسی محبت اور الفت اور شاہد پرستی و عیش طلبی نے زمانے کو کوئی ایسا عبرت ناک سبق بھی دیدیا ہے کہ اُس کے دلخراش اثر اور پر عبرت منظر نے وصال و فراق دونوں کی پر اثر کیفیتوں کو بالکل بے مزہ کر دیا۔

دنیا ایک ایسا تھیٹر ہے جس کے تماشائی یا تو صبح وصال میں مقصد وری و کامرانی کا تماشا دیکھنے میں مصروف و محو رہتے ہیں۔ یا شب فراق کی گھڑیاں گنتے اور

حسرت و ناکامی پر آنسو کھینچنے میں منہمک پائے جاتے ہیں۔ ان دو باتوں کے سوا اور کسی چیز کی طرف کسی کا خیال کم جاتا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ انقلاب عالم کی عبرت ناک سرگزشتوں کو اگر اچھی طرح اور موثر الفاظ میں دکھایا جائے تو اُن سے زیادہ پُر اثر کوئی چیز نہیں ہو سکتی۔

دولت عباسیہ کے زمانۂ وسطیٰ میں جب خلفا کا زور کم ہو گیا تھا اور ظاہری شان و شوکت بڑھی ہوئی تھی۔ ایک عدیم المثال مہ جبیں تھی فریدہ۔ عمرو بن بانہ نام ایک شخص نے اُسے تمام فنون عیش کی اعلیٰ ترین تعلیم دے کے آفت روزگار بنا دیا تھا۔ چنانچہ حسن و جمال کے علاوہ شاعری۔ بذلہ سنجی۔ رقص و سرود۔ ذہانت و طباعی اور ادبی قابلیت میں وہ بے عدیل و نظیر تھی۔ اس کے کمالات کی شہرت یہاں تک ہوئی کہ خلیفۂ واثق باللہ اس کے شمع رخسار کا پروانہ ہو گیا۔ اور حریم خلافت میں داخل ہو کے وہ ملکۂ عالم بن گئی۔ واثق کو بغیر اُس کے کسی بات میں لطف نہ آتا تھا اور بے اُس کے زندگی دشوار معلوم ہوتی تھی۔

اُسی عہد کا ایک بذلہ سنج درباری محمد بن حارث جو اکثر خلفا کا ندیم صحبت رہا تھا اور واثق کو اُس سے خاص اُنس تھا بیان کرتا ہے کہ میں جمعہ کو واثق کے دربار میں جا کے اُس کی صحبت عیش میں شریک ہوا کرتا تھا۔ یہ بھی معمول تھا کہ جس کسی کا جو دن مقرر تھا اُس کے سوا اور کسی دن وہ دربار میں ہرگز نہ جا سکتا تھا۔ میں جمعہ کے علاوہ ایک اور دن اپنے گھر میں بیٹھا تھا کہ ناگہاں شاہی چوبداروں نے آ کے گھیر لیا۔ اور کہا۔ "چلو امیر المومنین نے بلایا ہے"! میں نے کہا "آج میرا دن نہیں ہے۔ جمعہ کے سوا اور کسی دن میں کبھی دربار میں نہیں گیا۔ تمہیں شاید کچھ دھوکا ہو گیا ہے۔ امیر المومنین نے مجھے ہرگز نہ ——" چوبداروں نے بات کاٹ کے کہا "زیادہ فضول باتیں نہ کرو۔ ہمیں حکم ہے کہ جیسے تم بیٹھے ہو ویسا ہی لیجا کے حاضر کر دیں۔ اور تمہیں بات کرنے کی بھی مہلت نہ دیں" یہ سُن کے میرے حواس جاتے رہے۔ دل میں کہا۔ معلوم ہوتا ہے آج قضا آ گئی۔ کسی نے کوئی بات لگا دی ہے یا خود امیر المومنین کے دل میں کوئی خیال پیدا ہو گیا ہے۔ مگر مرتا کیا نہ کرتا! دل ہی دل میں دعائے توبہ پڑھتا چل کھڑا ہوا۔ ڈیوڑھی پر پہونچتے ہی میں اُس دیوان خانے کی طرف چلا جہاں عموماً بار یاب

ہوا کرتا تھا۔ مگر چوبدار پکڑ کے دوسری طرف لے چلے۔ ڈر سے میرا لہو خشک ہو گیا۔

اب محل کے اندرونے راستوں سے مجھے لئے جاتے تھے جن سے میں بالکل ناواقف تھا۔ پہلے ایک مکان میں لے گئے جس میں زربفت کا فرش تھا اور دیوار پر بھی زرکار اطلس منڈھی ہوئی تھی۔ اور اپنے تکلفات سے وہ ایک طلسمی مکان معلوم ہوتا تھا۔ وہاں سے آگے بڑھ کے وہ مجھے ایک ہال میں لے گئے۔ یہاں اس سے زیادہ تکلف کا فرش تھا۔ اور دیواروں کی پوششیں بھی زیادہ دلکش و دلفریب تھیں۔ اس میں میں نے دیکھا کہ بیچوں بیچ میں ایک مرصع طلائی تخت پر واثق بیٹھا ہے اس کے پہلو میں ملکۂ عالم فریدہ ہے جس کے عالمتاب حسن کے آگے نگاہیں خیرہ ہوئی جاتی تھیں۔ دونوں زرکار ریشمی کپڑے پہنے ہیں۔ اور فریدہ کی گود میں سرود ہے۔

میرے آہٹ پاتے ہی واثق نے نگاہ اٹھا کے دیکھا اور کہا "بھئی خوب آئے! آؤ آؤ بیٹھو!" میں زمیں بوس ہو کے آداب بجا لایا۔ اور عرض کیا "میری خیریت تو ہے؟" بولا "ہاں تم خیریت ہی پاؤ گے۔ دیکھتے نہیں کہ میں کس عیش و عشرت کے عالم میں ہوں! خدا کی قسم اس وقت دل کسی تیسرے شخص کو ڈھونڈھ رہا تھا جو شریک صحبت ہو کے ہمارا لطف بڑھا دے۔ ایسا شخص تمہارے سوا کون ہو سکتا تھا! لے اب کچھ کھاؤ پیو اور قریب آ کے بیٹھو۔" اس مرحمت و عنایت کے شکریہ میں میں پھر آداب بجا لایا۔ اور عرض کیا "امیر المومنین کے اقبال کی قسم میں سیر ہو کے کھا کے چکا ہوں۔" کہا "اچھا تو پھر میرے پاس آ کے بیٹھو" اور ساقیہ سے کہا "انھیں لا کے ایک جام پلا دو۔" میں شراب ارغوانی کا ایک جام پی چکا تو اس نے فریدہ سے کہا "اب تم اپنا نغمۂ جان بخش شروع کر دو۔" حکم پاتے ہی اس نے سرود کے تاروں پر دو شعر گائے اور معلوم ہوا کہ ہم ہی نہیں گرد کی فضا اور سارے عالم پر جادو کر دیا۔ واثق کی یہ حالت تھی کہ بار بار اسے پکڑ کے اپنی طرف کھینچتا تھا اور وہ دلفریب چشم و ابرو سے بتاتی اور دلکشی سے ہمیں گائے جاتی تھی۔ اور اس طرح تانوں پہ تانیں لگاتی تھی کہ معلوم ہوتا۔ دلیں ناسور

ڈالے دیتی ہے درمیان درمیان میں وہ بار بار مجھے گانے کا اشارہ کرتا۔ اور میں
بھی دو ایک تانیں اُڑا دیتا۔ غرض عجیب لطف کی صحبت تھی اور عجب سماں
بندھا ہوا تھا۔

ان لطفوں پر بیتابیاں ظاہر کرتے کرتے یکایک واثق نے اس زور سے
ایک لات نازک بدن فریدہ کے سینہ پر ماری کہ سرود الگ گر کے ٹوٹ گیا اور
وہ تخت پر سے لڑھکنیاں کھاتی ہوئی دور جا پڑی۔ یہ دیکھتے ہی میرا دم نکل گیا۔ میں نے
بار بار آنکھوں سے فریدہ کے باغ حسن کی گل چینی کی تھی اور اُس نے بھی مسکرا مسکرا
کے میری طرف دیکھا تھا۔ خیال ہوا کہ اسی پر بدگمان ہو کے واثق نے فریدہ کے ساتھ
یہ سلوک کیا ہے اور عنقریب میری گردن مارنے کا حکم دیگا۔ اب واثق متفکر و سرنگوں
تھا اور میں اپنے قتل کے حکم کا منتظر تھا کہ یکایک اُس نے میری طرف نظر اُٹھائی
اور کہا "محمد!" میں نے دست بستہ ہو کے کہا "حضور!" بولا "افسوس ہمارا عیش
کیسا منغص ہو گیا!" میں نے عرض کیا "حضور دیکھا۔ اور خدا غارت کرے اُس شخص کو
جس نے ہمارے عیش کو نظر لگا دی۔ مگر امیر المومنین! میرا کچھ قصور بھی تو معلوم ہو!"
بولا "قصور کسی کا نہیں ہے۔ میرے دل میں اس وقت بیٹھے بیٹھے یہ خیال گزرا کہ اسی
مکان اور اسی صحبت میں یونہیں جعفر (اس کا بیٹا اور ولی عہد) بیٹھا ہوا ہے۔ اور فریدہ
اسی طرح اُس کے پہلو میں بیٹھی گا رہی ہے۔ یہ خیال بڑھتے بڑھتے اس درجہ کو
پہنچا کہ مجھ سے بے اختیار یہ حرکت سرزد ہو گئی" اُس کی زبان سے جب میں نے یہ
الفاظ سُنے تو میری جان میں جان آئی۔ اور ہاتھ جوڑ کے عرض کیا "امیر المومنین ایسا
خیال نہ فرمائیں۔ خدا جعفر کو ہلاک کریگا۔ اور حضور کا یہ عہد صد و سی سال تک
قائم رہے گا!"

پھر میں نے زمین بوس ہو کے کہا۔ "امیر المومنین اپنی اس محبوبہ کے حال پر رحم
فرمائیں اور اب اُسے پھر اپنے پہلو میں بٹھا لیں!" واثق نے بعض خدام کو اشارہ کیا۔
جنھوں نے ایک آن کی آن میں اُس کے کپڑے بدلوائے۔ دوسرا سرود اُس کے
حوالے کیا۔ اور پھر اُسے لا کے واثق کے پہلو میں بٹھا دیا۔ اب واثق کو اپنی حرکت
پر بڑی ندامت تھی جس کے دور کرنے کے لئے فریدہ کو پکڑ پکڑ کے اپنی طرف

کھینچنے اور بھینچ بھینچ کے گلے لگانے لگا۔ یہ دیکھ کے فریدہ کی نرگسیں آنکھوں سے موتیوں کے قطرے دُرہائے شاہوار کی طرح گلابی رخساروں پر سے لڑھک لڑھک کے گرنے لگے۔ اور ایسی روئی کہ واثق کو بھی رولا دیا۔ خلیفہ کو روتے دیکھ کے فریدہ نے ادب سے کہا۔ "امیرالمومنین! حضور روئیں نہیں۔ بلکہ قسم دلاتی ہوں کہ اسی وقت لونڈی کو قتل کر کے اپنے دل سے یہ شبہ مٹا دیں۔ اور اپنی یہ فکر دور کریں جس سے اس وقت عیش میں خلل پڑ گیا۔" مگر واثق نے اس کا خیال نہ کیا اور دیر تک دونوں مل مل کے روتے رہے۔ اس کے بعد آنکھوں سے آنسو پونچھے اور اپنی جگہ قرار سے بیٹھے۔ اور خدام نے خلیفہ کے اشارے پر روپوں اشرفیوں کے توڑے اور قیمتی کپڑوں کے تھانوں کی کشتیاں فریدہ کے سامنے لا کے رکھ دیں۔ پھر ایک خادم ایک صندوقچہ لایا۔ اور اُسے کھول کے ایک ایسا بے بہا موتیوں کا ہار نکالا کہ میں نے زندگی بھر نہیں دیکھا تھا۔ اُس ہار کو واثق نے خود اپنے ہاتھ سے فریدہ کے گلے میں ڈال دیا۔

اس کے بعد ایک خادم نے دس ہزار درہموں کے توڑے اور تھانوں کے پانچ خوان مجھے دیئے۔ جس کے بعد ہم پھر سب عیش و طرب میں مصروف ہو گئے بلکہ پہلے سے زیادہ لطف صحبت اُٹھایا۔ یہاں تک کہ رات ہو گئی۔ صحبت ختم ہوئی۔ اور وہ سب سامان دولت لے کے میں اپنے گھر واپس آیا۔

اس کے تھوڑے زمانہ کے بعد خلافت میں انقلاب ہو گیا اور ۲۳۲ھ میں واثق کا وہی بیٹا جعفر المتوکل علی اللہ کا لقب اختیار کر کے وارث سریر عباسی ہوا۔ اور میں اُسی طرح مغنّیہ میں ایک بار اُس کا بھی ندیم صحبت ہونے لگا اور اسی دور میں بھی ایک بار بعینہ وہی واقعہ پیش آیا۔ میرا باری کا دن نہ تھا۔ اور میں گھر میں بے فکر بیٹھا ہوا تھا۔ کہ یکایک شاہی چوبداروں نے آ کے پکڑ لیا۔ اور کہا، "چلو۔ فوراً حاضری کا حکم ہے۔ ایک منٹ کی بھی تاخیر نہ ہونی چاہیئے۔" وہاں گیا۔ تو بخدا لایزال وہ لوگ مجھے اُسی قصر میں اُسی راستہ سے خاص اُسی کمرے میں لے گئے۔ جہاں واثق اور فریدہ سے ملا تھا۔ اب سامنے جا کے کیا دیکھتا ہوں۔ کہ اُسی جگہ اور اُسی تخت پر متوکل بیٹھا ہے

اور اُس کے پہلو میں فریدہ ہے۔ جو روٹھی اور گال پھلائے ہوئے ہے۔ میں خلیفہ سے آنکھیں دوچار ہوتے ہی آداب بجالایا۔ اور اُس نے میری صورت دیکھتے ہی کہا "دیکھو اس ظالم نے میری کیا حالت کر رکھی ہے؟ کل سے خوشامد کر رہا ہوں کہ کچھ گاؤ۔ مگر ایک نہیں سنتی۔ تم کو خدا نے بہلانے پھسلانے کا اچھا سلیقہ دیا ہے تم ہی کچھ سمجھاؤ" یہ عبرت ناک منظر دیکھتے ہی ایسا معلوم ہوا کہ جیسے زمین میرے پاؤں کے نیچے سے نکل گئی۔ دل چاک چاک ہو گیا۔ مگر کیا بس تھا؟ دکھانے کے لئے میں نے فریدہ سے کہا "بیوی تمہیں ہو کیا گیا ہے؟ امیر المومنین تمہیں کہتے ہیں اور تم نہیں سنتیں؟ جانتی بھی ہو یہ کون ہیں؟ یہ میری اور تمہاری اور تمام آدمیوں کی جان کے مالک ہیں۔ میں تمہیں اپنی جان کی قسم دلاتا ہوں کہ ضرور گاؤ" میرے کہنے سے فریدہ نے سرود کو سنبھال کے دو شعر گائے جن کا مضمون بے ثباتی عالم تھا اور اُن سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ موت آج ہی کل میں صبح یا شام آنے کو ہے۔ لہٰذا اس عیش کا کوئی اعتبار نہیں۔

لیکن اس عبرت ناک شعر کے گانے ہی پر فریدہ نے بس نہیں کی۔ ان اشعار کا اُس کے دل پر کچھ ایسا حسرت ناک اثر پڑا کہ پوری طرح جی کھول کے گانے بھی نہ پائی تھی کہ جوش میں آ کے بے اختیار سرود کو زمین پر پٹک دیا۔ اور چلا چلا کے اور رو رو کے "ہائے میرے آقا! ہائے میرے آقا!" کہتی ہوئی اُٹھ کے بھاگی اُس کی یہ حالت دیکھ کے متوکل ہکا بکا رہ گیا۔ اور میری طرف دیکھ کے حیرت سے پوچھنے لگا "یہ کیا آفت ہے؟" میں نے عرض کیا "خدا کی قسم غلام نہیں جانتا کہ کیا بات ہے؟" بولا "تو بتاؤ میں کیا کروں؟" میں نے کہا "غلام کی رائے تو یہ ہے کہ امیر المومنین مجھے اپنے گھر واپس جانے کی اجازت دیں۔ اور اسے اور صاحب جمال کنیزوں کے ساتھ بلوائیں۔ امید ہے کہ اُسی وقت یہ حضور کا حکم بجا لائے گی اور حضور کی صحبت عیش میں خلل نہ پڑیگا" متوکل نے اس مشورے کے مطابق مجھے رخصت کر دیا اور پھر مجھے نہیں معلوم کہ کیا واقعات پیش آئے"۔

یہ بھی نہیں معلوم کہ اس کے بعد فریدہ کب تک زندہ رہی اور کب اُس نے اپنی بے مزہ اور حسرت ناک زندگی ختم کی۔ لیکن متوکل البتہ واثق کے دیکھتے

بہت زمانے تک زندہ رہا۔ اس لئے کہ واثق ۲۲۷ھ میں اورنگ نشین خلافت ہو کے پانچ ہی سال بعد آخر ۲۳۲ھ میں مر گیا۔ اور متوکل اُس کے بعد تخت خلافت پر جلوہ افروز ہوا تو کچھ کم پندرہ سال سلطنت کر کے ۲۴۷ھ میں اپنے ترک سرداران فوج کے ہاتھ سے مارا گیا۔

مئی ۱۹۱۵ء

## اے گل بہ تو خرسندم تو بوئے کسے داری

مصرع بلا کا ہے۔ اس میں "کسے" سے کون آفت روزگار مراد ہے۔ اس کو تو شاعر ہی جانتا ہوگا مگر "گل" سے مراد "گلاب" کے سوا اور کوئی پھول نہیں ہو سکتا۔ یہ وہ خوبصورت خوش رنگ۔ خوشبودار۔ اور نازک پھول ہے جس سے دنیا کی قوم کوئی نہیں جس نے لطف نہ اُٹھایا ہو اور کوئی صحبت عیش نہیں جس میں جان نہ پڑی ہو۔ حسینوں نے ہمیشہ اُسے بہترین زیور بنا کے اپنے حسن کو رونق دی اور شاعروں نے اُس کی نزاکت اُس کے رنگ اور اُس کی بُو سے معشوقوں کی اداؤں اور خوبیوں کی تشبیہ کا کام لیا۔ اور خدا جانے کس کس نے اس شاہد بزم قدرت کے حسن و جمال سے کیا کیا کام لئے ہیں۔

خلفائے بنی عباس میں المتوکل علی اللہ بڑا شوقین تھا۔ اور گلاب کا عاشق۔ اس کے عشق نے اُس میں ایک عجب جوش رقابت پیدا کر دیا تھا جس نے ساری قلمرو میں ممانعت کرا دی کہ امیر المومنین کے سوا خبردار اور کوئی شخص گلاب سے لطف اُٹھانے کی جرأت نہ کرے۔ جب گلاب کی فصل آتی متوکل کے قصر و ایوان گلاب کے پھولوں سے آراستہ کئے جاتے۔ ہر طرف گلدانوں میں گلاب کے پھول آراستہ رہتے۔ خود گلابی کپڑے پہنتا۔ گلابی فرش بچھاتا۔ قصر و ایوان کے پردے گلابی ہوتے اور ایوان خلافت میں اندر باہر جہاں دیکھئے گلاب ہی گلاب نظر آتا۔ مگر وہ خود اس شاہد چمن سے جتنا لطف چاہتا اُٹھا لیتا کسی کو شکایت کرنے کی کوئی وجہ نہ تھی لیکن یہ حکم رعایا کے لئے ناقابل برداشت تھا جس کی رو سے تمام لوگ اس معشوق بہار کی ہمکناری و ہم صحبتی سے محروم کر دیئے گئے تھے۔ جب یہ شکایت زیادہ بڑھی تو کسی نے ڈرتے ڈرتے اس کا سبب پوچھا۔ کہا "میں دنیا کے تمام

جون ۱۹۱۵ء

بادشاہوں کا بادشاہ ہوں۔ اور گلاب سارے پھولوں کا بادشاہ ہے اس لئے ہم ہی دونوں ایک دوسرے کی رفاقت کا حق رکھتے ہیں۔ اور کسی کا یہ رتبہ نہیں کہ اُن پھولوں کے بادشاہ کو اپنے آغوش میں لے" یہ کہتے ہی اُس نے گلاب کے پھول کی طرف مخاطب ہو کے یہ شعر پڑھا ؎

عَارٌ عَلَیَّ بِاَنْ یَشُمَّکَ سَاقِطٌ ٭ اَوْ اَنْ تَرَاکَ نَوَاظِرُ الْبُخَلَاءِ

(میرے لئے شرم کی بات ہے کہ کوئی ذلیل و حقیر شخص تجھے سونگھے یا کنجوسوں کی تجھ پر نظریں پڑیں)

ایک دفعہ ہارون رشید کے سامنے ایک تھالی میں بھرے ہوئے گلاب کے پھول رکھے ہوئے تھے۔ جن کی خوش رنگی و شادابی کو دیکھ کے وہ لطف اٹھا رہا تھا اسی اثناء میں ایک نہایت ہی حسینہ و جمیلہ گل رخسار لونڈی کسی نے لا کے نذر کی جو حسن و جمال کے ساتھ ذہانت و طباعی میں بھی جواب نہ رکھتی تھی۔ جیسے ہی وہ نازنین رشید کے سامنے آ کے کھڑی ہوئی اُس کے شرمائے ہوئے گلابی رخسارے اُن پھولوں پر چشمک زنی کرنے لگے۔ اور رشید کا یہ عالم تھا کہ نظر کبھی پھولوں پر ہوتی اور کبھی اُس ماہ جبین کے رخساروں پر۔ اتنے میں دربار کا ایک شاعر مفصل آ گیا۔ اُس کی صورت دیکھتے ہی بے اختیار رشید کی زبان سے نکلا۔ ان پھولوں کی تعریف میں کوئی پھڑکتا ہوا شعر سناؤ۔ مفصل نے برجستہ یہ شعر پڑھا۔

کَاَنَّہٗ خَدُّ مَوْمُوْقٍ یُقَبِّلُہٗ ٭ فَمُ الْحَبِیْبِ قَدْ اَبْدیٰ بِہٖ خَجَلَا

(گویا کسی معشوق کا رخسارہ ہے جس پر عاشق کے بوسہ لیتے ہی ندامت طاری ہونے لگی ہے)

لونڈی نے طبیعت موزوں پائی تھی۔ نہ رہا گیا۔ برجستہ بول اٹھی "یہ نہیں۔ یوں کہئے۔

کَاَنَّہٗ لَوْنُ خَدِّیْ حِیْنَ یَدْفَعُنِیْ ٭ کَفُّ الرَّشِیْدِ لِاَمْرٍ یُوْجِبُ الْغُسْلَا

(گویا یہ اس وقت میرے رخساروں کی رنگت ہے جب رشید کا ہاتھ اس شوق میں میری طرف بڑھے جس سے نہانا فرض ہو جاتا ہے)"

سنتے ہی رشید کی عجیب حالت ہوئی۔ فوراً تمام اہل صحبت ہٹا دیئے گئے۔ اور اُسی وقت وہ کنیز رشید کی منتخب محبوب حرموں میں داخل ہو گئی۔

یہ تو شاہی محفل عیش تھی۔ مگر معلوم ہوتا ہے کہ اُس زمانے کے لوگوں میں

عموماً گلاب کی فصل آتے ہی عاشقانہ جوش حد سے گزر جایا کرتا تھا۔ اور بعض مزاجی خطرناک کرشمے ظاہر کرانے لگتی تھی۔ چنانچہ ابراھیم خواص جو اسلام کی ابتدائی صدیوں کے ایک بڑے عابد و زاہد۔ پاک باطن صوفی صافی۔ اور روشن ضمیر ولی اللہ تھے۔ اُن کا معمول تھا کہ گلاب کا موسم آتے ہی تارک الدنیا اور معتکف ہو جاتے۔ اور بجز عبادت اور ذکر و فکر کے کوئی کام نہ کرتے۔ کسی نے اس کا سبب پوچھا تو فرمایا میرا خیال ہے کہ گلاب کی فصل میں لوگ خدا کی نافرمانی پر زیادہ آمادہ ہو جایا کرتے ہیں۔ اور اُن کی بے روک طبیعتیں انھیں طرح طرح کے معاصی میں مبتلا کرا دیتی ہیں۔ اس لئے اور لوگ جو چاہیں کریں میں کونے میں بیٹھ کے خدا سے دعا کرتا ہوں کہ "خداوندا انھیں نافرمانیوں سے بچا۔ اور جو مبتلائے عصیان ہو گئے ہیں۔ اُن کی مغفرت کر"

ایک اگلے صوفی منش ادیب نے گلاب کی زبان سے چند خیالات ظاہر کرائے ہیں جن کو ہم گھٹا بڑھا کے اپنے رنگ اور اپنے الفاظ میں ادا کرتے ہیں۔ گلاب کہتا ہے "میں جاڑوں اور گرمیوں کے درمیان آ کے تمہارا مہمان ہوا ہوں۔ میری عمر تھوڑی ہے۔ اور خوبیاں زیادہ۔ اس لئے اس وقت کو غنیمت جانو اور جتنا لطف اُٹھا سکو اُٹھا لو۔ ورنہ زمانہ گزر جائیگا۔ اور اس کے ساتھ ہی میں بھی رخصت ہو جاؤں گا۔ میرا دل عاشقوں کا ہے۔ اور صورت معشوقوں کی۔ سینہ عاشقوں کی طرح چاک ہے اور لباس معشوقوں کا سا رنگین۔ میں عاشق کے دل کو تسکین دیتا ہوں۔ اور معشوق کے دل میں جوش اور ہیجان پیدا کرتا ہوں۔ اس فصل بہار میں میں تم سے ملنے کو آیا ہوں تو تم بھی مجھ سے آ کے ملو۔ جس کسی کے دل میں ہو کہ مجھے روک کے رکھ دے گا احمق ہے۔ اُس کی یہ کوشش ہی اس بات کی علامت ہے کہ اُس کا یہ عیش منغص ہونے والا ہے۔ میرا گلبن کانٹوں کے پہرے میں ہے جو خود میرے دامن کو بھی چاک کر دیتے ہیں۔ اس لئے میرا شیدا میرے پاس آئے تو ہوشیاری سے آئے اور اپنا دامن بچاتا ہوا آئے۔ ان کانٹوں نے خود میرے دل کو زخمی کر دیا ہے۔ اور میں اپنے خون کے رنگ میں رنگا ہوا ہوں۔ اس محبوبی و رعنائی اور اس لطافت و نزاکت پر میرے ساتھ زمانے کا یہ سلوک ہے اور میری حالت

کو دیکھ کے ہر شخص سمجھ لے کہ دنیا میں جو کوئی کامیاب و بامراد ہے اُس نے سب سے زیادہ چوٹیں کھائیں۔ اور سرد مہری عالم کے دھکے برداشت کئے ہیں۔ اسی قدر نہیں بلکہ پر اس سے بھی زیادہ بے رحمی کی جاتی ہے۔ نزہت و شادابی کے دار الامان اور فرحت و عیش کے سایہ میں بیٹھا ہنس رہا تھا کہ گلچین کا بے رحم ہاتھ پہونچا اور گرد و پیش کے تمام پھولوں سے چن کے مجھے توڑ لایا۔ آتشی شیشوں یا قرع انبیق میں قید کیا۔ اور اس قدر جلایا کہ میرا جسم گل گیا۔ اعضا پاش پاش ہو گئے۔ اور آخر کار میں اپنی حسرت بھری آنکھوں کے آنسو بن کے رہ گیا۔ جس عرق کو تم میرا عرق بتاتے اور اپنی عیش کی مجلسوں میں چھڑکتے ہو دراصل میری سوزش درونی کا نچوڑ اور میری گزشتہ تکلیفوں کا پسینہ ہے۔

مشرق کے معاصرین سلف میں مشہور تھا کہ خوشبو اور لطافت میں کوئی پھول ایران کے گلاب۔ کوفے کے بنفشے۔ جرجان کے نرگس۔ اور بغداد کے نشو۔ (عراق کا ایک خوشبودار پھول) کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ ایران کے گلاب کی خوبیوں کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ ایک پرانے صاحب ذوق قاضی شہاب الدین کہتے ہیں: میں نے علی بن محمد انصاری سے سُنا کہ نہاوند کے گلاب میں ایک ہزار پنکھڑیاں ہوتی ہیں۔ مجھے یقین نہ آیا خود جا کے دیکھا اور ایک بڑے پھول کو توڑ کے اُس کی پنکھڑیاں گنیں تو اپنے دوست کے بیان کو صحیح پایا۔ وہیں انھوں نے ایک ایسا گلاب بھی دیکھا جس کا پھول آدھا زرد تھا۔ اور آدھا سفید۔ اور دونوں رنگوں کی تفریق اس خوبی کے ساتھ ہوئی تھی کہ معلوم ہوتا جیسے ایک سیدھا خط کھینچ دیا گیا ہے جس کے درمیان جو پنکھڑیاں آگئی ہیں وہ بھی آدھی زرد ہیں۔ اور آدھی سفید۔

## تاریخ روم کا ایک قصہ

سلطنت روم کے زوال کے بعد بھی شہر ایتھنز ایک مدت تک تہذیب اور علوم و فنون کا مرکز رہا ہے اُس کس مپرسی کے زمانے میں بھی شہنشاہ اور حاکموں میں علوم و فنون کا شوق تھا لہذا ہر ایک نے اس شہر میں کوئی نئی عمارت

بنوادی یا مدرس مقرر کر دیے۔ شہنشاہ تھیوڈرک بھی انھیں میں تھا۔ اس نے اُن درسگاہوں کی جو زمانہ کی ناشائستگی کے ہاتھوں مٹی جاتی تھیں مرمت کرائی۔ اہلِ کمال کے وظائف پھر جاری کر دیے جنھیں حریص اور طامع گورنر خود ہضم کر گئے تھے۔

اسی شہر میں اور اسی زمانہ میں جس کا حال ہم اوپر بیان کر آئے ہیں دو طالب علم جن کے نام الکندر سپٹی مس تھے ساتھ رہتے تھے۔ ان میں سے ایک لیسیم[ع] کا سب سے بڑا دقیقہ رس مبحث تھا۔ دوسرا افلاطون[ع] کی جھاڑیوں کا نہایت فصیح تقریر کرنے والا۔ دونوں میں ایک ایک کمال تھا۔ دونوں ایک دوسرے کے معرف تھے۔ لہذا آپس میں ملاقات بھی ہو گئی تھی اور چونکہ دونوں کی طبیعتیں بھی ایک ہی طرح کی واقع ہوئی تھی بہت جلد گہری دوستی قائم ہو گئی۔ دونوں کے ذرائع آمدنی بھی قریب قریب برابر تھے۔ علمی ذوق دونوں میں موجود تھا اور دونو دنیا کے دو نہایت مشہور شہروں کے رہنے والے تھے۔ الکندر کا مکان خاص اثینیہ میں تھا اور سپٹی مس رومتہ الکبریٰ کا رہنے والا تھا۔

کچھ دنوں دونوں اثینیہ میں اس یکجہتی اور لطف سے بسر کرتے رہے۔ آخر کار الکندر کو اپنے نوجوانی کی ابتدائی چند روز فلسفہ کی خاموشی میں گزارنے کے بعد اس کا خیال پیدا ہوا کہ دنیاوی امور کا عملی تجربہ بھی حاصل کر لے لہذا اُس نے ایک نہایت حسین عورت ہالی پیشیا سے شادی کی درخواست کی۔ ہالی پیشیا نے اس سے انکار نہیں کیا۔ شادی کا دن مقرر ہو گیا ابتدائی مراسم سب طے ہو گئے۔ اور اب کوئی بات سوا اس کے نہیں باقی رہ گئی تھی کہ اپنی دُلھن کو رخصت کرا لائے۔

اپنی خوشی میں بیخود ہو کے یا اس خیال سے کہ مجھے اپنے دوست سپٹی مس کے بغیر کسی خوشی میں لطف نہ آئے گا۔ اُس نے اپنے ساتھی کا اپنی معشوقہ سے تعارف کرا دیا۔ مگر افسوس اس ملاقات نے دونوں کی خوشی اور چین کا خاتمہ کر دیا

---

ع لیسیم وہ مقام تھا جہاں مباحثہ کر سکھایا جاتا تھا۔ ع افلاطون جن جھاڑیوں میں درس دیا کرتا تھا وہاں ایک درسگاہ قائم تھی اور اسی کے نام سے موسوم تھی۔

کیونکہ سپٹی مس کے دل میں اُسے دیکھتے ہی خود بخود ایک خاص قسم کا خیال پیدا ہوگیا۔ اُس نے ہزار کوشش کی کہ میرے دل سے یہ بیہودہ اور ناحق خیال دُور ہوجائے۔ مگر دل میں ایک ناقابل خیال درد تھا۔ مغموم اور پریشان وہ اپنے کمرے میں واپس آیا مگر جو تحریک اس کے دل میں پیدا ہوچکی تھی اس قدر بڑھ گئی کہ آخر کار اُسے بخار آنے لگا اور طبیبوں نے فیصلہ کر دیا کہ اس کی حالت ناقابلِ علاج ہوتی جاتی ہے۔

اس بیماری کے زمانے میں اپنی دوستی کا حق ادا کرنے کے خیال سے الکندر ہی اس کی تیمارداری نہیں کرتا رہا بلکہ اکثر اس نے اپنی معشوقہ کو بھی بلا لیا تاکہ وہ بھی مدد کرے۔ اب طبیبوں نے اپنی دانائی سے فوراً پہچان لیا۔ کہ اُسے کیا مرض ہے اور جب الکندر کو یہ معلوم ہوا تو اُس نے اپنے خاموش اور ہم جان دوست سے بھی دریافت کر کے اس کا اعتراف کرا لیا۔

اس وقت الکندر کے دل میں جو عشق کے جذبات اور دوستی کے خیالات موجزن تھے وہ بیان نہیں کئے جا سکتے۔ اثینیہ والے اس وقت اخلاق کے اُس درجہ پر پہونچ گئے تھے جب اُن کی خوبیاں بھی حد سے متجاوز ہوچکی تھیں مختصر یہ کہ اُس نے اپنی خوشی اور مسرت کو نظر انداز کر کے اپنی خوبصورت معشوقہ کو جو چند روز میں اُس کی دُلھن بننے والی تھی اپنے نوجوان رومی دوست کے حوالے کر دیا۔ اُسی کی تجویز کے مطابق خفیہ طور پر اُن کی شادی ہوگئی۔ اپنی آرزو کے اس خلاف اُمید طریقہ پر پورے ہوجانے سے سپٹی مس کے مرض میں فوری افاقہ ہوا۔ چند ہی روز میں وُہ بالکل اچھا تھا اور اپنی نازک بدن معشوقہ کو ساتھ لے کے اپنے وطن رومتہ الکبریٰ میں چلا آیا۔ یہاں اپنی لیاقت کی بدولت چند ہی برسوں میں سلطنت کی ایک اعلیٰ ترین خدمت پر پہونچ کے شہر کا پریٹر یعنی ناظم فوجداری مقرر ہوگیا۔

اب الکندر کو صرف اپنے دوست اور اپنی معشوقہ کی جدائی ہی کی تکلیف نہیں برداشت کرنا پڑی بلکہ اس کے خلاف ایک مقدمہ بھی ہائی پیشیا۔

اعزہ نے عدالت میں دائر کر دیا۔ جن کا یہ بیان تھا کہ اُس نے نائی پیٹھیا کو کچھ روپیہ کے معاوضہ میں فروخت کر ڈالا ہے۔ ایک باا ثر اور زبردست جماعت کے مقابلہ میں نہ تو اُس کی بیگناہی کام آئی اور نہ اُس کی فصاحت بیانی کچھ اثر کر سکی۔ بہرحال اُسے سزا ہوئی اور اس پر ایک بہت بڑی رقم جرمانہ کی عائد ہو گئی۔ اس کی مقدار اتنی زیادہ تھی کہ وہ مقررہ میعاد کے اندر فراہم نہ کر سکا۔ اس کی تمام جائداد اور مال و اسباب ضبط ہو گیا اور خود اُس کی ذات بھی آزاد نہ رہنے پائی۔ کیونکہ عام بازار میں ایک غلام کی حیثیت سے فروخت کر ڈالا گیا۔

تھیریس کے ایک سوداگر نے اُسے خریدا تھا لہذا الکندر اور اُس کے ساتھ کے چند اور مصیبت کے ساتھی غلام اُس کے ویران اور ریگستانی ملک میں پہونچے۔ وہاں اُس کا مقرر کام یہ تھا کہ روزانہ اپنے ظالم مالک کے مویشیوں کے گلوں کو جنگل سے چرا لایا کرے اور اپنے شکار کی محنت سے وہ جو کچھ لا سکتا اُسی کا ایک حصہ اُسے کھانے کو دیا جاتا تھا۔ اس مایوسی کی حالت میں ہر صبح کو جب وہ اُٹھتا تھا اُسے اپنی فاقہ کشی اور مشقت کا خیال سب سے پہلے آتا تھا اور ہر موسم کی تبدیلی پر اُس کی مصیبتوں میں کچھ نہ کچھ اضافہ ہی ہو جاتا تھا لہذا اُس کے لئے موت اور بھاگ جانے کے علاوہ اور کوئی چارۂ کار نہ تھا۔ بھاگنے کی صورت میں بظاہر اس کا نتیجہ بھی موت ہی معلوم ہوتا تھا آخر کار کئی برس کی غلامی کے بعد اُسے ایک دن چپکے سے نکل جانے کا موقع مل گیا۔ راتوں کو سفر کر کے اور دن کو سراؤں میں ٹھہر ٹھہر کے وہ بہزار خرابی رومہ میں پہونچ گیا۔ جس دن الکندر رومہ میں داخل ہوا ہے اُس کا دوست سپیئی اس عدالت میں بیٹھا فیصلہ کر رہا تھا۔ یہیں ہمارا آوارہ گرد مسافر بھی اس اُمید میں کہ فوراً پہچان لیا جاونگا پہونچا۔ یہاں عام لوگوں میں وہ تمام دن کھڑا حاکم کی طرف دیکھتا رہا کہ وہ نظر اُٹھا کے اُس کی طرف دیکھے۔ مگر مصیبتیں برداشت کرتے کرتے اُس کی صورت اتنی بدل گئی تھی کہ وہ اُس کو نہ پہچان سکا۔ شام کو جب اُس نے جرأت کی کہ خود ہی

آپ کو اُس کے پاس پہونچائے تو عدالت کے چپڑاسیوں نے اسے دھکیل کے پیچھے ہٹا دیا۔ غریب آدمی ایک جگہ مایوس ہوتا ہے تو پھر دوسری جگہ جا کے درخواست کرتا ہے رات سر پر آ رہی تھی اور اب اُسے اس کی ضرورت محسوس ہوئی کہ اپنے سونے کے لئے کوئی جگہ تجویز کرے مگر اُس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا کرے اور کہاں جائے۔ اس قدر میلا کچیلا اور چیتھڑے لگائے تھا کہ کسی نے اپنے یہاں جگہ نہ دی۔ گلی یا کوچہ میں پڑ رہنا بھی خوف سے خالی نہ تھا۔ مجبوراً اُسے شہر سے باہر ایک مقبرہ میں جا کے لیٹنا پڑا ایسے مقامات عموماً گناہ افلاس اور ناامیدی کے گھر ہوا کرتے ہیں۔

اس خوف کے محل میں ایک ٹوٹا ہوا مٹی کا کونڈا سرہانے رکھ کے وہ سو رہا اور غنودگی میں تھوڑی دیر کے لئے اپنے مصائب بھول گیا۔ اور نیکی کی بدولت اس سخت ناہموار بستر پر بھی ایسی اچھی نیند آئی کہ کسی گنہگار شخص کو مخمل کے بچھونے پر نہ آتی۔

آدھی رات کو دو چور کچھ چرا کے اتفاقاً اسی مقام پر پہونچے اور مال کی تقسیم میں آپس میں جھگڑا ہونے لگا جو اس قدر بڑھا کہ ایک نے دوسرے کو سینہ میں زخمی کیا اور عین دروازے کے پاس اُسے خون میں لتھڑا ہوا ڈال کے بھاگ گیا۔ صبح کو اُس کی لاش وہاں پڑی ملی اور مزید تحقیقات کے خیال سے مقبرہ کے اندر تلاشی لی گئی۔ وہاں الکندر سوتا ملا اور فوراً اُس پر چوری اور قتل کا جرم عائد کیا گیا۔ واقعات اُس کے خلاف تھے اور اُس کی تباہ شدہ حالت نے اور بھی شبہ کو یقین کے درجے تک پہنچا دیا قسمت کے ہاتھوں وہ اب تک اتنا پریشان رہ چکا تھا کہ اب اُسے اپنی جان کی پروا نہیں رہی تھی اس دنیا سے جس میں سوا ناشکری جھوٹ اور ظلم کے کچھ نہ تھا اُسے نفرت ہوگئی تھی لہذا اپنے حق میں وہ کوئی صفائی بھی نہیں پیش کرنا چاہتا تھا وہ اپنے اس خیال میں مستقل تھا اور لوگ اُسے رسّی میں باندھے سینٹی مس کی عدالت میں لئے جاتے تھے۔ تمام ثبوت موجود تھے۔ اس نے اپنے حق میں کچھ نہیں کہا لہذا حاکم اپنا فیصلہ سنانے والا ہی تھا کہ خدا کی طرف سے اُس کے دل میں

ایک خیال پیدا ہوا اور باوجود اس تباہ حالی کے اس مجرم میں اس نے اپنے
پرانے محب الکندر کے خط و خال پہچان لئے۔ اس موقع پر اُسے جیسی خوشی اور
اُس کے ساتھ ہی جس قسم کی تکلیف ہوئی ہے وہ بیان نہیں کی جا سکتی۔ خوشی
اس بات کی تھی کہ ایک ایسا شخص جو اُسے دنیا بھر میں سب سے زیادہ عزیز
ہے مل گیا اور تکلیف اس بات کی کہ ایسی حالت میں ملا۔ ان متضاد جذبات سے
پریشان ہو کر وہ دفعتہً کرسی سے اُٹھا اور اپنے دوست اور محسن کے گلے لپٹ
کے بے اختیار رونے لگا۔

عدالت کے اور سب لوگ اُس وقت ایک دوسری جانب متوجہ
تھے وہ اصلی چور جو در حقیقت مجرم تھا چوری کا مال بیچتا ہوا پکڑا گیا جس نے
خوف زدہ ہو کے سب باتوں کا اقبال کر لیا وُہ بھی اسی عدالت میں لایا گیا اور
اُس نے خود اپنی زبان سے غربت زدہ الکندر کو اس جرم سے بری ثابت
کر دیا۔ کیا اب بھی نتیجہ بیان کرنے کی ضرورت ہے؟ الکندر چھوڑ دیا گیا اور اپنے
دوست سیپٹی مس کے ساتھ عزت و آبرو اور آرام سے بسر کرنے لگا۔
مرتے وقت اُس نے وصیت کر دی کہ میری قبر پر یہ کندہ کرا دیا جائے کہ
"کوئی مصیبت ایسی سخت نہیں ہے جس سے اللہ تعالےٰ نجات نہ
دیتا ہو"

(وَلَا تَقْنَطُوا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰہِ) جولائی ۱۹۱۵ء

## ہندوستان کا اسپارٹا ملیح آباد

نیشنل کانگرس والے مدت سے والنٹیئر (قومی سپاہی) بننے کے آرزومند
ہیں مسلمان اکثر اپنے مقامی پالیٹکس کی کسی مصلحت سے اس تحریک میں
شریک نہیں ہوئے مگر فطری تقاضے سے وہ بھی والنٹیئر ہونے کی ہندوؤں
سے کچھ زیادہ ہی تمنا رکھتے ہیں مسلمانوں میں یوں تو اپنی قدیم معاشرت کے
لحاظ سے ہر ادنیٰ و اعلےٰ اور ہر طبقہ کے آدمی کو سپاہی ہونا چاہیئے مگر ہندوستان
میں پٹھانوں کی قوم بالطبع سپاہی ہے۔ جو سپہگری کے سوا، وکسی پیشہ کو

ت سے بعید خیال کرتے ہیں۔ اور پٹھانوں میں بھی ہمارے پڑوس کے تعصبات
ور خالص پور والے سپہگری کا کچھ ایسا غالب مذاق رکھتے ہیں کہ تعلیم
ی اثر نے دنیا کا مذاق بدل دیا ہر قوم اور ہر جماعت اپنے پرانے شغل
و بھول گئی مگر وہ آجتک باوجود قانون اسلحہ کے جاری ہونے۔ اور
ب وجدال کے موقوف ہوجانے کے اپنی پرانی وضع کو نہیں بھولے۔ اور
، ویسے ہی سپاہی اور اسی طرح برسرپیکار ہیں جسطرح آج سے سو برس
تھے۔
اپنی کتاب عصر قدیم کے صفحہ ۷۴ پر ہم نے ان کی نسبت مندرجہ ذیل خیالات
ئے تھے :۔ ہمارے یہاں بعض پٹھانوں کی بستیوں کا مذاق اسپارٹا
سے بہت ملتا جلتا ہے۔ خموشی اور امن وامان کی زندگی کو وہ بالطبع
رتے بلکہ نفرت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ کوئی اور لڑنے بھڑنے کو نہیں
پ ہی لڑ بھڑ لیا کرتے ہیں۔ ان کے لئے بجائے ان بے نتیجہ ہنگامہ آرائیوں
ہ مناسب ہوگا کہ گورنمنٹ سے درخواست کریں کہ ان کو اپنے
لقوں میں اسپارٹا والوں کا طریقہ اور لی قورغوس کے فوجی قوانین
رنے کی اجازت مرحمت کی جائے۔ ممکن ہے کہ گورنمنٹ جدت طرازی
ل سے یا ایک پرانے طریقے کی تجدید کے لحاظ سے انھیں اس
ت دیدے
۱۶۷۵ قبل محمد صلعم سے تقریباً تین چار سو برس بعد تک اہل یونان کی
زمانہ تھا۔ اور ان کی ترقی کے پورے دور میں دو شہر بہت ہی ممتاز و
ے۔ ایک ایتھنز جسے اہل عرب اثینہ کہتے ہیں اور دوسرا اسپارٹا۔
علم وفضل اور تہذیب وتمدن کا گہوارہ تھا۔ اور اسپارٹا سپہگری
ں کا۔ ایتھنز میں حکیم اور فلسفی پیدا ہوتے تھے اور اسپارٹا میں سپاہی
وان۔ دونوں شہروں کے قوانین بھی جدا تھے۔
اسپارٹا والے اپنے آپ کو ہرکیولس (ہرقل اعظم) کی نسل سے بتاتے تھے
نیوں کا ایک ویسا ہی تہمتن تھا جیسا کہ ایرانیوں میں رستم نریمان اور

ہندوؤں میں مہا بیرجی تھے۔ شجاعت اور سپہگری ان لوگوں کی گھٹی میں پڑی تھی کہتے ہیں کہ ہرقل کی نسل چند روز بعد عیش پرستی میں پڑ گئی تھی کہ سنہ ۱۴۳۱ قبل محمد صلعم میں اُن کا مقنن اعظم فرماں روائی قورغوس پیدا ہوا۔ اور اُن میں شجاعت کی تجدید کرنے اور راحت طلبی کے فنا کرنے کے لئے نئے نئے قوانین جاری کیئے جو چاہے کیسے ہی سخت ہوں ایک سپہگر قوم کے لئے نہایت ہی موزوں تھے۔

سب سے پہلے تمام لوگوں کے پاس جس قدر سونا چاندی تھا لے لیا گیا اور اُن کے عوض لوہے کے سیاہ ٹکڑے دیدیے گئے جو بیکار تھے۔ ساری زمین اُن لوگوں میں بانٹ دی گئی۔ جسے اُن کے غلام جو "ہیلوٹ" کہلاتے تھے جوتتے بوتے۔ اور پیداوار پر اہل شہر بسر کرتے۔ لڑکے آغوش مادر سے نکلتے ہی گھر چھوڑنے پر مجبور ہو جاتے۔ اس لئے کہ مردوں کو گھروں میں رہنے کی اجازت نہ تھی۔ شب و روز سپہگری کی کھیلوں۔ ورزشوں۔ زور آزمائیوں اور باہمی جنگ وجدال میں مصروف رہتے ان ورزشی لڑائیوں کے وقت قوم کی خوبصورت عورتیں اور لڑکیاں سامنے لا کے کھڑی کردی جائیں اور اُن کی مجال نہ ہوتی کہ کسی عورت کی طرف نگاہ اُٹھا کے دیکھ سکیں۔

کسی چیز کو اُن میں اتنی اہمیت نہ تھی جتنی کہ اسلحہ کے استعمال اور نبرد آزمائی کو۔ اور اس کے ساتھ ضبط وتحمل کی قوت بڑھانے کو۔ جنگی تعلیم اس قدر سخت تھی کہ آسپارٹا والوں کے لئے امن وامان کا زمانہ کسی مہم پر جانے اور فوج کشی کے زمانے سے بدرجہا زیادہ سخت تھا۔ گھروں پر رہنے کے مقابل لڑائی پر جانا بڑے آرام وآسائش کا زمانہ تھا۔ درد چوٹ یا تکلیف پر اُف کرنا یا بزدلی کی کوئی علامت ظاہر کرنا اس قدر شرمناک تصور کیا جاتا کہ ایک لڑکا جو کسی بھیڑیے کو اپنے کُرتے کے اندر چھپائے ہوتا۔ بھیڑیا چاہے بوٹیاں نوچ کے اور جسم کو پھاڑ کے اُسے مار ہی کیوں نہ ڈالے مگر یہ ممکن نہ تھا کہ وُہ زبان سے اُف کرے یا اذیت سے بچنے کے لئے اُسے چھوڑ دے۔

نوعمر لڑکے ارتھمیس دیوتا کی مورت کے سامنے کھڑے کرکے پیٹے جاتے
بعض پٹتے پٹتے مر بھی جاتے مگر نہ وہ بیصبری و بزدلی ظاہر کرتے۔ اور نہ اُن
کی مائیں آہ و واویلا کر سکتیں جنھیں سامنے کھڑا کرکے یہ تماشا دکھایا جاتا تھا
اسی چیز نے اسپارٹا کے سپاہیوں سے زیادہ بہادر اُن کی ماؤں کو بنا دیا
تھا۔ چوری میں اگر اسپارٹا والا پکڑ لیا جاتا تو اُسے سزا دیجاتی۔ اور اگر نہ پکڑا
جاتا تو اُسے انعام دیا جاتا۔

لباس اور غذا میں اس قدر سادگی اور بے پروائی کی عادت ڈال دی جاتی
کہ اسپارٹا والوں کو کسی قسم کی نمائش کا بالکل خیال نہ تھا۔ بڑے بڑے ہال
تھے جن میں وہ لوگ جمع ہو کے ایک ساتھ کھانا کھاتے۔ ٹیبل ٹاک (یعنی
میز پر کی چہ می گوئیوں) کو نہایت بُرا سمجھتے۔ بلکہ سوا مختصر الفاظ میں اپنا
مافی الضمیر ظاہر کر دینے کے وہ زیادہ باتیں کرنا ہی نہ پسند کرتے اور جب دیکھیے
خاموش ہی نظر آتے۔ ایک قسم کا کڑوا کسیلا کالا شوربا اُن کے سامنے میز پر
لایا جاتا۔ جسے دیکھتے ہی اور شہر کے لوگوں کو اُبکائیاں آنے لگتیں مگر وہ شوق
اور رغبت سے خاموش بیٹھ کے کھاتے۔ اور پیٹ بھر لیتے۔ مگر اُس
غذا کی حالت یہ تھی کہ اسپارٹا والے بھی اُسی وقت کھا سکتے جب مارے
بھوک کے بیقرار ہوتے۔

جب کوئی بچہ پہلے پہل ان لوگوں میں شریک ہوتا۔ میز پر بیٹھ کے اُن
کی غذا کو دیکھتا۔ اور چہرے سے کسی قسم کی ناگواری ظاہر کر کے کچھ کہنے کا
قصد کرتا تو ساتھ والے کڑوے تیوروں سے کہتے۔ "یہاں
فضول باتیں کرنا منع ہے"، پھر دروازے کی طرف اشارہ
کر کے کہتے "دو کوئی فضول بات تمھارے مُنہ سے نکلی۔ اور تم اسکے
باہر کر دیے گئے"

یہ حالت تھی اسپارٹا والوں کی جو شجاعت و سپہگری میں اپنا نظیر نہ رکھتے
تھے۔ اُن کی معاشرت بہت ہی سادی اور جفاکشی و مشکل پسندی کی تھی
اخلاق میں درشتی اور برہمی تھی۔ ذرا میں مشتعل ہو جاتے۔ اور فوراً جان دیتے

کو تیار ہو جاتے۔ یہی معاشرت اور اسی قسم کا اخلاق ہماری مذکورۂ بالا بستیوں کے جوانمرد پٹھانوں کا ہے۔ اگرچہ کسی خاص فوجی معاشرتی قانون کے نہ جاری ہونے سے اُن کی پوری پوری وہی حالت نہیں ہے جو اسپارٹا والوں کی تھی تاہم اُن میں طبعی رجحان اس مذاق کا موجود ہے۔ اس زمانے میں ان لوگوں کے مذاق کی قدر نہ ہونے کا نتیجہ یہ ہے کہ یہ لوگ بالکل تباہ ہوتے جاتے ہیں کیونکہ سپاہگری اور بانکپن کے سوا اور کسی پیشہ کے اختیار کرنے کو یہ اپنی شرافت کے خلاف خیال کرتے ہیں۔ اور جس قسم کی شجاعت و سپاہگری ان میں ہے۔ اس کی موجودہ گورنمنٹ میں قدر نہیں۔ بلکہ اُس کا باقی رکھنا آج کل کے مہذب نظم و نسق کے خلاف تصور کیا جاتا ہے۔

لیکن ہماری گورنمنٹ جہاں تہذیب و تمدن کی حامی ہے وہاں آثار سلف کی سب سے بڑی مربی اور قدیم روایات کو عملی صورت میں لانے کی شائق بھی وہی ہے۔ کیا یہ ممکن نہیں ہے کہ ایک محدود رقبہ سلف کے کسی خاص مذاق کا مرکز قرار دے دیا جائے؟ اور اُس میں اُسی قسم قسم کے قوانین جاری کر کے پرانے سپہ گرانہ ضبط و تحمل اور اگلی جانبازی و سرفروشی کے جذبات کو از سر نو زندہ کر دیا جائے۔

شاید اسپارٹا کے پورے پورے قانون ان لوگوں کے لئے فی الحال ناقابل برداشت ہوں۔ کیونکہ یہ زیادہ متمدن ہو گئے ہیں۔ اور ماں بچوں سے الگ رہنے۔ شب و روز ورزش و زور آزمائی میں مصروف رہنے۔ اور اپنے مملوکہ سونے چاندی سے دست بردار ہو جانے کو نہ گوارا کر سکیں یا اُسے ظلم و جور خیال کریں۔ لیکن ہمیں یقین ہے کہ اُن کے فطری رجحان سپاہگری کی اسپارٹا کے اصول پر تھوڑی بھی پرورش ہو جائے گی۔ تو بڑی خوشی سے وہاں کے تمام سپہ گرانہ قوانین کو قبول کر لیں گے۔

قطع نظر اس کے کچھ اس کی بھی ضرورت نہیں کہ ان قوم غوص کے

رے قانون یہاں جاری کر دیئے جائیں بلکہ گورنمنٹ انھیں بہ نگرانہ
لحوظ رکھ کے ان لوگوں کے لئے ان کے مذاق و مقاصد کے مناسب
ٹا کے اُن پرانے قوانین میں ترمیم کر سکتی ہے جن کے جاری
ے چند ہی روز بعد ہندوستان میں ایک ایسا خطہ پیدا
ے گا۔ جو اچھے سے اچھے سپاہی اور بہادر سے بہادر جنگجو
ا کر یگا۔ اور ہماری بانکی فطرت والے خاں صاحبوں کو اپنے
ے مطابق ترقیاں کرنے اور ساری دنیا پر اپنی شرافت کا نقش بٹھا
موقع مل جائیگا۔

اری گورنمنٹ نے اپنی بحری قوت پر مطمئن ہو کے دوسری سلطنتوں
اس کی ضرورت نہیں سمجھی کہ ابنائے وطن کو جبراً جنگی تعلیم دی جائے۔ او
فوج تیار کر لی جائے جتنی کہ اُس کی قلمرو کی مردم شماری تیار کر سکتی
ن اس کا خیال نہیں کیا گیا کہ برٹش گورنمنٹ کو اب صرف جزائر برطانیہ
فاظت نہیں کرنا ہے۔ بلکہ ہندوستان۔ مصر۔ جنوبی افریقہ اور اُن صد ہا
، اور نو آبادیوں کی بھی حفاظت کرنا ہے۔ جو دنیا کے بڑے بڑے
سے وابستہ ہیں اور جہاں تک جہازوں کا اثر نہیں پہونچ سکتا۔ موجودہ
کے بعد غالباً گورنمنٹ کو فوجی سپاہیوں کے بہم پہونچانے کے مروجہ
ں کچھ نہ کچھ اصلاح ضرور کرنی پڑیگی۔

اُس وقت اگر ہمارے ملیح آباد اور خالص پور وغیرہ کے پرانے
یار ٹا بنا دینے کا اہتمام کیا جائے تو نامناسب نہ ہوگا۔ قطع
ں کے کہ یونان کی ایک سنت قدیم زندہ کی جائے۔ اس
سے گورنمنٹ کو لڑائیوں کی ضرورت کے لئے ہمیشہ
نہایت ہی جانباز لشکر تیار ملے گا جو شاید دوسری فوجوں
یادہ کار آمد ثابت ہو۔ اور جس کے سپاہی اکثر مہموں میں
ا ایسے کارنامے دکھائیں گے جو تاریخ عالم میں ہمیشہ کے لئے یادگار
، ہوں گے۔

اگست ۱۹۱۵ء

# عربوں کی جمہوریت پسندی

اس سے تو انکار نہیں کیا جا سکتا کہ آخر عہد میں سلاطین اسلام حد سے زیادہ خود رائے خود غرض اور خود پرست تھے۔ اور خوشامد کرنے والے اہل دربار نے انھیں پورا پورا فرعون بے سامان بنا دیا تھا۔ لیکن دراصل یہ شخص پرستی نہ اہل عرب کے تمدن میں تھی اور نہ اُن کی فطرت و سرشت میں۔ پھر اس کے بعد جب قرآن مجید نے "مشورت" کو اسلامی تمدن کا عنصر اعظم بتایا تو دین متین نے بھی جمہوریت کی ضرورت پر اپنی مہر کر دی۔

اس کا ثبوت اس سے بڑھ کے کیا ہوگا کہ صحابہ کے عہد تک مسلمانوں کا یہ مذاق تھا کہ خداوند جل و علا کے سوا کسی دنیوی فرمان روا کو شہنشاہ کہنا شرک سمجھا جاتا اس لئے کہ عربوں اور مسلمانوں کا شہنشاہ خدائے واحد ذوالجلال کے سوا کوئی نہیں۔ شہنشاہ تو بڑا لفظ ہے کسی اپنے حاکم کو بادشاہ کہنا بھی وہ پسند نہ کرتے تھے۔ آنحضرت صلعم نے ملوک ارض کے نام خطوط بھیجے تو کسی کو بھی "ملک" کے لفظ سے نہیں یاد فرمایا سب سے زیادہ عظمت قیصر روم کی کی تو اُسے "عظیم الروم" یعنی "روم کا بڑا آدمی" تحریر فرمایا۔

رسول خدا علیہ التحیۃ والثنا کی جانشینی جب ایک عظیم الشان سلطنت بن گئی تو جانشینان مسند خلافت کے لئے جو سب سے بڑا تعظیمی لقب اختیار کیا گیا وہ "امیر المومنین" تھا اور عربوں کے اس فطری جذبے کا یہ اثر تھا کہ جب خلفا کے رعب و داب اور شان و شوکت سے فرعونیت کی بو آنے لگی تو خوارج نے (جو خالص عرب تھے) صاف کہدیا کہ اب خلفا کی اطاعت جائز نہیں اور اپنے علم پر یہ آیت لکھی کہ "ان الحکم الا للہِ" جس کا مفہوم یہ ہے کہ "حاکم خدا کے سوا کوئی نہیں ہے"

مگر عربوں کی اس فطرت کا سب سے زیادہ نمایاں ظہور ارض اندلس میں ہوا۔ اُس سرزمین پر جب اسلام کی حکومت ہو گئی۔ اور ہزارہا عربی خاندان جا جا کے بلاد اسپین میں بس گئے تو فاتح اندلس موسی بن نصیر حسب فرمان خلافت

بنی اُمیہ دمشق اپنے بیٹے عبدالعزیز کو وہاں کا والی اور حاکم مقرر کر کے جواب دہی کے
لئے ملک شام میں حاضر ہوا۔ اور مزم قرار پا کے سزایاب ہوا۔ عبدالعزیز ایک
مدت دراز تک اسپین میں حکومت کرتا رہا۔ اور وہاں کی آب و ہوا کے اثر اور
حکمرانی کے نشہ سے رنگا تھک ) فرماں روا راڈرق کی بیوہ سے اُس نے شادی
کرلی۔ جو اُس کی محبوبۂ دل نواز بن گئی۔ یہ قوطیہ ملکہ اپنے پہلے تاجدار شوہر کا
زمانہ دیکھے ہوئے تھی۔ اور اس وقت کی شان و شوکت اور شاہی آداب کے
مقابل عربی حکمرانی کی سادگی میں اُسے مزہ نہ آتا تھا۔ اس خیال سے وہ اکثر
کبیدہ خاطر رہتی اور دل میں کہتی کہ یا تو لوگ میرے اور میرے شوہر کے سامنے
سجدے کرتے تھے۔ سامنے بغیر اجازت کے کوئی زبان نہ ہلا سکتا تھا اور یا
اب یہ حالت ہے کہ جو آتا ہے بے تکان اندر گھسا چلا آتا ہے۔ بغیر اس کے کہ
سر کو ذرا خم کرے "السلام علیک" کہہ کے عبدالعزیز سے مصافحہ کرتا ہے
اور نہایت آزادی و بیباکی سے بے تکلف باتیں کرنے لگتا ہے۔ عبدالعزیز
کو بار بار سمجھاتی کہ "یہ حکومت کیسی کہ نہ کوئی آپ کے سامنے جھکتا ہے۔ نہ
آپ کا کچھ ادب کرتا ہے؟" وہ جواب دیتا "ہماری معاشرت میں حاکم و محکوم
سب برابر ہیں اور عزت کے لحاظ سے کسی کو کسی پر فوقیت نہیں۔" اس
جواب سے اُس کے دل کو اطمینان ہونا درکنار اور صدمہ ہوتا کہ "افسوس
میں نے تو اس فاتح اندلس کو زیادہ معزز سمجھ کے اس سے شادی کی
تھی۔ مگر اب جو دیکھتی ہوں تو جو عزت پہلے تھی اُس کی عشر عشیر بھی
نہیں باقی رہی۔"

جب عبدالعزیز نے یوں نہ مانا تو اُس چالاک قوطیہ ملکہ نے خود ہی اپنی
سابقہ عزت قائم کرنے کی کوشش شروع کی۔ ایک عالیشان قصر تعمیر کرایا
اُس میں دربار کا ایک بارونق دیوان خانہ بنوایا۔ اُس کے اندر ایک اعلےٰ درجہ
کا شاہانہ تخت عبدالعزیز کے جلوس کے لئے بچھوایا۔ اور تخت کے سامنے
کا دروازہ جس میں سے ہو کے اندر داخل ہوتے اتنا تنگ اور پست رکھا کہ جو کوئی
اندر آنا چاہے بغیر جھکے اور زمین کے قریب تک سر پہونچائے نہ آسکے۔

اُس تخت پر بیٹھ کے جب عبدالعزیز دربار کرنے لگا۔ اور لوگ جھک جھک کے سامنے آنے لگے تو ملکہ اپنے دل میں خوش ہوئی کہ "اتنا تو ہوا کہ لوگ اگر سجدہ نہیں کرتے تو آتے وقت خوب جھکتے اور زمین کے قریب تک سر پہونچا دیتے ہیں" چند روز میں عبدالعزیز کو بھی اس شان فرعونیت میں مزہ ملنے لگا۔

اب عربی شوہر کو اس جاہ و تمکنت میں خوش دیکھ کے ملکہ کہنے لگی "آپ میں بادشاہوں کی سی شان تو پیدا ہوگئی اور لوگوں کے دلوں میں آپ کا رعب بھی قائم ہوگیا۔ لیکن ابھی تھوڑی کسر باقی ہے۔ میں آپ کے لئے ایک تاج بنواؤنگی۔ اُسے پہن کے جب آپ دربار کریں گے تب آپ کو حکومت کا پورا لطف آئیگا" عبدالعزیز نے ہزار نہیں نہیں کی مگر پری جمال ملکہ نے ایک نہ سُنی۔ اور جو کچھ سونا اور جواہرات اُس کے پاس تھے اُنھیں گلوا کے ایک اعلیٰ درجہ کا بھاری اور مرصع تاج بنوایا اور عربی نژاد شوہر کو پہنا دیا۔ اب مسلمانوں کو نظر آیا کہ عبدالعزیز کیا سے کیا ہوا جاتا ہے! اس کی نخوت کس درجے کو پہونچ گئی ہے؟ اور شرفائے اسلام کو کس طرح ذلیل کر رہا ہے! یک بیک ناراضی کی ہوا پھیلی۔ اور تمام عرب جو اندلس میں جا جا کے اقامت گزیں ہوئے تھے برانگیختہ ہو کے اُٹھ کھڑے ہوئے اور اواخر ۹۷ھ میں اسی دیوان خانے کے اندر گھس کے اُسے مار ڈالا۔

اس کے دو صدیوں بعد بھی ہمیں مسلمانوں کی یہی حالت نظر آتی ہے اگرچہ اب خلافت عباسیہ میں پوری طرح عجمی شکوہ و اجلال پیدا ہوگیا تھا مگر عربوں کی فطرت اور اسلام کی تعلیم کا اثر بہت کچھ باقی تھا۔ چنانچہ المقتدر باللہ عباسی کے عہد میں بلغاریہ کے فرمان روا المس بن شلکی بلطوار نے دربار خلافت میں اپنا ایلچی بھیج کے ظاہر کیا کہ میں نے دین اسلام قبول کیا ہے۔ امیرالمومنین کوئی ایسا شخص بھیجیں جو مجھے اور میری رعایا کو دین اسلام کی تعلیم دے اور ایک زبردست قلعہ بھی میری قلمرو میں تعمیر کر دے۔ اس سفارت کے جواب میں بغداد سے نذیر خرمی اور اس کا غلام سوسن روانہ کئے گئے۔ شاہ بلغاریہ

نے اسلام قبول کرکے اپنے دارالسلطنت میں ایک مسجد جامع قائم کرلی تھی جس میں
جمعہ کی نماز ہوا کرتی نذیر خرمی نے نماز پڑھی تو دیکھا کہ خطبہ میں اُس کا نام اس طریقہ
سے لیا جاتا ہے کہ "اللھم اصلح الملک بلطوار ملک بلغار" (خداوندا ہمارے
بادشاہ بلطوار شاہ بلغار کو ترقی دے) اس کو اسلامی سفیر نذیر خرمی نے بالکل جائز
نہ کہا۔ اور کہا آپ جانتے ہیں کہ امیر المومنین المقتدر باللہ ہمارے اور آپ
کے دونوں کے آقا ہیں۔ اور اُن سے زیادہ رتبہ کسی کا نہیں ہو سکتا۔ مگر انھوں
نے بھی خطبہ میں صرف ان الفاظ میں اپنا نام لئے جانے کی اجازت دی ہے
کہ "اللّٰھم اصلح عبدک وخلیفتک جعفر الامام المقتدر باللہ امیر المومنین" (خداوندا
اپنے بندے اور اپنے خلیفہ امیر المومنین امام جعفر مقتدر باللہ کو ترقی دے) یہ
سُن کے بادشاہ بلغاریہ نے کمال ارادت سے اپنے نام کے ساتھ سے شاہ کا
لفظ نکلوا ڈالا۔ اور اپنا اسلامی نام جعفر اور اپنے باپ کا نام عبداللہ قرار دے
کے حکم دیا کہ خطبہ میں اُس کا نام "جعفر بن عبداللہ" بغیر کسی تعظیمی لفظ کے لیا
جایا کرے۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ اُس وقت تک مسلمان "بادشاہ"
کے لقب کو کسی حکمران کے لئے جائز نہیں سمجھتے تھے۔

سنہ ۳۱۰ھ یعنی آج سے تقریباً ایک ہزار برس پہلے بلغاریہ کی جو حالت
تھی اُسے ہم اکتوبر سنہ ۱۹۱۲ء کے دلگداز میں بیان کر چکے ہیں۔ اس موقع پر ہمیں
اتنا ہی بتانا تھا کہ اُس وقت تک مسلمان "بادشاہ" کا لفظ کسی فرماں روا
کے لئے پسند نہ کرتے تھے۔

خلافت بغداد سے منحرف ہو کے بہت سی اسلامی سلطنتیں قائم ہوئیں مگر
اُن کے حکمرانوں میں سے جلال و کبریائی کے لقب کو کسی نے نہیں اختیار کیا۔
اُموی فرماں روایان ہسپانیہ ابتداءً صرف "امیر" کہلاتے تھے جو لقب کہ والیان
ملک کے لئے عام تھا۔ عبدالرحمٰن الناصر لدین اللہ کے زمانہ سے دعوئے
خلافت کر کے وہ "امیر المومنین" بن گئے۔ مگر بادشاہ یا سلطان کا لفظ کسی
کے نام کے ساتھ نہیں لگایا جاتا تھا۔ خلفائے بنی فاطمۂ مصر کی سطوت
بھی بہت بڑھ گئی تھی۔ اور اگرچہ خود پرستی کے جوش میں اُن کے بعض

فرماں رواؤں نے اپنی ذات میں الوہیت کی شان بتادی مگر سوا امیر المومنین یا خلیفہ کے بادشاہ کوئی نہیں کہلایا۔ خدا بن گئے مگر بادشاہ نہ بنے۔

ہم اگرچہ ٹھیک طور پر نہیں کہہ سکتے کہ "سلطان" اور "شاہ" کا لفظ پہلے پہل کن مسلمان فرماں رواؤں نے اختیار کیا۔ لیکن جہاں تک قیاس سے کام لیتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ جب دیلمیوں اور سلجوقیوں کا زور بڑھا، اور خلفائے بغداد اُن کے تابع فرمان ہو گئے۔ تو قریشی اور عربی النسل کی وجہ سے وہ خلافت کا تو دعوے نہ کر سکے مگر اپنے لئے ایسے القاب ڈھونڈھنے لگے کہ بغیر خلیفہ بنے سب سے زیادہ معزز اور سب سے بڑے حاکم تسلیم کئے جائیں۔ چنانچہ پہلے پہل انھیں نے "سلطان" اور "ملک" اور "شاہ" کے لفظ اسلام میں اختیار کئے۔

محمود غزنوی کے بعد سلطان کا لقب عام ہو گیا ادھر ایران و ہندوستان کے فرماں روا "بادشاہ" اور "ملوک" بن گئے۔ اور ادھر مصر و روم کے حکمران "سلاطین" و "ملوک" کہے جانے لگے۔ پھر ان الفاظ کے مروج ہوتے ہی لوگوں کو اسلامی و عربی آداب بالکل بھول گئے۔ اور درباروں میں ادب و تعظیم کے ایسے الفاظ اور طریقے ایجاد ہو گئے جو بالکل شرک اور کفر کے درجے کو پہونچے ہوئے تھے۔ اور علما و اتقیا کو اُن سے چشم پوشی کرنی پڑی۔

## عہد اسلام کے چند بیدین

ابھی چند روز ہوئے ہندوستان میں ایک بزرگ پیدا ہوئے تھے جنھوں نے پیغمبر بننے کی کوشش کی تھی۔ اپنا لقب "بیان" بتاتے تھے۔ اور ایک صحیفہ آسمانی بھی پیش کرتے تھے اور اُس کا نام بھی قرآن کے جوڑ پر "بیان" تھا۔ ایمان تو کوئی اُن پر کیا لاتا؟ مگر بعض احباب اُن کی جدت طرازی کے البتہ قائل ہو گئے تھے۔ لیکن تحقیق اور تاریخوں کے تتبع سے پتہ چلا کہ اُن کی نبوت

اور بیانیت دونوں ایجاد بندہ نہیں بلکہ مال مسروقہ تھیں۔ اس لئے کہ بیان نام ایک مدعی نبوت بزرگ ۱۱۹ھ ہجری اور اموی خلیفۂ ہشام بن عبدالملک کے عہد میں نمودار ہو چکے ہیں۔

اور ہوا یہ کہ سنہ مذکور میں یکایک چار کوفہ میں بیدین ملحدوں کی وضع کے چند شخص نمودار ہوئے جو اپنے پیروؤں اور معتقدوں میں "وسفا" کے لقب سے یاد کئے جاتے۔ ان میں سب سے زیادہ طبیعت دار دو شخص تھے۔ ایک بیان اور دوسرا مغیرہ بن سعید۔ اگرچہ یہ دونوں شخص باہم ربط و ضبط اور اتفاق رکھتے تھے۔ مگر دونوں کے خصائص اعتقادی جدا جدا تھے۔ لہذا ہم دونوں کا حال بھی الگ الگ بیان کرتے ہیں۔

بیان کا سب سے پہلا عقیدہ تو یہ تھا کہ حضرت علی کو خدا بتاتا تھا۔ اُن حضرت کے بعد وہ حضرات حسنین علیہما السلام کو بھی جدا جدا دو خدا کہتا۔ اُن کے بعد کہتا کہ خدائی محمد بن حنفیہ میں اور پھر اُن کے فرزند ابو ہاشم میں منتقل ہوائی۔ اصول یہ تھا کہ الوہیت تناسخ کی شان سے اجسام انسانی میں حلول کر کے نمودار ہوا کرتی ہے۔ جو اصول کہ ہند و فلسفۂ الٰہی کا ہے۔ خلاصہ یہ کہ ہندو کے مذاق کے اوتار اُس نے خاندان رسالت عرب میں ڈھونڈھ کے پیدا کر لئے تھے۔ اس کے ساتھ دعوے تھا کہ خدا ایک وقت ہر چیز کو فنا کر دیگا سوا اپنے وجہ (چہرے) کے اور اس کی دلیل قران مجید کی یہ آیۂ کریمہ تھی کہ "ویبقی وجہ ربک ذوالجلال والاکرام"۔ غنیمت یہ تھا کہ ان اگلے بزرگ "بیان" نے اپنی ذات کو مظہر ایزدی نہیں بتایا۔ بلکہ اپنے واسطے نبوت و رسالت اختیار کی تھی۔ اب پیغمبری کا دعویٰ کرتے تھے۔ اور فرماتے کہ خدا وند جل و علا نے قران میں جو فرمایا ہے کہ "ہذا بیانٌ للناس" اس میں اُس حضرت رب العزت نے میرے ظہور کی خبر دی ہے اور خاص میرا ذکر کیا ہے۔

دوسرے بزرگ مغیرہ بن سعید کا درجہ بیان سے بہت زیادہ بڑھا ہوا تھا۔ اُنھوں نے تخلیق عالم کا حال ایک نہایت ہی دلچسپ عنوان سے

ارشاد فرمایا تھا۔ وہ خدا کے صاحب جسم ہونے کے قائل تھے اور کہتے کہ اُس حضرت رب العزت کی صورت ایک انسان کے مثل ہے۔ جس کے سر پر تاج ہو۔ اُس نے جب عالم کے پیدا کرنے کا ارادہ کیا۔ تو اپنے اسم اعظم سے کچھ کہا۔ وہ سُنتے ہی اُڑا۔ اور اُس تاج پر آ کے گرا جو خدا کے سر پر ہے۔ پھر اُس نے انگلی سے اپنی ہتھیلی پر سارے بندوں کے اعمال بُرے بھلے سب طرح کے لکھے۔ لکھنے کے بعد بُرے افعال پر جو خدا کی نظر پڑی تو اُسے پسینہ آگیا۔ اُس پسینے سے دو سمندر پیدا ہوئے۔ ایک کھاری اور تاریک۔ اور دوسرا شیریں و روشن۔ اس کے بعد وہ حضرت جل و علا سمندر کے اوپر نمودار ہوا۔ اور پانی میں اپنا عکس دیکھ کے جھپٹا کہ اُسے پکڑ لے۔ سایہ اُڑ کے اوپر بھاگا۔ اور خدا نے چاہا کہ اُسے پکڑ لے۔ چنانچہ اوپر اُڑ کے پکڑ لیا۔ اور فوراً اُس کی دونوں آنکھیں نکال لیں۔ اور آنکھیں اوپر پھینکا۔ جو آفتاب اور ماہتاب اور آن کے آسمان بن گئیں۔ اس کے بعد اُس نے کھاری سمندر سے کافر اور شیریں سمندر سے مومن پیدا کیئے۔ حضرت علی کے خدا ہونے کے یہ بزرگ بھی قائل تھے۔ حضرات ابوبکر صدیق اور عمر فاروق رضی اللہ عنہما اور تمام وہ صحابی جنھوں نے حضرت علی کا ساتھ نہیں دیا اُن کی تکفیر کرتے تھے۔ یہ بھی دعوے تھا کہ احکام اور شریعت تمام پیغمبروں کی ایک ہی ہے۔ اس میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ پانی کے بارے میں یہ مسئلہ تھا کہ دجلہ و فرات اور تمام ندیاں اگر اُن میں نجاست پڑ جائے تو ناپاک ہیں۔

لوگ اس شخص کو جادوگر خیال کرتے تھے۔ کہتے ہیں کہ وہ قبروں میں جا کے کچھ پڑھتا۔ اور ساتھ ہی کچھ ٹڈیاں سی اُڑتی نظر آنے لگتیں۔ راویان سلف کہتے ہیں کہ یہ شخص حضرت امام محمد باقر علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اور عرض کیا۔ کہ آپ اگر غیب دانی کا دعوے کریں۔ تو میں وعدہ کرتا ہوں کہ سارے عراق کو آپ کا مطیع فرمان بنا دوں گا۔ آپ نے یہ بیہودہ درخواست سُن کے اُسے ڈانٹا۔ اور جھڑک کے اپنے وہاں سے نکلوا دیا۔ اس کے چند روز بعد وہ آن کے فرزند محترم حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوا

اور یہی درخواست اُن حضرت سے کی۔ مگر اُنھوں نے بھی اس کے ساتھ وہی سلوک کیا جو اُن کے پدر بزرگوار نے کیا تھا یعنی جھڑک کے اپنی صحبت فیض سے نکلوا دیا۔

ان دونوں کے باقی ماندہ چار رفقا "وصفا" کے بھی غالباً یہی عقائد واصول ہونگے۔ کیونکہ گو اُن کے حالات نہیں بتائے گئے۔ مگر دونوں مذکورہ شخصوں کے ساتھ اُن کی رفاقت کہے دیتی ہے کہ ہم خیال و ہم داستان ہوں گے۔

ان لوگوں کے خروج اور ان کے فتنے کی خبر جیسے ہی مشہور ہوئی خالد بن عبداللہ قسری نے جو نہایت ہی سخت گیر اور ساری مشرقی قلمرو خلافت کا حاکم تھا انھیں اپنے سامنے پکڑوا بلایا۔ اور جیسے ہی یہ حاضر کئے گئے اُس نے جامع مسجد کوفہ میں اپنا تخت بچھوایا۔ پھر حکم دیا کہ روغن نفت (مٹی کا تیل) اور نرکل کے گٹھے لائے جائیں۔ جب یہ بھی انتظام ہو گیا تو تخت پر بیٹھ کے حکم دیا کہ یہ سب زندہ جلا دئے جائیں۔ جو سزا کہ اُن دنوں یورپ میں جادوگروں اور جادوگرنیوں کو دی جاتی تھی۔ اس حکم کے مطابق یہ لوگ جلا دیئے گئے اور دنیا سے اُن کا فتنہ دور ہوا۔

ستمبر ۱۹۱۷ء

## مسلمانوں کی شجاعت کا ایک عجیب کرشمہ

قدیم الایام میں یوں تو علی العموم مسلمانوں سے اور خاصۃً عربوں سے عجیب عجیب بہادریاں ظاہر ہوئی ہیں۔ مگر تیسری صدی ہجری کے خاتمے پر ایک نہایت ہی حیرت ناک واقعہ پیش آیا۔ جس کا بیان غالباً لطف سے خالی نہ ہوگا۔

یہ ۲۸۳ھ (۸۹۶ء) کا واقعہ ہے۔ ان دنوں اسی قوم سلاڈ کا بڑا زور تھا جس کی موجودہ یادگار روسی اور سرویہ و بلغاریہ کے لوگ ہیں۔ سلاڈ کا لفظ اُن دنوں اسکلاؤ تھا۔ جس کو عربوں نے معرب کر کے "صقلب" بنا لیا ہے۔ تاریخ عرب میں جہاں جہاں "صقلب"، "صقلبی" یا "صقالبہ" کے الفاظ آئیں اُن سے سمجھ لیجئے کہ یہی قوم مراد ہے۔ بہر تقدیر اس سال ان صقلبی لوگوں کا اس قدر

زور ہوا کہ انھوں نے جوش و خروش سے آ کے قسطنطنیہ کا محاصرہ کر لیا۔ اور اس کے گرد و نواح میں ہزاروں آدمی قتل کر ڈالے۔ اور شہنشاہ قسطنطنیہ کا ان پر کوئی زور نہ چلتا تھا۔

قسطنطنیہ میں مشرقی دولت روم کی وارث ان دنوں ایک یونانی سلطنت تھی جس نے مدت دراز سے عظمت و تمکنت کے علاوہ مذہبی تقدس بھی حاصل کر لیا تھا۔ اس لئے کہ مسیحی کلیسیائے یونان کا مرکز یہی شہر قسطنطنیہ اور اس کا عظیم الشان کنیسہ سینٹ صوفیہ تھا۔ اور آخر زمانے میں اسی کلیسیا کی مسیحیت جو پوپ کے بالکل خلاف تھی تمام صقلبی قوموں نے اختیار کر لی تھی۔

شہنشاہ قسطنطنیہ کے قبضے میں ایشیائے کوچک کا کچھ مغربی حصہ بھی تھا۔ جہاں پر اس کی سرحد خلافت بغداد کی سرحد سے ملی ہوئی تھی۔ اور مسلمان اور عیسائیوں میں ہمیشہ لڑائی چھڑی رہا کرتی جس کی وجہ سے کبھی کسی شہر کے مسلمان قسطنطنیہ کے رومی و یونانی سپاہیوں کے ہاتھ میں اسیر ہو جاتے۔ اور کبھی بہت سے مسیحی سپاہیوں کو مسلمان گرفتار کر لیتے۔ نتیجہ یہ تھا کہ جس طرح ہمیشہ بہت سے رومی مسیحی مسلمانوں کے ہاتھ میں قید رہتے اسی طرح مسلمان قیدیوں کی ایک معتد بہ جماعت قسطنطنیہ میں بھی اسیر رہا کرتی۔ چنانچہ ۲۸۳ھ (۸۹۶ء) میں جب صقلبی حملہ آوروں نے قسطنطنیہ پر دھاوا کیا ہے تو محصور شہر میں بہت سے مسلمان اسیران جنگ بھی تھے۔

ایسی نازک حالت میں جب کہ زبردست اور خوفناک دشمن دروازے پر کھڑا تھا۔ شہنشاہ قسطنطنیہ کو اندیشہ ہوا۔ کہ ایسا نہ ہو شہر کے اندر یہ مسلمان اسیر چھوٹ کے ہنگامہ مچا دیں اور لڑ بھڑ کے شہر کے پھاٹک کھول دیں۔ اور جب یہ خلجان اور کسی طرح دور نہ ہوا تو شہنشاہ نے تمام مسلمان اسیروں کو اپنے سامنے بلوا کے کہا ”اگر تم صقلبی حملہ آوروں سے مقابلہ کرنے کا وعدہ کرو تو ہم تمہیں چھوڑ دیں اور جو ہتھیار اور سامان جنگ مانگو

وہ بھی تمہاری نذر کریں گے" مسلمانوں کی اُن دنوں یہ شان تھی کہ میدان جنگ میں جان دینے کو آزادی سے زیادہ پسند کرتے تھے۔ فوراً راضی ہوگئے اور شہنشاہ قسطنطنیہ نے اسے غنیمت جان کے اسلحۂ جنگ اُن کے حوالے کئے۔ خود و زرہ سے آراستہ کیا۔ اور جس طرح موجودہ جنگ میں جرمنی مفتوح شہروں کی رعایا کو حریف کی زد پر اپنی فوج کے آگے کر دیا کرتے ہیں۔ اُسی طرح اُس مسیحی تاجدار روم نے اُن مسلمانوں کو ایک باضابطہ لشکر بنا کے زبردست حریف کے آگے چھوڑ دیا۔ اور اُنھیں شہر سے باہر کر کے اپنے پھاٹک بند کر لئے۔

ان مسلمان اسیروں نے قسطنطنیہ سے نکلتے ہی صقلبیوں پر ایسا زبردست حملہ کیا کہ وحشی صقلبیوں کے ہوش جاتے رہے۔ تھوڑی دیر تک لڑے۔ اور آخر ایسی بُری مار کھائی کہ میدان چھوڑ کے بھاگے۔ صقلبیوں کو نہ اُن کی کثرت سے نفع پہونچا۔ اور نہ اُن کی خونخواری و وحشیانہ جوانمردی کام آئی۔ انھیں بھاگتے دیکھ کے مسلمانوں نے تعاقب کیا۔ اور قلمرو قسطنطنیہ کی سرحد کے باہر نکال آئے۔ اُن کی اس بہادری کو دیکھ کے رومی و صقلبی دونوں متحیر تھے۔

نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمان صقلبیوں کو خاک میں ملا کے قسطنطنیہ کی شہر پناہ کے نیچے واپس آئے تو اب کسی کو اس کی جرأت نہیں ہوتی۔ کہ پھاٹک کھول کے اُنھیں اندر بلائے۔ مسلمان قبول کرتے ہیں کہ ہم تمہارے قیدی اور اسیر ہیں۔ لو پھر اُسی طرح ہمیں پکڑ کے بٹھاؤ۔ مگر قیصر روم کہتا ہے " اندر آ کے اُنھوں نے ہم ہی سے لڑنا شروع کر دیا تو ان سے کون لڑے گا؟ جس گروہ نے صقلبیوں کے ایسے مردم خوار درندوں کو دم بھر میں مار کے بھگا دیا اُن سے لڑنے کی یہاں کس میں طاقت ہے؟"

آخر ان مسلمانوں سے کہا گیا کہ "ہم نے تم کو آزادی دی۔ اب تمھیں قسطنطنیہ کے اندر آنے کی ضرورت نہیں باہر ہی باہر درۂ دانیال سے اُتر کے اپنے ملک میں چلے جاؤ" متحیر مسلمانوں نے جو حسن خدمت کے اس

عجیب و غریب صلے پر حیران تھے کہا، ہم تو خیر چلے جائینگے مگر یہ اسلحہ اور سامان جنگ جو آپ نے مرحمت فرمایا ہے۔ اسے تو لے لیجئے"! جواب دیا گیا اس کے لئے بھی تمہارے تمہارے شہر میں آنے کی ضرورت نہیں۔ ہم اپنے داروغہ کو شہر کے باہر تمہارے پاس بھیجے دیتے ہیں جو ہتھیار دئے گئے ہو اُس کے حوالے کردو اور چلے جاؤ"۔ مسلمانوں نے قبول کیا۔ اور کسی عہدہ دار نے باہر آکے اُن سے اسلحہ لے لیئے۔ اُنھوں نے بھی خوشی سے جو کچھ لیا تھا حوالے کردیا۔ اور ہنستے کھل کھلاتے اور قسطنطنیہ والوں کی قدردانی پر تعجب کرتے ہوئے سمندر پار ہو کے خاک ایشیا پر اُترے۔ اور اپنے گھروں کی راہ لینے کو تھے کہ ناگہاں بغداد سے ایک سفارت آئی۔ اور یہ طے ہوا کہ تمام مسلمان قیدی چھوڑ دیئے جائیں۔ اور اُن کے عوض میں اتنے ہی مسیحی قیدیوں کو خلافت چھوڑ دے گی۔

یہ معاملت قسطنطنیہ میں غنیمت بلکہ نعمت غیر مترقبہ سمجھی گئی اور جن اسیروں کو اُنھوں نے خود ہی خوف کھا کے چھوڑ دیا تھا اُن کے عوض میں قیصر کو اپنے بہت سے اسیر بھی واپس مل گئے۔

دسمبر ۱۹۱۶ء

## تماشائے معجزات

دین مسیحی کو یہ عجیب خصوصیت حاصل ہے۔ کہ ابتدا ہی سے اُس کے مبلغین نے حضرت مسیح کی حقیقی تعلیموں سے بے پروا ہو کے اپنے قیاسی اور خیالی منصوبوں کو اصل دین قرار دے لیا۔ پہلے جناب پولوس نے عام اشاعت دین کی ہوس میں توراۃ کو جسے جناب مسیح ہمیشہ اپنا ایمان بتاتے رہے تھے پس پشت ڈال کے اپنی من مانی شریعت بنالی۔ اس کو نہ دیکھا کہ حضرت مسیح کا دین کیا ہے فقط یہ دھن تھی کہ رومی و یونانی کس طرح مسیحی کے ماننے والے بنالیئے جائیں۔

اس کے بعد مسیحیت کی قسمت مقتدایان امت کی کونسلوں کے ہاتھ میں تھی جو روز روز نئی باتیں دین میں بڑھائیں۔ اور اپنے قیاس اور اپنی رائوں سے جو فتوی چاہیں دے دیتیں۔ ان باتوں کا لازمی نتیجہ تھا کہ مسیحیوں میں بدعت کوئی سیزنہ تھی۔ اصلی شارع سے سروکار نہ تھا۔ اور جس کاروائی کو جی چاہتا بشپوں

پنچایت اور پوپ صاحب کی چودھراہٹ میں منظور کرلی جاتی اور سمجھ لیا جاتا
اُسے روح القدس نے اُن بزرگوں کے سینے میں القا کر دیا۔
چنانچہ ان آزادیوں نے تصویر پرستی صلیب پرستی رہبان پرستی اور اسی طرح
سینکڑوں بدعتیں جو شرک کے درجہ کو پہنچی ہوئی تھیں۔ ساری مسیحی دنیا میں
پھیلا دیں۔ انھیں جدتوں میں سے ایک "تماشائے معجزات" بھی تھا۔ یعنی آسمانی
قدس کتابوں کے قصوں اور واقعات کو ناٹک کی طرح تھیٹر کے اسٹیج پر رکھا
س کا رواج حضرت سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے تقریباً دو سو برس پیشتر
سے شروع ہو کے گیارھویں صدی نبوی تک زور پر تھا۔ اور آج بھی
ض جگہ باقی ہے۔
ابتدا میں مقتدایان دین مسیحی اور سرگروہان کلیسا ڈراما یا ناٹک کے بہت
خلاف تھے۔ اور کوشش کرتے کہ مسیحی ان تماشوں سے باز رہیں۔ مگر اس میں
میابی نہ ہوئی۔ طلوع کوکب احمدی سے دو سو برس پیشتر جب انھیں یہ نظر
یا کہ تھیٹروں کے دیکھنے کا شوق ہمارے دبائے نہیں دبتا تو آمادہ ہو گئے کہ
یوں کو تھیٹروں سے روکنے کے عوض یہ طریقہ اختیار کریں کہ اس تماشا
زی ہی کو اپنا بنا لیں۔ چنانچہ لاؤڈیقیہ کے اُسقف اپالی ناریس اور اس کے
سے چند اور اشخاص نے ایسے ڈرامے لکھے جو توراۃ و انجیل کے بعض اہم
اقعات سے ماخوذ تھے۔
اس کے بعد تاریخ خاموش ہے۔ اور صاف طور پر نہیں پتہ چلتا کہ وہ
مذہبی ڈراما ناٹکوں میں اسٹیج پر دکھائے بھی گئے یا نہیں۔ لیکن چھٹی صدی نبوی
یں قسطنطنیہ کے ایک مسیحی مقتدا تھیوتی لیکٹ نے اس اندیشے سے کہ لوگ
سلمانوں کی باتیں سُن سُن کے اپنے دین سے برگشتہ نہ ہو جائیں۔ کئی مسیحی
ڈراما لکھ کے عوام کے سامنے پیش کیے۔ اب مقتدایان ملت عیسوی اس قسم کے
ور ڈرامے لکھنے لگے۔ اور لکھنے ہی تک محدود نہیں رکھا۔ بلکہ خود ہی اُن کو اسٹیج
پر لا کے دکھانے لگے۔ یک بیک عوام میں دلچسپی پیدا ہوئی۔ راہبوں اور
پادریوں میں ان تماشوں کے دکھانے کا جوش اور بڑھا۔ گرجے اور خانقاہیں

چند ہی روز میں خاموش اور سنسان عزلت کدوں کے بجائے تھیٹر بن گئیں۔ اور عبادت گاہیں ایک قسم کے ناچ گھر بن گئیں۔

تھوڑے دنوں میں ایسی تاجرانہ کمپنیاں قائم ہو گئیں۔ جنھوں نے خاص طور پر تعلیم دے کے اچھے اچھے ایکٹر تیار کیئے۔ اور پادریوں کے اُن تماشوں کو ایسی خوبی سے دکھانا شروع کیا کہ مقتدایان دین پیچھے پڑ گئے۔ اور ساری خلقت ان کمپنیوں کے تھیٹروں کی طرف متوجہ ہو گئی۔ رواج ہو گیا کہ امیروں اور معزز لوگوں کے وہاں کوئی تقریب یا دعوت ہوتی تو یہ کمپنیاں بلائی جاتیں جو اپنا تماشا دکھا کے محفل کو خوش کر دیتیں۔ اب ایسی بہت سی کمپنیاں قائم ہو گئی تھیں جو کسی ایک تماشے کو اپنے لئے اختیار کر لیتیں۔ اُسی کے مناسب سینریاں بنائی جاتیں۔ اُسی کے لئے ایکٹر اور ایکٹرسیں تعلیم دیکے تیار کرتیں۔ اور اپنا سارا سرمایہ اُسی ایک تماشے میں صرف کر دیتیں۔

ان تماشوں کا رواج روز بروز ترقی کرتا گیا۔ اور اُن میں جدتیں اور ترقیاں ہونے لگیں۔ ان مذہبی ناٹکوں کی شان اور حالت دکھانے کے لئے ہم ایک تماشے کا خاکہ ناظرین کے سامنے پیش کر دینا چاہتے ہیں۔ مثلاً ایک تماشہ "کشتی نوح" کا تھا۔ اس میں نظر آتا کہ ایک بڑی سی کشتی زمین پر قائم ہے جس کی صورت اُس زمانے کے بڑے اور پُر تکلف جہازوں کی سی ہے۔ اُس کے اوپر ایک بنگلہ نما مکان ہے۔ جس کی چوٹی پر صلیب لگی ہے کشتی پر چڑھنے کے لئے ایک سیڑھی لگی ہوئی ہے۔ حضرت نوح (ایک سفید لمبی داڑھی والا آدمی) جن جن لوگوں کو اجازت دیتا ہے۔ اُس پر چڑھ جاتے ہیں۔ اُن کی بیوی اور اُن کے دو فرزند مع اپنی بیویوں کے چڑھ گئے ہیں۔ جو وہاں کے مختلف مذاق کے مطابق اپنی اپنی بیویوں سے ہم آغوش کشتی کے اوپر منظر عام میں کھڑے ہیں۔ تیسرا بیٹا بھی سیڑھی پر ہے۔ اور اُس کی بیوی جو شاہزادیوں کا سا لباس پہنے ہے۔ کشتی کے نیچے سر جھکائے کھڑی رو رہی ہے۔ اور حضرت نوح اُسے بھی اوپر بلا رہے ہیں۔ کشتی کے سامنے صدہا زن و مرد کا ہجوم ہے۔ جو حضرت نوح کی اس کشتی کا تماشہ دیکھ رہے ہیں۔ کشتی کے اوپر پال چڑھا ہوا ہے

جس پر کچھ نقش ونگار بنے ہیں۔ اور چند حروف لکھے ہیں۔ جو کلیسی کا نام بتاتے ہیں۔

اسی طرح کے جملہ واقعات جو توراۃ میں مذکور ہیں۔ تھیٹر کی شان سے دکھائے جاتے اور لوگوں کی بڑی دلچسپی ہوتی۔ ان میں فقط آدمی۔ فرشتے۔ شیاطین تثلیث کے اقانیم ثلثہ یعنی باپ بیٹا۔ روح القدس بھی اُن لوگوں کے مذاق کی خیالی شکلوں میں تماشائیوں کے سامنے پیش کیے جاتے۔ اور لوگوں کے دلوں پر اُن کا بڑا اثر پڑتا۔ حضرت نوح کی کشتی تو ایک دنیا کی چیز تھی مسیحیوں کے یہ مذہبی تھیٹر جنت ودوزخ۔ تخلیق عالم کے ہفتے اور تمام چیزوں کے فنا ہو جانے کا تماشا بھی دکھا دیا کرتے۔ جس طرح ہندو رہس کے ذریعے سے سری کرشن جی کی زندگی اول سے آخر تک دکھاتے ہیں۔ یہ مسیحی تھیٹر حضرت مسیح کی ساری زندگی آپ کے ورود بیت المقدس سے لے کے اُس وقت تک جب کہ مریم مگدلینی نے آپ کو زندہ ہو کے قبر سے نکلتے دیکھا تھا۔ اسٹیج کے اوپر دکھا دیا کرتے۔

ان مذہبی تھیٹروں ہی سے منتقل ہو کے یورپ کے موجودہ تھیٹر بن گئے ہیں۔ جو مذہب کے دائرے سے نکل کے اب تاریخی واقعات اور اخلاقی اسلوب زندگی کے حالات سے وابستہ ہو گئے ہیں۔ ان ڈراموں میں لوگوں کی دلچسپی بڑھنا شروع ہوئی۔ اور آخر یہاں تک نوبت پہونچی کہ وہ اگلے مذہبی ڈرامے نظروں سے غائب ہو کے فنا ہو گئے۔ لیکن یہ نہ خیال کیجیے کہ اُن کا نام ونشان بھی نہیں رہا۔ یورپ کے بعض مقامات میں اب بھی کبھی کبھی اُن کا تماشہ دیکھ لیا جا سکتا ہے۔

علاقۂ باوئیریا کے ایک شہر میں ۱۶۳۲ء عیسوی میں ایک قسم کا شدید طاعون پیدا ہوا تھا۔ جس سے لوگ بہت ہی پریشان ہو رہے تھے۔ اسی پریشانی میں اُس طاعون کے دور کرنے کے لئے حضرت مسیح کی زندگی کا مذہبی تماشا دکھایا گیا۔ اور منت مانی گئی کہ اگر یہ مرض دور ہو گیا تو ہر دسویں برس ہم اس تماشے کو ضروری کیا کریں گے۔ طاعون جاتا رہا۔ اور وہ منت آج تک

پوری ہو رہی ہے۔ اور اُس کے ذریعے سے آج جب کہ وہ دینی ملاعبت ساری دنیا سے مٹ چکی ہے، بویریا میں اب بھی ہر دس برس میں ایک بار یہ تماشا بڑی دھوم دھام سے ہوا کرتا ہے۔

اسی سلسلہ میں قدیم اہلِ یورپ میں ایک ہولناک ناچ کا بھی رواج تھا جو "رقص مرگ" کہلاتا۔ آٹھویں صدی نبوی میں وہ بکثرت دکھایا جاتا۔ اس مہیب ناچ کا مقصود یہ تھا کہ دینداروں کو آنکھوں سے دکھایا جائے کہ موت نوعِ انسانی پر کیسی قدرتِ تامہ رکھتی ہے۔ اس میں ملک الموت اپنے ماتحت فرشتوں کے ساتھ اسٹیج پر آتا۔ پھر وہ لوگ آتے جن کی وہ روح قبض کرنیوالا ہے۔ یہ سب ناچتے۔ اور ناچ ناچ کے ملک الموت اپنا دستِ قضا اُن پر دراز کرتا۔ وہ اُس سے بچنے کی بیسیوں تدبیریں کرتے۔ مگر بچ نہ سکتے۔ یہ ناٹک بھی خاص گرجوں کے اندر یا اُن کے زیرِ سایہ دکھایا جاتا۔ خود پادری ایکٹر ہوتے جو اپنے خیال کے مطابق ملائکہ موت کے بھروپ میں آتے۔ ملک الموت میں اور اُس کے بیس ماتحت فرشتوں میں کچھ دیر تک مختصر و مؤثر گفتگو ہوتی۔ اسکے بعد اُن لوگوں پر دست درازی شروع ہو جاتی جن کی قضا آگئی تھی۔

اس قسم کے رقص مرگ کا تماشا پہلے پہل جرمنی میں ایجاد ہوا تھا جہاں کا فرماں روا آج کل اپنے بزرگوں کی بہ نسبت زیادہ خوبی و وسعت سے ساری دنیا کو یہ تماشا دکھا رہا ہے۔ جرمنی کے بعد یہ رقص فرانس میں شروع ہوا جہاں چند ہی روز میں اُس کا بہت رواج ہو گیا۔ فرانس میں یہ رقص خدا جانے کیوں اور کس مناسبت سے مصر کے ایک قدیم تارک الدنیا راہب وولی سینٹ مکاریوس کی جانب منسوب ہو کے اُسی کے نام سے مشہور کر دیا گیا۔

فرانسیسیوں کو یہ موت کا ناچ ناچتے تھوڑے ہی دن ہوئے تھے کہ بجائے اس کے کہ ایکٹر اسٹیج پر آ کے یہ ناچ دکھائیں اسی ناچ کے بڑے بڑے مرقع اسٹیج پر دکھائے جانے لگے۔ اور جو واقعات مرگ پیشتر ڈراما کی صورت میں دکھائے جاتے تھے اب تصویروں کی وضع میں کر دیے گئے

مختلف مرقعے تھے۔ جن میں پہلے مروجہ ڈراما کے تمام سین بنا دیے گئے تھے۔ موت کے ان مرقعوں کے دکھانے کا رواج فرانس سے ترقی کر کے انگلستان میں پہونچا۔ لیکن یہ ایسا تماشا تھا کہ تھوڑے دنوں میں لوگ اکتا گئے۔ اور اُس کا رواج جاتا رہا۔ مگر رقص مرگ کے مرقعے جو اُس زمانے کی یادگار ہیں۔ اکثر حد تک یورپ اور انگلستان میں آج تک موجود ہیں۔ جو عبرت کی نگاہوں سے دیکھے جاتے ہیں۔ نویں صدی نبوی میں رقص مرگ کا ڈراما بالکل موقوف ہو گیا۔ اور اُس کی جگہ فقط ملک الموت کی کارروائیوں کے مرقعے نظر آ رہے تھے۔

لیکن یہ مرقعے بھی آغاز رواج کے وقت صرف راہبوں اور ننوں کی خانقاہوں کے خاموش حجروں میں رہا کرتے اور کسی جگہ نہ دیکھے جا سکتے تھے۔ تھوڑے زمانے کے بعد وہ اُن خانقاہوں سے نکل کے عام لوگوں کے سامنے اور عام مقامات میں دکھائے جانے لگے اور زندہ آدمیوں کا بہروپ بھر کے آنا اس قدر ترک ہو گیا کہ لوگوں کو یاد بھی نہ رہا۔ اور ان ہولناک مرقعوں کی اصلیت لوگوں کو بھول گئی۔

اب دسویں صدی نبوی کے ایک مشہور نقاش ہوبیان نے اپنا کمال نقاشی ان مرقعوں میں دکھایا۔ اُس نے رقص مرگ کے ڈراما کو ترپن مناظر میں تقسیم کیا۔ اور اُن کے ترپن اعلیٰ درجے کے مرقعے بنائے جن کو وہ "تصورات مرگ" کہتا۔ یہ مرقعے جن لوگوں نے دیکھے بہت پسند کیے۔ اور ہوبیان کے ہاتھ کے وہ اصلی مرقعے آج تک دار السلطنت روس پیٹروگراڈ میں حفاظت سے رکھے ہوئے ہیں۔ مگر آج کل خود ملک روس مرقع مرگ بنا ہوا ہے۔

نومبر سنہ ۱۹۱۷ء

## دربار کسریٰ میں ایک قریشی تاجر

یہ غیلان ابن سلمہ تھے جو طائف میں رہتے تھے اور بنی ثقیف کے سردار تھے اُن کی ماں سبیعہ جناب معاویہ کے دادا اُمیّہ ابن عبد شمس کی بہن تھیں شاعر تھے اور اُسکے ساتھ نامی گرامی شہسوار۔ اُن کا شمار صحابہ میں ہے۔ اور اُن شرفائے قریش میں سے ہیں جنہوں نے توحید کی سخت مخالفتوں کے بعد مجبور اور بیدست

دیا ہو کے ایمان قبول کیا لیکن اب بھی شرف ہجرت سے محروم رہے۔ اُن کی بیٹی بادیہ بنت غیلان کے حسن و جمال کی قبائل عرب میں بڑی شہرت تھی۔ چنانچہ بروایت محدثین منقول ہے کہ ایک دن مدینے کے مشہور ہیجڑے ہیت نے حضرت ام المومنین اُم سلمہ کے صاحبزادے عمر یا اُن کی بہن سلمہ سے کہا، "اگر خدا مسلمانوں کے ہاتھوں سے طائف کو فتح کرا دے تو آپ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کر کے غیلان کی بیٹی بادیہ کو مانگ لیں۔ وہ گوری ہے ہنس مکھ ہے۔ آنکھیں سرگیں اور بڑی بڑی ہیں۔ کمر باریک ہے اور پیٹ پچکا ہوا ہے۔ چلتی ہے تو نازک ٹہنی کی طرح کمر لچک لچک جاتی ہے۔ بیٹھتی ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ خوبصورت پودھا اپنی جگہ پر قائم ہے بات کرتی ہے تو نغمہ خیز آواز سے ایسا ظاہر ہوتا ہے کہ جیسے گا رہی ہے۔ سامنے سے آتی ہے تو پیٹ میں چار بٹیں نظر آتی ہیں اور پیٹھ پھیر کے چلتی ہے تو دونوں کولوں پر بٹوں کے چار سرے نظر آ کے اُن چار بٹوں کو آٹھ بنا دیتے ہیں"

غیلان کی ایک بیوی خالدہ بنت عاص تھیں جن کے بطن سے اُن کے دو فرزند عمار و عامر پیدا ہوئے۔ یہ دونوں اُن سے پہلے مسلمان ہوئے اور باپ کو طائف میں چھوڑ کے جوار رسول اللہ صلعم میں سکونت اختیار کی اور دولت ہجرت سے شرف یاب ہوئے۔ غیلان دولتمندان عرب میں تھے اُن کا ایک غلام جو تحویلدار تھا اُس نے بیٹوں کے جانے کے بعد یہ حرکت کی کہ جو کچھ جمع پونجی تھی اڑا دی۔ اور غیلان سے آ کے یہ بیان کر دیا کہ آپ کے صاحبزادے عمار چرا لے گئے۔ غیلان کو یقین آگیا۔ مختلف لوگوں سے اُن کی شکایت کی اور جا بجا یہ واقعہ مشہور ہو گیا۔ عمار نے اگرچہ سنا مگر دم نہ مارا اور مدینے میں خاموش بیٹھے رہے۔ اتفاقاً ایک روز بنی ثقیف کے کسی گھرانے کی ایک لونڈی غیلان کے پاس آئی اور کہا، "اگر میں آپ کی دولت کا پتہ لگا دوں تو مجھے کیا دیجئے گا؟" کہا، "جو مانگو" بولی "یہ اقرار کیجئے کہ مجھے خرید کے آپ آزاد کر دیں گے" کہا "منظور" وہ بولی "تو پھر میرے ساتھ چلئے" یہ اُس کے ساتھ ہو لئے۔ اور اُس نے راستے میں یہ بیان کیا کہ "آپ کے فلاں غلام نے جو

آپ کا تو یلدار ے ایک رات کو ایک مقام پر جاکے گڑھا کھودا اور اُس میں کوئی چیز گاڑ دی۔ اتفاقاً میں دور سے دیکھ رہی تھی خیال کیا کہ اُس نے کوئی مال چرا کر یہاں دفن کیا ہے پھر اُس کے بعد جب یہ دیکھا کہ وہ غلام دن بھر میں کئی کئی بار وہاں جاتا اور اُس مقام کی نگہبانی کرتا ہے تو یقین آگیا کہ اُس نے آپ کی دولت چرا کر وہاں گاڑی ہے"۔ انھیں باتوں میں وہ مقام آگیا۔ اور لونڈی نے کہا "لیجیے دیکھئے یہ وہ جگہ ہے۔ غیلان نے کھودا تو اپنی گم شدہ دولت ہاتھ آگئی۔ اسی وقت اُٹھا کے گھر لے آئے۔ اور اس لونڈی کو مول لے کے آزاد کر دیا۔

اب اس دولت کے مل جانے کی خبر جو مشہور ہوئی تو مدینۂ طیبہ میں عمّار نے بھی سنا۔ سنتے ہی طیش میں آکے قسم کھا گئے کہ "خدا کی قسم اب کبھی بابا میری صورت نہ دیکھینگے"۔ اس عہد کا انجام یہ ہوا کہ چند روز بعد جب غیلان بھی ایمان لائے تو اُن کے دونوں فرزندوں عامر و عمّار نے مدینہ چھوڑ دیا خالد ابن ولید کے ساتھ ملک شام میں چلے گئے اور وہاں جب طاعون عمواس شدت پر تھا عامر نے اس مہلک مرض میں مبتلا ہو کے سفر آخرت کیا۔

غیلان بڑے بہادر سپہ سالار تھے چنانچہ ایک بار بنی عامر کو جو ایک لشکر عظیم کے ساتھ طائف پر حملہ آور ہوئے تھے اور ایک بار بنی خثعم کو جو بہن سے متعدد قبائل کا بڑا بھاری گروہ لے کے طائف پر چڑھ آئے تھے شکست دے دی۔ تعاقب میں دشمنوں کا خوب خوب قلع قمع کیا خصوصاً دوسرے موقع پر یمانیوں کی بہت سی عورتیں بھی پکڑ لی تھیں جن کو کمال شرافت سے احسان رکھ کے چھوڑ دیا۔

مگر اُن کی زندگی کا سب سے اہم اور دلچسپ واقعہ جس کے لئے ہم نے یہ مضمون لکھا ہے یہ تھا کہ ایک بار قریش کے تین نامور تاجر ابوسفیان ابن حرب عدنی اور یہی غیلان ابن سلمہ اپنے اپنے تاجرانہ قافلوں کو لے کے عراق کی طرف روانہ ہوئے کسی منزل پر پہونچ کے تینوں گروہ جمع ہو گئے

ور ابوسفیان نے سب کو جمع کر کے کہا، "یہ سفر مجھے خطرناک نظر آتا ہے ایک
اسطوت تاجدار جبار کی قلمرو میں جا رہے ہیں۔ جس سے وہاں جانے کی اجازت بھی
ہیں حاصل ہوئی ہے یہ بھی نہیں کہ اس سرزمین میں ہم تجارت کی غرض سے
کثر آتے جاتے رہے ہوں لہذا مناسب یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہم تینوں میں
سے ایک شخص ان تینوں قافلوں کو لے کے آل ساسان کے قلمرو میں چلا جائے
ور خرید و فروخت کر کے بعد واپس آئے۔ مگر یہ شرط ہے کہ اگر وہ وہاں مار ڈالا گیا
ہم پر اُس کے خون کی کوئی ذمہ داری نہیں ہے۔ اور اگر نفع حاصل کر کے
واپس آیا تو تینوں قافلوں کی ساری تجارت کا آدھا نفع اُس کا حق ہوگا۔ اس
وقع پر اور کسی کو آمادگی ظاہر کرنے کی جرأت نہ ہوئی۔ غیلان نے کہا، "اچھا
ہی شرط ہے تو پھر مجھے جانے دو میں جس طرح بنے گا اس کام کو انجام دوں گا
س قرارداد کے مطابق وہ تینوں قافلوں کا سالار بن کے خسرو عجم کی قلمرو میں داخل
وا۔ وہاں پہنچتے ہی اپنی بدوی وضع ترک کر دی اور دو زر در نگ کے پر تکلف
ڑے پہن کے بڑے کر و فر کے ساتھ اپنی آمد کو مشہور کرتا ہوا آل ساسان کے
ار السلطنت میں داخل ہوا۔ اور کسرئے عجم کے عالیشان قصر کے پھاٹک پر جا کے
یٹھ گیا۔ جہاں چند روز انتظار کرتے رہنے کے بعد داخلے کی اجازت ملی۔ خدام بارگاہ
نے قصر کے اندر ایک ایسے مقام پر لیجا کر اُسے کھڑا کر دیا جہاں نظر کے سامنے
سونے کی چلمن پڑی ہوئی تھی اتنے میں شاہی ترجمان نمودار ہوا اور کہا، "حضور
جہاں پناہ پوچھتے ہیں کہ تمہیں بغیر اجازت کے میرے ملک میں آنے کی کیونکر
جرأت ہوئی؟" غیلان نے ادب سے کہا، "بارگاہ خسروی میں تجارت کی غرض
سے آیا ہوں اگر خسرو جہاں پناہ پسند فرمائیں تو یہ سامان تجارت خود ہی قبول
فرمالیں ورنہ اجازت ہو کہ میں حضور کی رعایا میں فروخت کروں۔ اور یہ بھی
مرضی مبارک کے خلاف ہو تو اجازت عطا کی جائے کہ اپنا مال واپس لیجاؤں گا
ب ایک بلند آواز سنائی دی جس کو سنتے ہی غیلان سجدے میں گر پڑا اور
زمین بوس ہوا اُٹھا تو ترجمان نے کہا، "حضور جہاں پناہ پوچھتے ہیں تم نے کیوں سجدہ
کیا؟" غیلان نے کہا، "میں نے ایک بلند آواز سنی اور دل میں خیال کیا کہ ایسے

دربار میں جب میں خود خسروی چشم کے سوا دوسرا اس بیباکی سے بات نہیں کر سکتا اور جیسے حضور جہاں پناہ کی آواز سنائی دی تو مجھ پر تعظیم فرض ہو گئی۔" اس حرکت کو کسریٰ نے بہت پسند کیا۔ اور خدامِ دربار کو حکم دیا کہ ایک قالین لا کے غیلان کے نیچے بچھا دیں۔ قالین لایا گیا اور اتفاقاً اس میں کسریٰ عجم کی تصویر بنی ہوئی تھی۔ غیلان نے جھٹ سے اٹھا کے اسے اپنے سر پر رکھ لیا۔ کسریٰ نے اس کی یہ حرکت دیکھ کے خیال کیا کہ یہ جاہل بدوی سخت احمق ہے۔ یہ بھی نہیں جانتا کہ کون چیز بچھائی جاتی ہے اور کون چیز سر پر رکھی جاتی ہے ترجمان سے کہا اسے بتاؤ کہ قالین بیٹھنے کے لئے ہوتا ہے۔" یہ سن کے غیلان نے دست بستہ عرض کیا کہ یہ تو میں جانتا ہوں۔ لیکن جب یہ قالین لا کے بچھایا گیا تو اس میں مجھے حضور جہاں پناہ کی تصویر نظر آئی پھر بھلا مجھ سے حقیر شخص کی کیا حقیقت تھی کہ اس پر بیٹھے۔ تعظیماً میں نے اسے اپنے سر پر رکھ لیا۔" یہ جواب بھی کسریٰ کو بہت پسند آیا۔ اب کسریٰ نے دریافت کرایا کہ تمہارے اولاد ہے۔ عرض کیا "میرے کئی بیٹے ہیں۔" پوچھا۔ ان میں سب سے زیادہ لاڈلا بیٹا کون ہے؟" عرض کیا "چھوٹا جب تک کہ بڑا نہ ہو جائے۔ بیمار جب تک کہ اچھا نہ ہو - اور جو بیٹا گھر سے گیا ہوا ہو جب تک کہ سفر سے واپس نہ آ جائے۔ اس جواب پر کسریٰ عجم متحیر ہو گیا اور کہا "تمہارے اس جواب میں حکیموں اور فلسفیوں کے کلام کی شان نظر آتی ہے۔ حالانکہ تم ایک بدوی اور جاہل اور وحشی قوم کے آدمی ہو۔ اچھا بتاؤ تم کھاتے کیا ہو؟" جواب دیا "گیہوں کی روٹی۔" یہ سن کے خسرو عجم نے کہا "تو معلوم ہوا یہ عقل و دانائی اسی سے ہے اونٹ کے دودھ اور کھجوروں میں یہ دانائی اور ذکاوت نہیں ہو سکتی" اس کے بعد اس کا مال تجارت جو گنے چنے دام دے کر خرید لیا۔ اسے خلعت سے سرفراز کیا اور اس کی درخواست پر چند ایرانی معمار اس کے ہمراہ کئے جنھوں نے طائف میں آ کے وہاں کا قلعہ بنایا جو طائف کا سب سے پہلا قلعہ سمجھا جاتا تھا۔ اور جناب سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے اس کا فتح کرنا بہت دشوار تھا۔

غیلان کے ایک اور بیٹے بھی جن کا نام نافع تھا۔ خالد ابن ولید کے ہمراہ جہاد کر رہے تھے۔ معرکۂ دومۃ الجندل میں اتفاقاً شہید ہو گئے۔

غیلان کو اُن کی شہادت کا بڑا صدمہ ہوا۔ اُن کے غم میں ایک مرثیہ کہا اور اس قدر روئے کہ رونا کسی طرح موقوف ہونے ہی کو نہ آتا تھا آخر لوگوں نے ملامت کرنا شروع کیا۔ انھوں نے کہا، "خدا کی قسم میرے آنسوؤں کا سلسلہ نہیں رک سکتا"۔ روتے روتے جب ایک مدت گذر گئی تو آنسو رک گئے یہ دیکھ کے لوگوں نے طعن و تشنیع کے طریقے سے کہا اب وہ قسم کیا ہوئی! بولے "وہی نافع ہیں۔ وہی غم ہے۔ لیکن درد دل فنا ہو گیا۔ اور اس کے ساتھ آنسو بھی فنا ہو گئے اور اُن سے ملنے کا زمانہ قریب آگیا"۔

غیلان نے عہد جاہلیت میں عرب کے شریف خاندانوں کی دس بیویاں اپنے نکاح میں جمع کر لی تھیں۔ جب مرنے کا وقت آیا تو بیٹیوں سے بلا کر کہا، "بیٹیو میں نے تمہاری دولت سے اچھا کام لیا اور تمہاری ماؤں کی اچھی عزت کی لہٰذا اب تم بھی اچھوں اور شریف بیویوں کے ساتھ اچھا سلوک کرنا"۔

اپریل ۱۹۱۹ء

## آپ اپنا قاتل

دنیا عجیب عبرت کدہ ہے۔ اس میں ایسے ایسے عبرت ناک واقعات گزرے ہیں کہ انسان سن کے حیران رہ جاتا ہے۔ اور اُس کے دل پر ایسی بے حسی کا عالم طاری ہوتا ہے کہ نہ اُسے عیش میں مزہ ملتا ہے اور نہ مصیبت میں تکلیف ہوتی ہے۔

دربار بنی عباس کا شاعر بحتری کہتا ہے، "میں ایک دن متوکل علی اللہ عباسی کی محفل عیش میں شریک تھا۔ زندہ دل ندیمان صحبت جمع تھے۔ وہ بذلہ سنجیاں ہو رہی تھیں۔ اتنے میں تلواروں کا ذکر چھڑ گیا اور لوگ اپنے اپنے تجربے کے مطابق تلواروں کی خوبیاں بیان کرنے لگے۔ حاضرین میں سے کسی نے عرض کیا، "امیر المومنین تلوار تو بصری ہے جو فلاں شخص کے پاس ہے۔ ہندوستا

کی بنی ہوئی ہے۔ فولاد ہندی کی ہے۔ اور تمام خوبیوں میں اپنا نظیر نہیں رکھتی" اُس شمشیر آبدار کی تعریف سُن کے متوکل کو شوق ہوا۔ منشی دربار کو بُلا کے اُسی وقت والیِ بصرہ کے نام فرمان جاری کر دیا کہ "وہاں فلاں شخص کے پاس ایک بے نظیر تلوار ہے جس کی یہ صفتیں ہیں۔ اُس کو جس قیمت پر دے اُس سے خرید لو۔ اور کمال احتیاط کے ساتھ میرے پاس روانہ کرو" والی نے فرمان خلافت پاتے ہی اُس شخص کو بلوایا اُس سے تلوار منگوا کے دیکھی۔ جس طرح بنا سمجھا بجھا کے دس ہزار درہم کے معاوضے میں خرید لی۔ اور دوسرے ہی دن معتمد لوگوں کے ہاتھوں بارگاہ خلافت میں بھیج دی۔

متوکل اُس کو دیکھ کے بہت خوش ہوا۔ جیسی صفت سنی تھی اُسے ویسا ہی پایا۔ اور اپنے وفادار وزیر فتح بن خاقان سے کہا "اب کوئی خوش رو توانا و تنومند اور بھروسے کا نوجوان ڈھونڈو۔ جس کی روداری وشجاعت کا لوگوں پر رعب پڑتا ہو۔ میں اس کو اس خدمت پر مقرر کروں گا کہ اس بے نظیر تلوار کو اپنی کمر میں لگائے میرے پیچھے کھڑا رہا کرے۔ جب تک میں دربار میں رہوں میری پشت پر حاضر رہے۔ اور جب کہیں جاؤں تو میرے ساتھ جائے۔ حضور خلافت پناہ یہ الفاظ کہہ ہی رہے تھے کہ باغر ترکی سامنے دکھائی دیا۔ باغر نہایت ہی وجیہ اور صورت دار ترکی غلام تھا۔ شجاعت میں مشہور تھا۔ اور سب سے بڑی بات یہ کہ متوکل کو اس پر بھروسہ تھا۔ غرض متوکل نے اُسے بُلا کے وہ شمشیر اُس کی کمر میں باندھ دی اور حکم دیا کہ "اس وقت سے تم میرے ایڈی کانگ ہو جب تک دربار میں بیٹھا رہوں میرے پیچھے اس تلوار کو کمر میں لگائے کھڑے رہا کرو۔ اور جب کہیں جاؤں تو میرے ہمراہ رکاب چلا کرو" باغر اس خدمت کو اپنی سرفرازی سمجھا اور اُس روز سے ایڈی کانگ کی وضع میں اپنے خلافت پناہ آقا کے ساتھ رہنے لگا۔

اس کے بعد بحتری کہتا ہے "خدا کی قسم یہ تلوار ہمیشہ میان ہی میں رہی۔ اور متوکل کی رحمدلی نے کبھی ایسا موقع نہ پیش آنے دیا کہ اُس تلوار کی کاٹ کا امتحان بھی ہوتا۔ لیکن انجام میں یہ شمشیر آبدار میان سے نکلی اور خود متوکل اور اُس کے وزیر خاقان کے قتل کرنے کیلئے"

یہ عبرت ناک انجام یوں ظاہر ہوا کہ متوکل نے پہلے اپنے بڑے بیٹے محمد المنتصر کو ولی عہد خلافت مقرر کیا تھا۔ مگر چند روز بعد باپ بیٹوں میں مخالفت ہو گئی۔ اور متوکل آمادہ ہوا کہ ناخلف بیٹے کو ولی عہدی سے محروم کر کے اس کے چھوٹے بھائی محمد المعتز کو جو باپ کا زیادہ لاڈلا اور فرمانبردار تھا وارث خلافت قرار دے۔ یہ خبر فوج میں مشہور ہوئی تو سپاہیوں اور سرداران فوج میں علی العموم ایک بد دلی پیدا ہو گئی۔ اس لئے کہ اکثر ترک سپاہی المنتصر کو اچھا سمجھتے اور اُس کے طرفدار تھے۔

آخر انھیں بد دل سپاہیوں کا ایک نمک حرام گروہ المنتصر سے جا ملا۔ اور اُس کے اشارے سے خلیفۂ وقت کی جان لینے کے درپے ہو گیا۔ ان لوگوں اور المنتصر میں جب خوب اچھی طرح عہد و پیمان ہو گیا تو اُن لوگوں نے اسی باغر کو اس خطرناک خدمت کے انجام دینے پر مامور کیا۔ اس لئے کہ وہ بھی اس سنگدل و محسن کش گروہ میں شامل تھا۔

ایک دن آدھی رات کو متوکل نشۂ صہبا سے بدمست ہو کے سو گیا تھا اور وزیر فتح بن خاقان پاس بیٹھا ہوا تھا کہ ناگہاں باغر دس ترکی سپاہیوں کے ساتھ محل میں آیا۔ مخمور خلیفہ کے برابر کھڑے ہو کے وہی اُس کی دی ہوئی تلوار میان سے نکالی۔ اور ایسا بھرپور ہاتھ مارا کہ ایک ہی وار میں متوکل کی گردن کٹ کے جدا ہو گئی۔ وزیر فتح نے جو یہ حال دیکھا تو گھبرا کے جھپٹا اور کہنے لگا۔ "کمبختو! کتو! خلیفہ ربانی کو قتل کئے ڈالتے ہو!" یہ الفاظ سنتے ہی دسوں قاتل اُس پر بھی جھپٹ پڑے ہر طرف سے وار کرنے لگے۔ یہاں تک کہ اُس کو بھی کاٹ کے ڈال دیا۔

اس کے بعد اُن خونریز شیطانوں نے متوکل اور فتح کی لاشوں کو ایک دری میں لپیٹ کے محل کے اندر ہی کسی جگہ دفن کر دیا۔ اور کسی کو خبر بھی نہ ہوئی کہ قصر خلافت میں اور اُس کے ساتھ ساری دنیا میں کتنا بڑا انقلاب ہو گیا

یہی مرقع ہائے عبرت ہیں جن کو دیکھ کے ایک اگلے نکتہ رس شاعر عجم نے

بہ آواز بلند کہہ دیا ہے۔ "اسپ و زن و شمشیر وفادار کہ دید"۔ یعنی تلوار بھی اُن چیزوں میں ہے جو ہمیشہ ایک کے پاس نہیں رہتیں۔ اس مصرع کو اکثر ناواقف لوگ عورتوں کی بیوفائی کے ثبوت میں پیش کیا کرتے ہیں۔ مگر یہ نہیں سمجھتے کہ شاعر کا مقصد عورتوں کو یہ الزام دینا نہیں ہے کہ وہ اپنے تقاضائے طبع سے اور اپنی فطرت بیوفائی کے جوش میں ایک چاہنے والے یا ایک شوہر کو چھوڑ کے دوسرے چاہنے والے اور شوہر کے پاس چلی جاتی ہیں۔ نہیں ایسا نہیں ہے۔ اگلے دنوں معمول تھا کہ ایک قوم دوسری قوم پر فتحیاب ہوتی تو اُس کے ملک و مال اُس کے اسلحہ و لباس۔ اُس کے گھوڑوں اور مویشیوں کے ساتھ اس قوم کی عورتوں کو بھی پکڑ کے اپنے تصرف میں لاتی تھی۔ لہذا شاعر کہتا ہے کہ ایسا گھوڑا ایسی عورت اور ایسی تلوار کس نے دیکھی ہے جو ہمیشہ ایک ہی کے پاس رہیں۔

مقصد یہ کہ تینوں چیزیں ایسی ہیں جن کو جابر و غاصب ایک دوسرے سے چھینتے رہتے ہیں۔ اور اُن کی نسبت کبھی نہیں اطمینان کیا جا سکتا کہ کس کے پاس کتنے دنوں تک رہینگی۔ مگر متوکل کی اس تلوار کا واقعہ زیادہ عبرت خیز ہے۔ اس لئے کہ اُس نے گویا خاص اپنے ہی قتل کے لئے تلوار مول لے رکھی تھی اور اپنے ایک غلام کو خود ہی اس کام پر مامور کر دیا تھا۔

اسی قسم کا ایک حیرت ناک واقعہ ایک صاحب نے مجھ سے اپنا چشم دید بیان کیا جو متوکل کی تلوار کے واقعہ سے بھی بڑھا ہوا ہے۔ اُن کا بیان تھا کہ میں لکھنؤ کے عہد شاہی میں ایک رسالے کا افسر تھا۔ اُس رسالے کو ایک موقع پر کسی سرکش زمیندار کی سرکوبی کے لئے روانہ ہونے کا حکم ہوا۔ دو تین منزلوں کے بعد ایک دن ہم نے ایک آم کے باغ میں پڑاؤ ڈالا۔ دوپہر کا وقت تھا۔ اور میں چند ماتحت افسروں کے ساتھ ایک سایہ دار درخت کے نیچے بیٹھا باتیں کر رہا تھا۔ حریفان صحبت میں سے ایک صاحب سروتے سے بادام کاٹ کاٹ کے کھا رہے تھے۔ اتنے میں ایک بڑا سا غیر معمولی قسم کا چونٹا نظر آیا۔ انھوں نے ایک بادام کے چھلکے میں جو بیچ سے کٹ کے جدا

جدا ہو گیا تھا۔ اُس چونٹے کو رکھا اور دونوں ٹکڑے برابر کر کے اُس چاقو سے زمین کھود کے دفن کر دیا۔ یہ ایک مذاق سا تھا جس کو سب نے دیکھا۔ اور اُن صاحب کی سنگدلی پر تعجب کیا۔

دوسرے دن رسالے نے کوچ کیا۔ اور ہم سب اپنی مہم پر روانہ ہو گئے۔ سرکش زمیندار کو سزا دی۔ مطیع و منقاد بنایا۔ اُس سے احکام سرکاری کی تعمیل کرائی اور خوش خوش لکھنؤ کی راہ لی۔ اتفاقاً واپسی میں بھی اُسی باغ میں پڑاؤ ہوا۔ اور اُس سے بھی زیادہ اتفاق کی یہ بات تھی کہ ہم سب وہی احباب پھر اُسی درخت کے نیچے باہم بیٹھ کے باتیں کرنے لگے۔ ہمارے اُن دوست کو جنھوں نے یہاں بادام کھائے تھے۔ اپنا زندہ دفن کیا ہوا چیونٹا یاد آیا۔ فوراً چاقو سے زمین کھودی۔ بادام نکالا اور کھولا۔ تو وہی چیونٹا جو اب پہلے سے زیادہ سیاہ بڑا۔ اور تیز تھا نکل کے مجنونوں کی طرح اِدھر اُدھر دوڑنے لگا۔ اور ہم سب اُس کے زندہ رہنے اور اس وحشت کے ساتھ چاروں طرف لپکنے پر تعجب کر رہے تھے کہ ناگہاں وہ دوڑ کر اُن صاحب کے پاؤں کی چھنگلیاں میں لپٹ گیا۔ اور اس زور سے کاٹا کہ وہ تڑپ گئے میں نے اُن کی اُنگلی سے اُس چونٹے کو چھڑایا مگر وہ نہ چھوٹا یہاں تک کہ اُس کا سر ٹوٹ کے لپٹا رہ گیا۔ اتنے میں وہ بیہوش ہو کر گرے اور اُسی جگہ تڑپ کے رہ گئے

بادام کے چھلکے کی قید تنہائی نے اُس چونٹے میں خدا جانے کیا اثر پیدا کر دیا تھا کہ اُن کے حق میں ملک الموت بن گیا۔ اور ملک الموت بھی کون؟ وہ جس کو وہ خود اپنے ہاتھ سے اس وقت تک کے لئے اسیر و محفوظ کر گئے تھے جب کہ اُن کی موت لکھی ہوئی تھی۔ سچ یہ ہے کہ یہ چونٹا متوکل کی تلوار سے زیادہ عبرتناک تھا۔

(اپریل ۱۹۰۸ء)

## ایک کمسن بدویہ کی فصاحت و طباعی

ماموں رشید ایک دن دل بہلانے اور سیر و تفریح کے لئے اپنے قصر سے

نکلا۔ اور کھلی فضا کے شوق میں شہر اور آبادی سے باہر دور تک بڑھتا چلا گیا۔ صحرا میں جا رہا تھا کہ ایک کمسن بدویہ لڑکی دکھائی دی جس کے کندھے پر مشکیزہ تھا اور اُس کے بوجھ سے دبی جاتی تھی۔ اتنے میں اُس نے دور پرا پنے باپ کو دیکھا۔ اور چلائی "یَا اَبَتِ اَدرِکْ فَاھَا۔ فَقَدْ غَلَبَنِیْ فُوْھَا۔ لَاطَاقَۃَ لِیْ بِفِیْھَا"، یعنی ابا دوڑو۔ (مشکیزے کے) دہانے کو سنبھالو۔ اس دہانے نے مجھ پر زور کیا، میرا زور نہیں چلتا میں اس دہانے کو سنبھال نہیں سکتی۔" دہانے کو عربی میں "فُو" کہتے ہیں۔ اس لفظ کو نحوی ترکیب سے بدل بدل کے ایسی خوبی کے ساتھ "فا" اور "فو" اور "فی" کہا کہ مامون جسے ادب کا بہترین ذوق تھا اور فصاحت و لطافت کلام کا دلدادہ تھا۔ سنتے ہی پھڑک اٹھا۔ اس کمسنی میں اُس کی ایسی فصیح البیانی پر عش عش کر گیا۔ اور چلتے چلتے رک کے اُس سے کہا "معلوم ہوتا ہے تم فصاحت عرب کا مذاق رکھتی ہو۔" بولی کیا میں عرب کی رہنے والی نہیں ہوں؟" مامون نے کہا" عرب کی رہنے والی ہو تو بتاؤ کہ کس گروہ عرب سے ہو۔ کہا یمنیہ ہوں۔ پوچھا اور یمن کی کس قبیلے کی لڑکی ہو۔" جواب دیا "بنی قضاعہ کی" سوال کیا، "بنی قضاعہ کے کس قبیلے میں ہو۔" بتایا "بنی کلب میں۔" اس پر مامون نے ہنس کے کہا" تو معلوم ہوا تم کلاب (کتوں) میں ہو۔" اس تعریض پر وہ ایک شرمندگی کی ادا سے بولی "جی ایسا نہیں ہے۔ عرب کے ایک قبیلے نے یہ نام غلب کر لیا ہے۔ اور میں اُسی قبیلہ کی لڑکی ہوں۔"

اب اس لڑکی کی باری آئی "کہا" آپ نے تو میرا سارا حسب و نسب پوچھ لیا۔ اور میں نے سچ سچ بتا بھی دیا آپ تو بتائیے کہ کن لوگوں میں سے ہیں؟" مامون نے کہا "اُن لوگوں میں جن سے سارے اہل یمن کو بغض ہے" اُس نے ذرا تامل کیا اور کہا "تو معلوم ہوا آپ بنی مضر بن عدنان میں سے ہیں۔ مگر یہ تو بتائیے کہ مضریوں کے کس گروہ میں ہیں؟" مامون بولا "اُس گروہ میں جس کے ساتھ سارے مضری قبائل کو بغض ہے۔" کہنے لگی "تو معلوم ہوتا ہے۔ آپ قریشی ہیں۔ بہتر اب ارشاد ہو کہ قریشیوں کے کس گروہ سے آپ کو تعلق ہے؟" کہا "اُس گروہ سے جس کے ساتھ سارے قریش کو بغض و عناد ہے۔" سن کر بولی "تو یہ کہیے کہ آپ ہاشمی ہیں۔ اب یہ بھی بتا دیجیے۔ کہ آپ ہاشمیوں کے کس خاندان

کی یادگار ہیں؟" جواب دیا "اُس خاندان کی یادگار جس کے ساتھ تمام ہاشمیوں کو کینہ ہے۔" کہنے لگی تو یقیناً آپ آل عباس میں ہیں۔ مگر یہ نہیں معلوم کہ اُن میں سے آپ کس گھرانے کے آدمی ہیں؟" کہا "وہ گھرانا جس پر سارے بنی عباس کو حسد ہے۔" یہ سُن کے وہ چونک کے بولی "تو قسم ہے پروردگار کعبہ کی آپ امیرالمومنین مامون رشید کے سوا اور کوئی نہیں ہو سکتے" اتنا کہا اور مشک پھینک کے سیدھی کھڑی ہوگئی اور ایک چھوٹی خوبصورت سی بحر میں چند شعر فی البدیہہ کہہ کے مامون کی تعریف میں پڑھے جو حسب ذیل ہیں:-

مامون یاذوالمنن الشریفہ — وصاحب المرتبۃ المنیفہ
وقائد العساکر الکثیفہ — ہل لک فی ارجوزۃ لطیفہ
اظرف من فقہ ابی حنیفہ — لا والذی انت لہ خلیفہ
ماظلمت فی عملنا ضعیفہ — عاملنا یمون خفیفہ
اللص والتاجر فی قطیفہ — والذئب والنعجۃ فی سقیفہ

ان اشعار کا ترجمہ یہ ہے۔ مامون او شریفانہ احسانات والے۔ بلند مرتبے والے اور بڑی بڑی فوجوں کے لیجانیوالے ایک پاکیزہ نظم سنے گا جو فقہ ابی حنیفہ سے بھی زیادہ لطیف ہے۔ اُسی ذات کی قسم جس کا تو خلیفہ ہے۔ ہمارے قبیلے میں کبھی کسی بڑھیا پر ظلم نہیں ہوا۔ چور اور تاجر ایک چادر میں اور بھیڑ بکری ایک چھت کے نیچے ہیں۔"

اُس کی اس بدیہہ گوئی نے مامون کو اور زیادہ حیران کر دیا اور انعام و اکرام میں بھی اُس کی ذکاوت و ذہانت کا امتحان کرنے کے خیال سے پوچھا "بتاؤ تم کیا چاہتی ہو؟ ایک لاکھ درہموں کا وعدہ یا دس ہزار درہم نقد؟" بے تامل بولی "ایک لاکھ درہموں کا وعدہ۔ اس لئے کہ وعدہ کرنے والا عہد کا سچا اور بات کا دھنی ہے۔" یہ جواب سُن کے مامون اور خوش ہوا۔ اور جب اُسے ایک لاکھ درہم منگوا کے دے دیے تب اپنے محل میں واپس آیا۔

اپریل ۱۹۱۱ء

## عبداللہ بن جعفر کی فیاضیاں

عرب لوگ جاہلیت میں بھی بڑے فیاض تھے۔ اور اس جہالت و بداخلاقی کے زمانے میں جن صفات پر وہ ناز کرتے۔ اور شعراُن کی مدح سرائی میں جن باتوں پر زور دیتے وہ شجاعت تھی اور سخاوت۔ اسلام نے ان صفات کو اور زیادہ بڑھا دیا۔ اور اکثر اوقات اُن سے ایسی ایسی فیاضیاں ظاہر ہوتیں جو ساری دنیا میں حیرت کی نگاہ سے دیکھی جاتی ہیں۔

عہد جاہلیت کے مشہور و معروف فیاض عرب حاتم کا تذکرہ آپ بارہا سُن چکے ہیں اور روز سُنتے رہتے ہیں۔ اب آیئے ہم آپ کو ایک عہد اسلام کے حاتم عرب کا بھی تذکرہ سُنادیں جو فیاضی میں اگلے حاتم سے کچھ زیادہ ہی نظر آئے گا۔ یہ ابن عم رسول اللہ حضرت جعفر طیار کے صاحبزادے عبداللہ تھے۔

عبداللہ موصوف کی آبائی شرافت و عظمت تو ظاہر ہے اس لئے کہ خاص ہاشمی تھے۔ مہاجرین حبشہ کے سردار جعفر طیار کے فرزند تھے۔ حضرت رسالت اور جناب علی مرتضٰے کے چچازاد بھائی تھے۔ رہی مادری شرافت اُس کا یہ حال ہے کہ اُن کی والدۂ ماجدہ حضرت اسماء بنت عُمیس تھیں۔ جو قریش کی شریف ترین بیویوں میں شمار کی جاتی ہیں۔ وہ چار بہنیں تھیں جن میں سے ایک حضرت سرور کائنات صلعم کی زوجۂ محترمہ ام المومنین حضرت میمونہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا تھیں۔ دوسری بہن عم رسول اللہ حضرت عباس کی بیوی ام الفضل تھیں۔ تیسری بھی عم رسول اللہ سید الشہدا حضرت حمزہ کی بیوی سلمٰی تھیں اور چوتھی اخیافی بہن بھی حضرت اسماء بنت عمیس تھیں۔ جن کا عقد نکاح پہلے حضرت جعفر طیار سے ہوا جن سے حضرت عبداللہ موصوف پیدا ہوئے حضرت جعفر کی شہادت کے بعد وہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے عقد نکاح میں آئیں اور اُن کے نطفے سے حضرت محمد بن ابی بکر پیدا ہوئے۔ پھر اُن کے بعد حضرت علی رضی اللہ عنہ کی زوجۂ محترمہ تھیں۔ اور علی مرتضٰے کے فرزند

محمد اصغر اور یحییٰ اُن کے بطن سے پیدا ہوئے۔

یہ چاروں محترم بہنیں بڑی نیک نفس ستودہ صفات اور عابدہ و پرہیزگار بیویاں تھیں۔ چنانچہ حضرت رسول خدا صلعم نے اُن کی دینداری اور اُن کے زہد و تقوے کو دیکھ کر کے ارشاد فرمایا۔ "انہنّ مومنات" یعنی یہ مومنہ بیویاں ہیں۔ حضرت سیدۃ النسا فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا کی شب زفاف کے موقع پر یہی اسماء بنت عمیس ضروری خدمت و دلدہی کے لئے پردے کے پاس حاضر رہیں۔ اتفاقاً خود حضرت رسولِ خدا صلعم تشریف لے گئے اور پردے کے اُدھر کسی کا سایہ دیکھ کے دریافت فرمایا "یہ کون ہے؟" آواز آئی "میں ہوں اسماء" پوچھا "کیا عمیس کی بیٹی؟" عرض کیا "جی ہاں میں ہی ہوں۔ یا رسول اللہ میں آپ کی صاحبزادی کی حفاظت و خدمت کے لئے حاضر ہوں۔ شب زفاف میں ہر لڑکی کے پاس کسی ہمدرد عورت کا موجود رہنا ضروری ہے۔" یہ سُن کے جناب رسالت مآبؐ نے ارشاد فرمایا "تو میں بارگاہِ الٰہی میں دعا کرتا ہوں کہ تمھارے چاروں طرف سے وہ رب العزت تمہاری حفاظت و نگہبانی کرے۔"

الغرض اس مومنہ اور حریم رسالت کی معتمد علیہ بیوی کے بطن سے حضرت جعفر طیار کے فرزند عبداللہ پیدا ہوئے۔ جن کی فیاضیوں کے حیرت انگیز واقعات سنا کے ہم اپنے ناظرین کو جود و کا سبق دینا چاہتے ہیں۔ عبداللہ موصوف جب چھوٹے بچے تھے ایک دن بیٹھے مٹی کا کھلونا بنا رہے تھے۔ اتفاقاً اُدھر سے حضرت رسالت کا گزر ہوا۔ پوچھا "عبداللہ کیا بناتے ہو؟" کہا "کھلونا بناتا ہوں۔" پوچھا "بنا کے کیا کرو گے؟" کہا "بیچوں گا۔" دریافت فرمایا "اور اس کے دام کس کام میں لگاؤ گے؟" کہا "خرمے مول لونگا۔ اور کھاؤں گا۔" یہ جواب حضور نبوی کو پسند آئے۔ خوش ہوئے۔ اور دعا فرمائی "خدایا اس بچے کے ہاتھ کے کام میں برکت دے۔" اس دعا کا یہ اثر ہوا کہ عبداللہ نے زندگی بھر جس کام میں ہاتھ لگایا خدا نے برکت دی۔ اور اُنہوں نے جو چیز فروخت کی اُس میں نفع ضرور ہوا۔

اب ہم حضرت عبداللہ بن جعفر کے اور حالات سے قطع نظر کر کے اُن کی فیاضیوں کی تصویر دکھاتے ہیں۔ اس لئے کہ اس موقع پر فقط اُن کی سخاوت وحاتمیت ظاہر کرنا ہے۔ دیگر حالات کے بیان کرنے کے لئے ہمارے صفحوں میں کافی گنجائش نہیں ہے۔

جب اُن کا خوب نشو ونما ہو چکا۔ عہد خلافت راشدہ میں جہاد فی سبیل اللہ کر کے بڑے بڑے کارنامے دکھا چکے۔ اور خلافت کے باہمی فتنوں نے گھر میں خاموش بٹھا دیا۔ تو اُن دنوں اُن سے ایسی ایسی غیر معمولی فیاضیاں نمایاں ہوئیں کہ جُود وسخاوت میں ضرب المثل ہو گئے۔ اور دُور دُور کے لوگ اُن کے ایثار نفس اور بے نظیر فیاضی کے معترف تھے۔

جناب معٰویہ کے عہد میں جب مروان بن حکم ارض حجاز کا والی وحکمران تھا۔ ایک سال موسم حج کے موقع پر ایک فلاکت زدہ بدوی اُس کے دروازے پر آیا۔ اور اعانت ودستگیری کا اُمیدوار ہوا۔ مروان باوجودیکہ حاکم ودولت مند تھا اُس سے کہا۔ ”میرے پاس تو دینے کے لئے کچھ موجود نہیں ہے۔ تم عبداللہ بن جعفر کے پاس چلے جاؤ۔ وہ ضرور تمہاری مدد کریں گے“ مروان سے یہ سن کے وہ بدوی حضرت عبداللہ کے دروازے پر آیا۔ اتفاقاً اُس وقت وہ سفر حج کے لئے پابہ رکاب تھے۔ سب اسباب اونٹوں پر لد کے پہلے سے روانہ ہو چکا تھا۔ خاص اُن کی سواری کا راحلہ دروازے پر کسا اور لدا پھندا کھڑا تھا جو کچھ نقد سرمایہ تھا اسی اونٹ پر تھا۔ داہنے پہلو پر تلوار آویزاں تھی اور عبداللہ سوار ہونے کے لئے دروازے سے نکل رہے تھے۔ کہ اُس بدوی کا سامنا ہوا۔ اور اُن کی صورت دیکھتے ہی اُس نے چند اشعار پڑھے جن کا مضمون یہ تھا کہ ”آپ خاندان رسالت اور قرابت دارانِ نبوت میں سے ہیں۔ دیندار ہیں۔ اور فیاض ہیں۔ میں وہ مصیبت زدہ مفلوک الحال ہوں جس کی خبر گیری میں امیر شہر مروان نے اپنا مال صرف کرنے میں دریغ کیا۔ گو مایوس ہوں۔ مگر اُمید اس دروازے پر لے آئی۔ کہ حکومت اپنے خزانے کا دروازہ چاہے بند کر لے مگر آپ کے خزانے کا دروازہ نہیں بند کر سکتی“۔ بدوی کے یہ اشعار سن کے عبداللہ

کے دل پر بڑا اثر ہوا۔ کہا "اے بدوی میرا سب سامان تو بک چکا۔ فقط یہ اونٹ
رہ گیا ہے۔ لہٰذا یہ مع اُس تمام مال و اسباب اور ساز و سامان کے جو اس پر
ہے تیرا ہے۔ لیکن ایک بات کا خیال رکھنا۔ یہ تلوار جو داہنی جانب بندھی
ہوئی ہے۔ اِس سے کبھی بدعہدی اور فریب کا کام نہ لینا۔ میں نے
اسے ایک ہزار دینار دے کے خریدا ہے۔" بدوی نے اس کا وعدہ کیا۔
اظہارِ شکرگذاری میں چند اور شعر سنائے۔ اور اُس اونٹ کی مہار اپنے ہاتھ
میں لے کے چلا گیا۔

اسی طرح ایک اور موقع کا ذکر ہے کہ ایک ناشناسا مفلس بادیہ پیما نے
اُن کے سامنے آ کے چند اشعار پڑھے جن کا مضمون یہ تھا کہ "میں نے ایک خواب
میں دیکھا کہ ابوجعفر (یہ جناب عبداللہ بن جعفر طیار کی کنیت تھی) نے مجھے حریر
کی قبا پہنائی ہے۔ کئی دن گذر گئے۔ اُس کی تعبیر نہ ظاہر ہوئی۔ تو میں نے اپنے
ایک دوست سے اس خواب کا تذکرہ کیا۔ اُنھوں نے کہا اس خواب کی تعبیر
بغیر پوری ہوئے نہیں رہ سکتی۔ آلِ جعفر کے جن محترم بزرگ کو تم نے دیکھا ہے
کوئی معمولی شخص نہیں۔ سارا زمانہ اُن کے ابرِ کرم سے فیض پا رہا ہے۔ وہ
اس پائے کے فیاض ہیں۔ کہ خود فیاضی کو انھوں نے حکم دے رکھا ہے کہ خبردار
مجھ سے آگے نہ بڑھنا۔ اور اُس نے سرِ انقیاد جھکا کے قبول کر لیا کہ میں ہمیشہ
آپ کی لونڈی اور تابع فرمان رہونگی۔ ایسے بزرگ ممکن نہیں کہ تمہارے خواب
کو سچا نہ کر دکھائیں۔" یہ اشعار سن کے جناب عبداللہ نے اپنے غلام کو حکم دیا
کہ میری حریر کی قبا لا کے ان کو دیدو۔ غلام تو قبا لینے کو گیا اور انھوں نے اس
بدوی سے کہا "مگر تم نے خواب [illegible] وہ میری تھی [illegible] جو
حریر والی قبا سے بدرجہا اچھی ہے۔ وہ میں نے تین سو دینار کو مول لی تھی۔ مگر
یہ اُس سے بہت ہی کم قیمت کی ہے۔ لہٰذا [illegible] کو
احتیاط سے رکھیے گا۔ اب کی انشاءاللہ میں [illegible] خواب میں دکھونگا۔"
یہ سن کے عبداللہ بن جعفر ہنسے۔ اور غلام سے کہا کہ دونوں قبائیں اس
کے حوالے کر دو۔"

ایک بار کوئی تاجر بغرض تجارت بہت سی شکر لے کے مدینہ طیبہ میں آیا
مگر یہاں آکے دیکھا تو شکر کا نرخ اس قدر کم پایا کہ سمجھا میرا سارا روپیہ ڈوب گیا۔ تھوڑی
پونجی کا آدمی۔ کساد بازاری نے حواس بگاڑ دیے۔ ایک ایک کے آگے جا کے روتا۔
فریاد کرتا۔ مگر کوئی کیا کر سکتا تھا! آخر اسے زیادہ بیتاب و بیقرار دیکھ کے کسی نے
کہا [illegible] مارے مارے پھرنے سے کچھ حاصل نہ ہوگا۔ اگر
مدد چاہتے ہو تو عبداللہ بن جعفر کی خدمت میں حاضر ہو کے اپنی مصیبت بیان کرو
شاید انھیں ترس آجائے تو پھر تمہارا کام بن جائیگا۔ اشارہ پاتے ہی وہ آپ
کے پاس دوڑا آیا۔ اور اپنی مصیبت بیان کی۔ آپ نے فرمایا "اچھا اپنی شکر
یہاں لے آؤ"۔ حکم پاتے ہی وہ ساری شکر لاد کے لے آیا۔ آپ نے اپنے
دروازے کے سامنے میدان میں ایک بڑا سا فرش بچھوا کے کہا "سب
شکر اس پہ ڈھیر کر دو"۔ اس نے دم بھر میں انبار لگا دیا۔ حضرت عبداللہ نے
جب دیکھ لیا کہ اب اس کے پاس شکر نہیں باقی رہی تو لوگوں کو حکم دیا کہ اس
شکر کو لوٹ لو۔ اشارے کی دیر تھی۔ لوگوں نے جی کھول کے لوٹنا شروع کیا۔ اور
دم بھر میں میدان صاف تھا۔

جس وقت لوگ شکر کو لوٹ رہے تھے وہ تاجر اس منظر کو کھڑا حیرت
سے دیکھ رہا تھا۔ دیکھتے دیکھتے اس کے دل میں لالچ پیدا ہوا۔ اور عرض کیا "کیا
حضرت میں بھی لوٹ سکتا ہوں؟" جواب ملا "ہاں ہاں۔ شوق سے لوٹو!" اجازت
پاتے ہی وہ بھی جھپٹ جھپٹ کے اپنے خالی کئے ہوئے بورے بھرنے لگا۔ اور
بہت سی شکر اسے بھی مل گئی۔

جب شکر بالکل لٹ گئی تو آپ نے اس کی قیمت پوچھی۔ تاجر نے عرض کیا
"[illegible] ہزار درہم"۔ فوراً یہ رقم دلوا دی گئی۔ اور وہ اس کو لے کے مع لوٹی ہوئی شکر کے
خوش خوش اپنی فرودگاہ میں آیا۔ وہاں اس نے لوگوں سے یہ واقعہ بیان کیا
تو سب لوگ اس حیرت انگیز فیاضی پر تعجب کرنے لگے۔ اتنے میں کسی نے کہا
"[illegible] عبداللہ بن جعفر کی فیاضی کا تو یہ عالم ہے کہ دینا یاد بھی نہیں رہتا۔ جو آج
دینے میں [illegible] دوبارہ جا کے مانگو تو مکرر دینے کو تیار ہو جاتے

دنیا کے شائستہ ترین رنگ اور بزرگوں کے بہترین اخلاق و عادات کو دیکھ کے وہ سدھرتے جاتے۔ آج کل کوئی غفلت کرے تو اُس کے لڑکے خدا جانے کس قدر آوارہ و بداطوار ہو جائیں۔ مگر حضرت عبداللہ بن جعفر کے تمام فرزند باوجود بزرگوں کی غفلت و بے پروائی کے خاندانی کمالات سے آراستہ ثابت ہوئے۔ اور اُن کا وہی طرز عمل رہا جو اُن کے محترم خاندان کا تھا۔

عبداللہ بن جعفر سے حضرت معٰویہ سے بڑی دوستی تھی۔ اور گو کہ اکثر بنی ہاشم اُن سے ناراض تھے۔ مگر عبداللہ بن جعفر میں اور ان میں گہرے تعلقات تھے۔ ایک دن وہ جناب معٰویہ کے پاس بیٹھے ہوئے تھے کہ آدمی نے آ کے خوشخبری سنائی۔ کہ آپ کے فرزند نرینہ پیدا ہوا۔ جناب معٰویہ نے یہ مژدہ سن کے اظہار مسرت کیا اور کہا۔ بھئی اپنے اس فرزند کا نام میرے نام پر معٰویہ رکھ دو۔ یہ نام ہماری تمہاری دوستی کی یادگار رہے گا۔ اور میں وعدہ کرتا ہوں کہ اُس کی خوشی میں تم کو ایک لاکھ درہم دوں گا۔ چنانچہ عبداللہ نے اُس فرزند کا نام معٰویہ ہی رکھ دیا اس فرزند اور اُس کے بیٹے عبداللہ بن معاویہ بن عبداللہ بن جعفر نے بعد کو خاص شان پیدا کی۔ اور وہ درجہ حاصل کیا کہ اُن کی جداگانہ سیرتیں کتب سیر میں درج ہوئیں اور کبھی موقع ملا۔ تو ہم اُن کے تذکروں سے بھی اپنے ناظرین کو محظوظ کریں گے

عبداللہ بن جعفر نے بڑی عمر پائی۔ ستر برس کے سن کو پہونچ گئے۔ اور آخر عمر تک اپنی فیاضی کو کمال وضعداری کے ساتھ نباہتے رہے۔ مگر عبدالملک بن مروان نے اپنے عہد میں اُن کا وظیفہ موقوف کر دیا۔ اور اُن کی ساری آمدنی روک دی۔ جو کچھ اساسہ گھر میں تھا چند ہی روز میں جود و سخائی نذر ہو گیا۔ آخر بالکل مفلس و نادار ہو گئے۔ اس حالت میں ضروریات زندگی پورے نہ ہو سکنے کی اتنی فکر نہ تھی جتنا کہ ہاتھ کو فیاضی اور خبرگیری خلق اللہ سے روکنے کا صدمہ تھا۔

جب بالکل ناچار و سراسیمہ ہوئے تو ایک جمعہ کو بعد نماز درگاہ خداوندی

میں بصدق دل اور عجز والحاح سے عرض کیا کہ بار الٰہا! تو نے میری ایک ایسی عادت ڈالدی ہے جو آج تک کبھی مجھ سے چھوٹ نہ سکی۔ اب اگر اس کا زمانہ گذر گیا ہے تو بجائے دنیا میں رکھ کے ذلیل کرنے کے مجھے اپنے پاس اٹھا لے۔ یہ ایک سچے خدنگ سینہ کا تیر تھا جو سیدھا عرش پر پہونچا اور انجام یہ ہوا کہ بعد والے جمعہ میں بعوض ان کے ان کا جنازہ جامع مسجد کے سامنے رکھا ہوا تھا۔

یہ سنہ ۹۰ھ کا زمانہ تھا۔ اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے صاحبزادے ابان بن عثمان مدینے کے والی تھے۔ نماز جمعہ کے بعد انھیں نے نماز جنازہ پڑھائی جنازے پر تمام اہل مدینہ کا ہجوم تھا۔ اور زن و مرد رو رہے تھے کہ غریبوں اور محتاجوں کا والی اٹھ گیا۔ جنازے کی مشایعت کرنے والوں میں سے کوئی نہ تھا جس کی آنکھوں سے سیل اشک نہ جاری ہو۔

جب دفن سے فراغت ہوگئی اور مٹی دی جا چکی تو حضرت عثمانؓ کے دوسرے صاحبزادے عمر بن عثمان قدم بڑھا کے قبر کے کنارے کھڑے ہو گئے۔ اور رقت قلب سے کہا، اے ابن جعفر! خدا تم کو اپنے آغوش رحمت میں لے۔ تم صلۂ رحم کرتے تھے۔ بدکاروں کے دشمن تھے۔ اور اہل شک کے خلاف تھے۔ اور میرا تمہارا سابقہ ایسا تھا جس کو ام المومنین عائشہؓ نے اس شعر میں ظاہر کر دیا ہے جس کا مضمون یہ ہے کہ مجھ میں تم میں جو محبت تھی اس کا تم ہمیشہ پاس و لحاظ کرتے رہے یہاں تک کہ قبر نے تمہیں اپنے آغوش میں لے کے چھپا لیا۔ لہذا خدا تم پر رحمت نازل کرے۔ اس دن جبکہ تم پیدا ہوئے اس دن جبکہ تم بڑھ کے پورے توانا و تندرست آدمی ہو گئے۔ اس دن جبکہ تم نے وفات پائی۔ اور اس دن جبکہ خدا تمہیں قبر سے اٹھا کے کھڑا کر دیگا بنی ہاشم کو تو تمہاری وفات کا صدمہ ہئی ہے مگر نہیں سارے قریش تمہاری موت پر اندوہناک ہیں۔ اور آہ پھر تم سا آدمی نہ نظر آئے گا۔ گست ۱۹۱۰ء

## جنگجو عورتیں

ردری ۱۹۱۹ء

اس سے بحث کرنے کی ضرورت نہیں کہ دنیا میں کسی سرزمین میں مرد زیادہ پیدا ہوتے ہیں یا عورتیں لیکن اس میں شک نہیں کہ مختلف اسباب کے پیش آنے سے اکثر ملکوں میں عورتوں کی تعداد اکثر زیادہ ہو جایا کرتی ہے۔ عورتیں عموماً گھر میں ٹھہر کے امور خانہ داری میں مصروف رہا کرتی ہیں۔ مگر مردوں کو گھر کے باہر کے تمام کام انجام دینا پڑتے ہیں جس کے باعث آفات ارضی و سماوی سے اکثر انہیں کو سابقہ پڑا کرتا ہے۔ اور انجام یہ کہ بہت سے مرد جلا وطن ہو جاتے ہیں دوسرے ملکوں میں جا بستے ہیں۔ تلاش کسی میں مصروف ہوتے ہیں۔ اور سب سے بڑی آفت یہ کہ لڑائی اور جنگ و پیکار میں مارے جاتے ہیں۔ اسی گزشتہ لڑائی نے ایک کروڑ سے زیادہ مردوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ اور قریب قریب اتنے ہی معذور و بیکار کر دیئے۔ لیکن عورتیں ان آفتوں سے محفوظ و مصئون رہنے کے باعث اتنی ہی رہیں جتنی تھیں۔

اس پر غور کرنے سے تعدد ازدواج کی ضرورت بڑی آسانی سے نظر آ جاتی ہے۔ اگلی دنیا میں جدال و قتال کا سلسلہ بہ نسبت آجکل کے زیادہ اور برابر جاری رہتا تھا کون سا ملک تھا جہاں روز تلوار نہ چلتی ہو۔ اور جہاں کی رعایا کو پاس پڑوس والے ایک گھڑی بھی چین سے بیٹھنے دیتے ہوں۔ عربوں ہی کو دیکھئے۔ جہاں کے تمام سرکش قبائل ہمیشہ باہم برسر پیکار رہتے۔ اور ایام عرب یعنی ظہور اسلام سے پیشتر کی باہمی جنگوں کا سلسلہ ہمیشہ قائم رہتا تھا۔ ان لڑائیوں میں کیا ہوا کرتا تھا؟ یہی کہ مرد سیکڑوں اور ہزاروں کی تعداد میں مارے جاتے۔ اور عورتیں چاہیں تو زندہ رہیں۔ یا زبردست اور فتحیاب گروہ کی لونڈیاں بنیں سب زندہ رہتیں۔ اس کا لازمی نتیجہ تھا کہ عورتوں کی تعداد مردوں سے بہت زیادہ ہو جاتی۔ اور عورتوں کی اس کثرت تعداد کے بعد بجز اس کے کہ ایک مرد کئی عورتوں کی کفالت کا ذمہ دار ہو جائے فلاح کی اور کوئی صورت نہ نظر آتی تھی۔ اسی دشواری کا ایک اندوہناک اور دلخراش انجام یہ بھی تھا کہ عرب و ہند وغیرہ میں بہت سے شرفا اپنی لڑکیوں کو مار ڈالتے یا زندہ دفن کر دیا کرتے تھے۔

بہ لحاظ جذبات اور ہوسوں کے جس طرح ایک مرد متعدد عورتوں کو

چاہتا ہے اسی طرح ایک عورت بھی متعدد مردوں کو چاہتی ہے جس کا ثبوت اس سے بخوبی مل سکتا ہے کہ بہت سی منکوحہ عورتیں ایک شوہر پر قناعت نہ کر کے بداخلاقی اختیار کر لیتی ہیں اور بہت سی عورتیں بازار میں بیٹھ کر اپنے آپ کو بے شمار مردوں کے سامنے پیش کر دیتی ہیں۔ مگر باوجود جذبات فطری کی اس یکسانی کے کسی شائستہ مذہب اور مہذب قانون معاشرت نے اس کو جائز نہیں قرار دیا کہ ایک عورت جائز طور پر متعدد مردوں کی زوجہ بنے۔ بہ خلاف اس کے قریب قریب تمام ادیان سلف اور شائستہ تمدنوں نے (مجھے موجودہ تہذیب یا بعد کے وضعی قوانین سے بحث نہیں) بالاتفاق اس میں کوئی مضائقہ نہ سمجھا کہ ایک مرد متعدد بیویاں رکھے۔ جو فیصلہ یقیناً مردوں کی کمی اور عورتوں کی کثرت کی بنیاد پر تھا۔

لیکن اس عہد کی تہذیب و معاشرت نے مذکورۂ بالا ضرورت سے قطع نظر کر کے سب قوموں اور قریب قریب کل مذہبوں کو اس جانب متوجہ کر دیا ہے کہ ایک سے زیادہ جوروئیں نہ رکھی جائیں۔ یہ میں مانتا ہوں کہ اس سے مردوں کے سر سے بوجھ بہت کم ہو گیا۔ انھیں روز کے خانگی جھگڑوں سے آرام مل گیا۔ عورتوں کو رقابت یا سوتیا ڈاہ سے نجات مل گئی۔ اور زن و مرد دونوں کی مسرت بڑھ گئی۔

مگر اس دشواری کے دور کرنے کا کوئی انتظام نہیں ہوا کہ مردوں کی جلاوطنی اور ان کے مارے جانے سے عورتوں کی تعداد میں جو اضافہ ہو گا اس کا کیا علاج ہے۔ اور اس کے بعد عورتوں کی کثرت جب بدکاری و بداخلاقی بڑھائے گی تو اس کے انسداد کی کیا تدبیر ہو گی؟ مذہب اور قوانین معاشرت دو چار عورتوں کو جذبات دلی اور خواہشات نفسانی کے دبانے کا سبق دے کر پرہیزگار اور عفت شعار بنا دے سکتے ہیں۔ مگر ایک گروہ کثیر کی خواہشات روکنا اختیار سے باہر ہے۔

اس سے بہتر کوئی تدبیر نہیں ہو سکتی کہ عورتوں کو بھی مردوں کی طرح فوج میں بھرتی کیا جائے۔ جس کی انگلستان کے ایک جادو بیان ادیب

گولڈ اسمتھ نے اسپین کی لڑائی کے وقت زور و شور سے تحریک کی تھی۔ اس تحریک کو سن کر اُس وقت بھی بہت سے حضرات چونک پڑے تھے۔ اور اب بھی چونک پڑیں گے۔ ہمارے بہت سے احباب اس کو مذاق تصور فرمائیں گے۔ اور جو حضرات پردے کے حامی ہیں وہ تو از سرِ نو لعن وطعن شروع کردیں گے۔ اور اس کو بھی پردے پر ایک حملہ تصور فرمائیں گے۔ یہ ہم جانتے ہیں کہ اقوامِ مغرب کا متعصبانہ جوشِ خود پرستی اس کی اجازت نہ دیگا کہ اسلام کی پیروی میں تعددِ ازدواج کو اختیار کیا جائے۔ اس لئے کہ یہ جذبہ تمام مصلحتوں پر غالب آجاتا ہے۔ بہرحال تعددِ ازدواج سے قطع نظر کرکے اصلاح اور نظامِ تمدن کی درستی کے لئے اگر غور سے دیکھئے تو یہ تحریک نہ کوئی مذاق ہے۔ نہ خلافِ تہذیب ہے۔ اور نہ خلافِ شرع۔

عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ عورتوں میں جسمانی و روحانی کمزوری ہے۔ وہ نہ لڑائی کی مصیبتوں کو برداشت کرسکتی ہیں۔ اور نہ سرفروشی و جان بازی کے میدانوں میں ثابت قدم رہ سکتی ہیں اُن میں نہ جرأت ہے نہ شجاعت نہ دلیری ہے نہ بہادری۔ مگر میں سمجھتا ہوں کہ بہادری و شجاعت کوئی فطری و پیدائشی چیز نہیں بلکہ یہ اُن صفات میں سے ہے جو تعلیم و تربیت اور صحبت و معاشرت سے نشو و نما پاتے ہیں۔ ہم ہی کبھی بڑے بہادر تھے۔ اور بغیر تلوار اور فرا بلیجے کے نہ رہا کرتے تھے۔ یا آج ہم سب سے زیادہ بزدل اور ڈرپوک ہیں بنگالی کبھی جبن و بزدلی میں ضرب المثل تھے یا اب بہادر و جانباز ثابت ہونے لگے ہیں۔ پارسی اور یہودی کبھی دنیا کے نامور ترین شجاعوں اور تاریخی سپہگروں میں تھے اور آج حد درجے کے بزدل اور نامرد ہیں۔ شجاعت اور سپہگرانہ جواں مردی دراصل خاندانی و قومی روایتوں۔ گرد و پیش کے اثروں۔ ندیمان صحبت کے مذاق۔ سپاہیانہ معاشرت۔ بہادرانہ تعلیم و تربیت۔ اور فنونِ جنگ کی تحصیل سے پیدا ہوا کرتی ہے۔ جو گروہ ان چیزوں سے محروم ہوتا ہے بزدل ہو جاتا ہے۔ اور اُن سے جس قدر دور اور علیحدہ ہوتا جاتا ہے اسی قدر زیادہ بزدل ہوتا جاتا ہے۔ لہذا عورتوں کو اگر بہادر بنایا جائے تو نظر آجائے

کہ اُن میں کیسی بہادر اور جاں باز عورتیں پیدا ہوئی ہیں وہ سپاہی بن کر کیسے کیسے بہادری کے کام کرتی ہیں کتنے کتنے بڑے لشکروں کو شکستیں دیتی ہیں اس کے ساتھ ورزش کرائی جائے۔ سپہگرانہ فنون کی تعلیم دی جائے۔ اور مشاقی کے لئے روز لڑائی جایا کریں جس کام کو اُمید ہے کہ وہ مردوں سے زیادہ شوق اور دلچسپی سے انجام دیا کریں گی تو ممکن نہیں کہ وہ اعلےٰ درجے کی بہادر اور جنگجو اور نبرد آزما نہ ثابت ہوں۔

تاریخ قدیم میں ثابت ہے کہ اگلے دنوں علاقہ کوہ قاف میں ایسی جنگجو عورتیں رہتی تھیں۔ جنھوں نے مردوں کو اپنی قلمرو سے نکال دیا تھا۔ ہومر کہتا ہے کہ اُن کی ملکہ پنتھی سیلیا جنگ ٹرائے میں آئی۔ اور بڑائے کی فصیل کے نیچے بہادری سے لڑتی ہوئی ماری گئی۔ افریقہ کی سپاہی عورتیں ہرقلوس سے لڑی تھیں۔ اور عرب کی بہادر خاتونیں جہاد میں بوقت ضرورت مردوں کے دوش بدوش کھڑی ہو کر مقابلہ کرتی تھیں۔

آجکل کی عورتیں بھی چاہے میدان میں نہ جائیں مگر گھروں کی خانہ جنگیوں میں مردوں کا جیسا ناطقہ بند کر دیتی ہیں بڑے بڑے لشکروں سے ممکن نہیں۔ ہم اپنے محلے ہی کی بعض عورتوں کو دیکھتے ہیں کہ انھوں نے سارے محلے کے مردوں پر اپنا رعب بٹھا رکھا ہے۔ اکیلی زبان سے جتنا گہرا زخم وہ پہنچا دیتی ہیں مرد سنان اور سنگین سے نہیں پہونچا سکتے۔ ان کو اگر توپ و تفنگ بھی مل جائیں تو یہ سارے عالم میں ہل چل ڈالدیں۔

انھیں اسباب سے مجھے یقین کامل ہے کہ اگر ان کو سپاہی بنا کر مردوں کے پہلو بہ پہلو فوج میں جگہ دی جائے تو یہ سلطنت کے حق میں نہایت سود مند ثابت ہوں گی۔

فروری ۱۹۱۹ء

## علم نجوم کا ایک کرشمہ

قدیم الایام میں لوگ نجوم کے نہایت گرویدہ تھے۔ خصوصاً بادشاہ تو بجیر

اگست ۱۹۱۹ء

نجومیوں سے پوچھے کوئی کام نہ کرتے تھے۔ اسلام نے فنِ نجوم اور اُس کے فتووٗں دونوں کو قطعاً حرام اور شرک بتا دیا جس وقت عہدِ صحابہ کے مجاہدین نے حملہ کیا ہے اُس وقت کسریٰ عجم اور اُس کے درباری بالکل نجومیوں کے ہاتھ میں تھے یزدجرد نوعمری کے جوش میں بار بار تاکید کرتا تھا کہ فوراً عربوں سے مقابلہ کرو۔ مگر اُس کا پختہ مغز اور کار آزمودہ سپہ سالار رستم بن فرخ زاد جو علم نجوم میں بصیرت رکھتا تھا یہی کہتا کہ ذرا ٹھہریئے ابھی طالع نحس ہے۔ مبارک اور سعد گھڑی آئے تو بڑھوں"۔

مگر دولت و سلطنت حاصل ہونے کے بعد مسلمانوں میں جہاں اور تمام بیہودہ صفات پیدا ہو گئے۔ وہاں نجوم کا بھی زور ہوا۔ اور بادشاہانِ اسلام اُس سے زیادہ طالع سعد و نحس کے جویا اور نجومیوں کے غلام ہو گئے جسقدر کہ اگلے عجمی اور مصری و بابلی تھے۔ جس کا ایک حیرت ناک نمونہ کتاب اخبار الاول سے لے کر ہم اپنے ناظرین کے سامنے پیش کرتے ہیں۔

فاتح قسطنطنیہ سلطان محمد ثانی نے خلد بریں کی راہ لی تو اُس کا بیٹا بایزید خاں ۸۸۶ھ سے ۹۱۰ھ محمدی (۱۴۸۰ء) میں وارثِ سریرِ آلِ عثمان اور روم کا سلطان ہوا۔ یہ ایک زبردست فرماں روا تھا اور اُسی کے سامنے ایران میں دولت صفویہ قائم ہوئی۔ جس نے سارے ایرانیوں کو مذہب شیعہ اثنا عشری کا پیرو بنایا۔

اسی بایزید کو نجومیوں نے بتایا کہ آپ کے کئی لڑکوں کے بعد ایک لڑکا پیدا ہوگا جس کے ہاتھ سے آپ مارے جائیں گے۔ یہ سُن کے بایزید خاں کی عجیب حالت ہو گئی۔ اور ہر وقت اسی دھڑکے سے خشک ہونے لگا۔ آخر اطمینانِ قلب کے لئے محل کی ایک دائی کو جس پر پورا بھروسہ تھا خلوت میں بلایا۔ اور اُس سے کہا کہ میرے محلوں اور حرموں میں جس کے بطن اولاد ہو اُس کو تم خود جا کے دیکھا کرو۔ اگر لڑکی ہو تو زندہ رہنے دو۔ لیکن اگر لڑکا ہو تو اُس کو چپکے سے مار ڈالا کرو۔ مگر اس طرح کہ کسی کو خبر نہ ہو"۔ اُس عورت نے وعدہ کیا۔ اور اس ہدایت کے مطابق عمل ہونے لگا۔ اور خدا جانے کتنے بچے

سلطان کے اس وہم و مالیخولیا پر قربان ہو گئے۔

اب سلطان کے حرم میں ایک اور بچہ پیدا ہوا۔ وہ ایسا حسین اور خوبرو تھا کہ دائی کو اُس پر بڑا ترس آیا۔ لاکھ لاکھ جی کڑا کیا مگر یہ نہ ہو سکا کہ اُس کو قتل کرے۔ آخر اُس کی ماں سے کہہ دیا کہ اس لڑکے کو لڑکی کہہ کر اور لڑکیوں کے کپڑے پہنا کے پالو اور کسی پر نہ ظاہر کرنا کہ یہ لڑکا ہے۔ پھر خود جا کے سلطان سے کہا کہ محل میں شاہزادی پیدا ہوئی بایزید خاں نے اُس کا نام "سلیمہ" رکھا اور شاہزادیوں کے طریقے سے اُس کی پرورش ہونے لگی۔ اب اُس فرضی لڑکی کی شان یہ تھی کہ ذرا سی بات میں مشتعل اور غضبناک ہو جاتی اور اپنی بہن شاہزادیوں میں بیٹھتی تو ایک آفت مچا دیتی۔ کبھی اس کو مار دیا۔ کبھی اُس کو دھکیل دیا۔ اور جس بہن کے پاس کھانے پینے یا کھیلنے کی کوئی چیز دیکھتی۔ زبردستی مار پیٹ کے چھین لیتی۔ کسی کا اُس پر زور نہ چلتا اور تمام شہزادیوں کی یہ حالت تھی کہ اُس سے ڈرتیں اور اُس سے پناہ مانگتیں۔

ایک عید کو سلطان بایزید خاں محل میں آیا۔ زنانہ دربار بڑی شان و زینت سے آراستہ کیا گیا۔ سلطان آکر اپنی مسند پر بیٹھا۔ اور تمام شاہزادیوں کو اُس نے سامنے بٹھایا پھر سب کو طرح طرح کی مٹھائیاں دیں۔ تر و تازہ میوے دیئے اور اُن کے کھانے کا تماشہ دیکھنے لگا۔ سلیمہ نے دم بھر میں اپنی عادت کے موافق دست درازی اور چیرہ دستی شروع کی۔ اور ساری شاہزادیوں سے مٹھائیاں اور میوے چھین لئے۔ اور سب اُس سے ڈر ڈر کے کونوں میں دبکنے لگیں۔ یہ دیکھ کر بایزید خاں کو بڑی حیرت ہوئی۔ دیر تک سلیمہ کی حرکتوں کو غور و خوض سے دیکھتا رہا۔ اور آخر میں بولا "یہ تو لڑکی نہیں ہو سکتی" اور حکم دیا کہ "اِس کو قریب لا کے مجھے دکھاؤ"

یہ حکم سنتے ہی وہ دائی سلطان کے آگے آکر دست بستہ کھڑی ہو گئی۔ اور عرض کیا "بادشاہ کو دیکھنے کی ضرورت نہیں میں خود بتائے دیتی ہوں کہ یہ لڑکا ہے" بایزید خاں نے غصے کے چشم و ابرو سے دیکھ کر کہا "اور میں نے تم کو کیا حکم دیا تھا؟" عرض کیا "بیشک حضور کے حکم کے خلاف ہوا مگر میں خدا سے ڈری اور آپ

ایک ایسے بچے کے خون کے مواخذے سے بچالیا جو بالکل بے گناہ
معصوم تھا۔

اس جواب پر بایزید خاں نے سر جھکالیا۔ بڑی دیر تک سوچتا رہا پھر
اٹھا کے بولا۔ خیر خدا نے جو قسمت میں لکھدیا ہے ہوگا۔ تقدیر سے کوئی مفر
" اور حکم دیا کہ" اب اس لڑکے کی جان لینے کا قصد نہ کیا جائے۔ اور شاہانہ
سے اُس کی تعلیم و تربیت ہو۔"

پھر اُس کے بعد سلیم نے ایسی تربیت پائی کہ تمام شاہزادوں سے زیادہ
حاصل کی یہاں تک کہ بایزید خاں مرض نقرس میں مبتلا ہو کے نقل و حرکت
قابل نہ رہا۔ تو وزرائے دولت نے یہ دیکھ کر کہ سلطنت کو ایک مستعد اور
ست فرماں روا کی ضرورت ہے۔ خود بایزید خاں کو مشورہ دیا کہ آپ اب
عزلت میں بیٹھ کر خدا کو یاد کریں اور شاہزادہ سلیم کو اپنی زندگی ہی میں
عثمانی پر بٹھادیں۔ اُس نے خوشی سے اس رائے پر عمل کیا۔ سلیم کو مالک
و دیہیم بنا کے شہر اڈریانوپل میں عزلت گزیں ہوگیا۔ اور اسی سال ۹۱۸ھ
سفر آخرت کیا۔ اور نجومیوں کی اس پیشین گوئی کی قطعاً تکذیب ہوگئی کہ
بیٹے سے ہلاک ہوگا۔

اگست ۱۹۱۹ء

## لودی سلاطین کے عہد کے بعض دیندار اُمرا

دولت مغلیہ کے اوج و عروج نے اُس سے پیشتر کے امرا و سلاطین کے
ت پر بہت کچھ پردہ ڈالا۔ مگر پھر بھی اُن کے عہد میں اکثر ایسے فرشتہ سیرت
لفس لوگ تھے جن کا نام ہمیں ادب سے لینا چاہیئے۔ اور آج کل
خود فراموش دولتمندوں کو دکھانا چاہیئے کہ ہندوستان ہی میں
دنوں ہماری قوم کیسے کیسے نیک سیرت و ہمہ تن خیر بزرگوں کو پیش
کی ہے۔

سلطان سکندر لودی کے اُمرا میں ایک بزرگ تھے مسعود علی حسین خاں
خان جہاں لودی کے لقب سے ممتاز و مشہور تھے۔ اُن کا معمول تھا کہ

جو شخص اُن کی سرکار میں نوکر ہو گیا پھر کبھی برطرف نہ کیا جاتا۔ اسی طرح جس کسی کے نام کوئی وظیفہ جاری ہوتا موقوف نہ ہوتا۔

لوگوں کے حال پر اس قدر مہربان تھے کہ جب تک اپنے گھر میں رہتے کسی کو حاضری اور سلام کے لئے آنے کی زحمت دینا پسند نہ کرتے۔ فقط یہ تاکید تھی کہ جب وہ پڑاؤ میں ہوں یعنی کسی مہم پر جا رہے ہوں سب حاضر ہو جائیں۔ گھر پر کبھی کوئی آ بھی جاتا تو اُسے منع کر دیتے کہ یہاں آنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اپنے گھر میں بیٹھو۔ جب ضرورت ہوگی تو بلوا لوں گا۔ کیا تمہیں بال بچوں کی محبت نہیں ہے جو انھیں چھوڑ کے میرے پاس آئے ہو؟"

وابستگان دامن اور ملازمین فوج میں سے جو مر جاتا ہے۔ اس کی ماہوار اُس کے بیٹے پر منتقل ہو جاتی۔ بیٹا نہ ہوتا تو داماد۔ بھائی۔ بھتیجے یا اُس کی بہن کے بیٹے کو دی جاتی۔ ایسا کوئی شخص بھی نہ ملتا تو اُس کی بیوہ کو حکم ہوتا کہ اپنے کسی بھائی بھتیجے کو پیش کرے۔ ایسا بھی کوئی نہ ہوتا تو بیوہ کو حکم ہوتا کہ اپنے دور کے عزیزوں میں سے کسی کو تبنیٰ کرے۔ یہ بھی نہ ہوتا تو حکم ہوتا کہ جس شریف خاندان کے لڑکے کو چاہو گود بٹھا لو۔ یہ بھی نہیں تو اُس کو ہدایت کی جاتی کہ وہ اپنے کسی اچھے زرخرید غلام کو لے پالک بنا لے۔ لیکن اس صورت میں شرط لگا دی جاتی کہ اس کو مدرسہ میں تعلیم دلائے۔ اور تیر اندازی شمشیر زنی اور شہسواری کے فن سکھائے بہرحال اُس کے شوہر کی ماہوار کسی حال میں اُن کے گھر سے نہ جاتی۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اُن دنوں شرفا کے بچوں کو علم کے ساتھ فنون مذکورۂ بالا کی ضرور تعلیم دی جاتی۔ فقط غلام اس سے محروم رہتے۔ لیکن اگر کسی غلام کو کوئی شریف عورت گود بٹھا لیتی تو اُس کے لئے بھی بہ حکم سلطنت علوم و فنون سپہگری کی تعلیم لازم ہو جاتی۔

خانِ جہان سے ملنے کو جو عالم و فاضل یا مقتدائے دین آتا وہ بغیر اس کے کہ جاگیر میں کوئی مقطع یا موضع پائے واپس نہ جاتا۔ یہ اسی کی برکت ہے کہ آج تک اکثر گاؤں میں قاضیوں۔ مفتیوں۔ محتسبوں اور مشائخ کے گھرانوں میں زمینداریاں موجود ہیں۔ اس کے علاوہ رئیس موصوف کی وضع میں داخل تھا کہ اپنے پڑوسیوں

کی خبر لیتے اور کفالت کرتے رہتے۔ اور جہاں کی مسجد کی نسبت سنتے کہ بے مرمت ہے اُس کی مرمت کراتے۔ اور جہاں مسجد کی ضرورت نظر آتی نئی مسجد تعمیر کرا دیتے۔

ایک حریص مولوی صاحب کی حرص و ہوس اور خاں جہاں کی فیاضی کا عجیب قصہ کتب تاریخ میں درج ہے۔ اس واقعہ کو پڑھ کر آجکل کے لوگ اس رئیس کی دریا دلی کو اصراف حماقت اور بیوقوف بننا کہیں گے۔ مگر انھیں یاد رکھنا چاہیئے کہ فیاض آدمی کو جوش سخاوت میں اس کا خیال نہیں رہتا کہ اُس کی نسبت کوئی کیا کہیگا۔ اُس کی کوشش یہی رہتی ہے۔ کہ حریص چاہے کتنا ہی بڑا لالچی ہو۔ اُس کی ہوس پوری کر دے۔

محولہ بالا واقعہ یہ ہے کہ اُس زمانے میں ایک دیندار اور صاحب علم بزرگ تھے "بندگی میاں لاڈن دانشمند"۔ ایک صبح کو تڑکے پو پھٹتے ہی وہ پالکی میں سوار ہو کے خانِ جہاں کے گھر پر پہونچے۔ خان صاحب نے پوچھا "مولانا اس قدر تڑکے کیوں تکلیف فرمائی!" کہا "اس وقت جی چاہا کہ کھچڑی کھاؤں۔ مگر اُس کا فوراً پک جانا دشوار تھا۔ دل میں آئی کہ کسی ایسے رئیس کے یہاں چلوں جس کے باورچی خانے میں کھچڑی پکی پکائی تیار ملے ساتھ ہی آپ کا خیال آیا اور سوار ہو کے حاضر ہو گیا"۔ خانِ جہان نے کہا "مجھے ندامت ہے کہ میں کھچڑی نہیں کھاتا۔ نہ وہ میرے یہاں روز پکا کرتی ہے۔ اور جس چیز کو فرمائیے حاضر کی جائے۔ اور اگر کھچڑی ہی کا جی چاہتا ہو تو وُہ بھی دم بھر میں تیار ہو سکتی ہے"۔ مولانا دانشمند نے فرمایا "مگر خرابی تو یہ ہے کہ مجھے اس وقت بھوک لگی ہے"۔ کہا "میں کھچڑی کا حکم دیئے دیتا ہوں اور آدمی کو بھیجتا ہوں کہ کچھ مٹھائی لا کے پیش کرے اُس کو آپ تناول فرمانا شروع کریں۔ گھڑی بھر میں کھچڑی بھی آجائے گی"۔ یہ سُن کر بندگی میاں بولے "بہت خوب۔ مگر جو آدمی مٹھائی لینے کو جائے اُسے روپیہ دے کے حکم دیجئے کہ میرے پاس آئے تاکہ میں اُسے بتا دوں کون کون چیزیں لائے"۔ اُن کی خواہش کے مطابق آدمی روپیہ لے کر آیا اُس سے روپیہ لے کے بندگی میاں نے اپنے ٹینٹ میں کیا۔ اور اُس سے کہا "جا کے جلدی

کھچڑی پکواؤ۔"

تھوڑی دیر میں کھچڑی سامنے لا کے رکھی گئی۔ اور جتنی آئی تھی سب کو میاں دانشمند بندگی چٹ کر گئے۔ اُس کے بعد پیٹ پر ہاتھ پھیر کے کہا "آج بہت کھا گیا اب گھر کیسے جاؤں گا! پالکی میں تو ایسے دھچکے پہونچیں گے کہ خیریت سے گھر تک پہونچنا دشوار ہوگا۔" خان جہاں نے کہا "تو گھوڑے پر تشریف لے جایئے۔" کہا "میرا گھوڑا ایسا اُچھلتا کودتا ہے کہ اُس سے تو اور بھی پیٹ کا پانی ہل جائے گا۔" فیاض رئیس نے کہا "تو میں آپ کو اپنے اصطبل سے ایسا اچھا گھوڑا دوں گا جو نہایت ہی سبک جاتا ہے۔" کہا "ایسا گھوڑا ہو تو پھر کیا کہنا ہے!" خان جہاں نے اپنے ایک گھوڑے کو منگوایا جو قدم جانے میں بے نظیر تھا۔ وہ اصطبل سے کھول کے سامنے کھڑا کر دیا گیا۔ تو اُس کو دیکھ کر حریص مولنا بولے۔ "میں زندگی بھر کبھی گھوڑے کی ننگی پیٹ پر نہیں بیٹھا" خان جہاں نے مسکرا کر ایک نفیس زین منگوا کے کسوا دی اور کہا "اب تو ننگی پیٹ نہیں ہے۔" مولنا بولے "ہاں اب میں سوار ہونگا۔ مگر یہ تو ارشاد فرمایئے کہ اس گھوڑے کو اپنے گھر میں بندھوا دوں یا واپس بھیجنا ہوگا!" جواب ملا "نہیں اس کو آپ اپنے پاس ہی رکھیں۔" اب بندگی میاں نے کہا "مگر میرے یہاں تو کوئی ایسا آدمی بھی نہیں ہے کہ اس گھوڑے کی داشت کرے۔" سیر چشم رئیس نے حکم دیا کہ اس گھوڑے کے لئے ایک سائیس بھی اُن کی سرکار سے مقرر کر دیا جائے۔" یہ سُن کے مولنا نے پوچھا۔ "بھلا یہ کھاتا کیا ہے!" کہا گیا "بیسن گڑ اور گھی۔" بولے "تو میں غریب آدمی یہ چیزیں بھلا کہاں سے لاؤنگا!" خان جہاں نے اُس کا راتب بھی اپنے ذمہ لے لیا۔

بندگی میاں جو آج قسم کھا کے آئے تھے کہ خان جہاں کی فیاضی کا پورا پورا امتحان لیں گے۔ اب فرمانے لگے "اور یہ زین اور ساز و یراق پرانا ہو جائے گا تو میں کیا کروں گا!" کہا گیا "جب پرانا ہو تو میرے یہاں سے اور منگوا لیجئے گا۔" اس بارے میں بھی اطمینان بخش جواب پا کر مولنا بولے "مجھے تو اس میں دشواری نظر آتی ہے۔ سائیس چارے کی تلاش میں کہاں مارا مارا پھرے گا۔

آپ اتنی مہربانی فرمائیں کہ تمام مصارف جو آپ نے اپنے ذمے لئے ہیں۔ ان سب کو مجھی کمبخت کے سر مارئیے۔ اور مجھے ایک موضع دے دیجئے کہ اُس کی آمدنی سے یہ تمام مصارف بھی نکل آئیں اور گنجائش بھی اُس میں سے مل جایا کرے۔" خان جہاں نے کمال حوصلہ مندی سے مولنٰنا کی یہ درخواست بھی منظور کرلی بدایوں کی اطراف میں اُن کو ایک گاؤں مرحمت ہوگیا۔ اور مولنٰنا کھچڑی کے بہانے ایک اچھے خاصے زمیندار بن کے خان جہاں کے قصر سے اُٹھے۔

چلتے چلاتے اُنھوں نے ایک اور فرمائش بھی کردی کہا "واقعی آپ بڑے فیاض رئیس ہیں۔ میں نے گھڑی بھر میں پیٹ بھرا۔ بہترین گھوڑا پایا۔ اور زمیندار بن گیا۔ مگر یہ کہار جو مجھے اُٹھا کے یہاں تک لائے ہیں دل میں کیا کہتے ہونگے۔ گالیاں دیں گے کہ اپنا پیٹ بھرلیا۔ اپنی سب ہوسیں پوری کرلیں۔ اور ہم جو ایسے رئیس کے دولت کدے پر اُٹھا کے لے گئے تھے۔ یونہیں فاقے کرتے رہے۔" خان جہاں نے کہاروں کو بھی انعام دلوا دیا تب مولنٰنا رخصت ہو کے اپنے گھر آئے۔

خان جہاں کے دست و بازو دو شخص تھے ایک میاں زین الدین اور دوسرے میاں ظہیر الدین۔ اس فیاض رئیس کا سارا لشکر اور اُس کے علاقے کے تمام مواضع زین الدین کے تصرف میں تھے اور انھیں کے اشارے سے شہنشاہ ہند سلطان سکندر لودی نے اس مضمون کا ایک فرمان صادر کردیا کہ "جو حقوق خان جہاں لودی کے علاقہ میں میاں زین الدین کو حاصل ہیں وہ خود شہنشاہ کشور ہند نے خاص اپنی مرضی مبارک سے اور اپنی جانب سے عطا فرمائے ہیں۔ نہ اس بنا پر کہ وہ خان جہاں کے واسطہ داروں میں ہیں۔" اس فرمان کے جاری ہوتے ہی خان جہاں کی ساری فوج اور اُن کا کل علاقہ بلا واسطہ میاں زین الدین کے قبضے میں تھا۔

یہ میاں زین الدین عجیب خصائل و صفات کے بزرگ تھے۔ ان

عبادات و وظائف اُن کی فیاضی و نیک نفسی اور اُن کی زندگی کے تمام حالات ایسے ہیں۔ کہ اُن کو ہر شخص ایک خدا رسیدہ ولی اللہ کہنے میں تامل نہ کریگا اور کیا عجب کہ جن نامور ولی اللہ زین الدین کا نام اعمال و وظائف میں سُنا جاتا ہے یہی ستودہ صفات بزرگ ہوں۔ لہذا اُن کے حالات کو بھی ہم اسی سلسلہ میں بیان کئے دیتے ہیں۔

میاں زین الدین کے واقعات دیکھ کر آج کل کے لوگوں کو سخت تعجب ہوگا کہ وہ زہد و تقویٰ آجکل کے اولیا اللہ میں بھی کم نظر آسکتا ہے جو اُن دنوں رؤسائے عالی تبار میں موجود تھا۔

وہ نہایت تڑکے اُٹھتے۔ غسل کرتے۔ اور طلوع آفتاب سے پہلے اپنے بہت سے وظائف سے فارغ ہو جاتے۔ طلوع کے بعد بھی معمول تھا کہ روز بلا ناغہ قرآن مجید کے دس پارے پڑھتے۔ اور اُن کو ادب و تعظیم کے لحاظ سے کھڑے کھڑے پڑھتے۔ بعد ازاں سہ پہر کو سات پاروں کی اُسی طرح کھڑے ہو کے تلاوت کرتے۔

مفروضہ نمازوں کے علاوہ اُن کے وظائف یہ تھے۔ وہ تمام وظائف جو حضرت غوث الثقلین کی جانب منسوب ہیں۔ ساری حصن حصین جس میں حضور سرورِ عالم کی تمام ماثور دعائیں جمع ہیں اور ایک اچھی ضخامت کی کتاب ہے اس کو بھی اوّل سے آخر تک روز پڑھ جاتے۔ جو نفل رکعتیں مختلف اوقات میں مروی ہیں وہ بھی اُن سے نہ چھوٹتیں۔ چنانچہ مشہور تھا کہ ہر روز پانچ سو نفل کی رکعتیں پڑھتے۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ آدھی رات سے دو پہر تک بجز چند گھڑیوں کے جب کہ تہجد کے بعد لیٹ رہتے تھے۔ اُن کا سارا وقت عبادت الٰہی اور وظائف میں صرف ہوتا۔ اس سارے زمانے میں وُہ بات نہیں کرتے تھے۔ اور اگر کوئی ضروری بات کہنا بھی ہوتی تو اشاروں سے کہتے زبان نہ ہلاتے۔

دسترخوان پر اُن کے ساتھ ہمیشہ علما و فضلا اور زہاد و اتقیا شریک ہوا کرتے۔ جب کہ اکثر علمی مسائل چھڑتے اور فقہی امور پر گفتگو ہوا کرتی۔ کھانے

کے بعد تھوڑی دیر آرام لیتے اور تیسرے پہر کو عموماً دنیوی معاملات کیطرف توجہ کرتے۔ خانگی امور
اور وہ تمام معاملات جنکا تصفیہ بغیر انکی منظوری کے نہ ہو سکتا وہ بھی اسوقت پیش ہوتے
یہانتک کہ مغرب کا وقت آجاتا اور نماز میں مصروف ہو جاتے۔ بعد نماز دوسرے
وظائف میں مشغول ہوتے۔ نوافل پڑھتے جن کا سلسلہ ساڑھے چار گھڑی
رات گئے تک جاری رہتا۔ پھر تھوڑی دیر تک دوستوں سے صحبت رہتی۔
دسترخوان بچھتا اور اُس وقت کی غذا میں دودھ میں اُبالے ہوئے چاول اور
میوہ جات ہوتے اور کھانے کے بعد سونے کے کمرے میں چلے جاتے۔

اُن کے تمام ملازمین اور وابستگان مرد ہوں یا عورتیں سب سختی سے
پابند صوم و صلوٰۃ تھے۔ کسی کی نماز نہ قضا ہوتی۔ کسی نئے لونڈی یا غلام
کو خریدتے تو پہلا یہ کام ہوتا کہ اس کو کسی اُستاد کے سپرد کر دیتے تاکہ اُسے
نماز روزے اور احکام شرع کی تعلیم دے۔ جب تک ان باتوں میں وہ
مکمل نہ ہو جاتا زمرۂ ملازمین میں ہرگز شامل نہ ہو سکتا۔

شب جمعہ کو انھیں عبادت و تلاوت کا خاص اہتمام ہوتا۔ اُس دن
مغرب کے بعد چاہے کیسی ہی شدید ضرورت ہو کہیں نہ جاتے۔ ایک بار اسی
وقت جمعہ کے دن سلطان کے پاس سے آگے پیچھے تین ہرکارے طلب میں آئے
کہ "یاد ہوئی ہے چلیے" مگر وہ اپنے مشاغل کو چھوڑ کر نہ گئے۔ درباروں میں اکثر
لوگ ایک دوسرے کے دشمن تو ہوتے ہی ہیں۔ بعض نے تعریضاً کہا "کہ تین
ہرکارے جا چکے ہیں۔ مگر میاں زین الدین نہیں آئے" سلطان نے کہا "اُفوہ!
مجھے خود نہیں یاد رہا۔ آج شب جمعہ ہے۔ آج وہ کہیں نہیں جا سکتے۔ خیر
نماز کے بعد یا جب انھیں فرصت ہوگی بلوا لیے جائیں گے"

وہ ہر جمعہ و جمعرات کو روزہ رکھتے۔ چاہے کوئی موسم ہو۔ اور کیسی
ہی شدید گرمیاں ہوں۔ اُن کے یہ ہفتے کے دو روزے قضا نہ ہوتے
اسی طرح جمعہ کی نماز بھی کبھی ناغہ نہ ہوتی۔ اُن کے پڑاؤ
سے دس کوس پر بھی جمعہ ہوتا۔ تو سب کام چھوڑ کے وہاں
ضرور جاتے۔

باورچی خانہ بھی بہت وسیع تھا۔ عام لوگوں کو چاہے ملازم ہوں چاہے غیر اور اجنبی اُن کے وہاں سے دن میں تین بار کھانا ملا کرتا۔ ماہ مبارک رمضان میں افطار اور سحر کے وقت اس کثرت سے کھیر تیار رہتی کہ جو مانگتا اُسے دی جاتی۔ سحر کے وقت ہر خواستگار کو کھانا بھی مل جاتا۔

میاں زین الدین کا ایک یہ معمول بھی تھا۔ کہ سال میں ایک بار اپنے تمام عزیزوں کو مرد ہوں یا عورت دہلی و آگرہ سے بلواتے اور رخصت کرتے وقت ہر ایک سے دریافت کرتے کہ اُسے کسی چیز کی ضرورت یا خواہش ہے۔ اور جو چیز وہ مانگتا اُس کو مرحمت ہوتی۔ یہ عام طریقہ تھا کہ شادیوں میں وہ بڑی فیاضی سے کفالت کرتے۔ اُن کے کسی عزیز دوست ملنے والے کے لڑکے یا لڑکی کی شادی ہوتی تو شادی کے کل مصارف وہ اپنے پاس سے ادا کرتے۔ دولہا کو مہر کی رقم اور دیگر مصارف دولھن کے لئے جوڑے چھپر کھٹ مع اُس کے لوازم کے اور جہیز کا سامان عطا ہوتا۔ اگر شریف اور اچھی حیثیت والوں کی لڑکی ہوتی تو اُس کو اور چیزوں کے ساتھ پالکی بھی ملتی۔ خلاصہ یہ کہ جو کچھ سامان کسی باپ کو اپنے لڑکے یا لڑکی کے بیاہنے کے لئے فراہم کرنا ہوتا وہ سب اُن کی فیاض و دریادل سرکار سے مل جاتا جن لوگوں کو اُن کی سرکار سے تعلق تھا اُن کے وہاں کوئی مہمان آجاتا تو اُس کیلئے بھی حکم تھا کہ انھیں کے باورچی خانے سے کھانا جائے۔ اس موقع پر تمام کھانوں کا جوڑ یعنی پورا توڑا جاتا جو اتنی مقدار میں ہوتا کہ وہ خود اور اُن کے ملازمین سیر ہو کر کھالیں۔

وفات سرور حضرت رسول خدا صلعم کے زمانے میں بارہ دن تک ہر روز دو ہزار تنگہ کی قیمت کا کھانا تیار ہو کر تقسیم کیا جاتا۔ اس مدت کے اول اور آخر روز میں تمام قسموں کے لذیذ کھانے اچھے بو باس کے پلاؤ اور سالن روٹیاں اور حلوے بکثرت پکتے۔ اور تقسیم ہوتے جن پر فی یوم چار چار ہزار تنگہ کی رقم صرف ہو جاتی۔ اور یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے۔ کہ اُس زمانے کا تنگہ زمانہ مابعد کے تنگے کی قیمت سے بہت زیادہ تھا۔

مگر یہ سب عروج و اقبال اُس وقت تک رہا جب تک سلطان سکندر
دھی زندہ تھا۔ اُس کی وفات کیساتھ ہی میاں زین الدین کی حکومت و ثروت کا
ی خاتمہ ہوگیا۔ اس لئے کہ اب وہ معزول ہو گئے تھے۔ اور اپنے عروج کے زمانے میں
نھوں نے کوئی ایسی دولت نہیں جمع کر رکھی تھی کہ اُس پر بسر کرتے۔ مگر اُن کی فیاضی
ن کے اخلاق۔ اور اُن کی کریم النفسی نے ایسا اچھا اثر ڈال دیا تھا کہ اس مفلسی کے
مانے میں بھی لوگ چاہے کچھ ملے یا نہ ملے اُن کا دامن چھوڑ کر جانا نہیں پسند
رتے تھے۔ آخر چند روز میں مجبور ہو ہو کے لوگ اُن کی رفاقت چھوڑنے لگے
گر ان کی عالی حوصلگی اب بھی حیرت انگیز تھی۔
تاریخ "واقعات مشتاقی" کے مصنف شیخ رزق اللہ مشتاقی المتوفی ۹۸۹ھ
جنھوں نے یہ سب حالات ہمیں بتائے ہیں کہتے ہیں کہ میرے والد شیخ سعداللہ کو
بھی میاں زین الدین ہی کی سرکار سے تعلق تھا۔ اور بچپن سے لے آخر تک انھیں
ی خدمت میں رہے۔ اُن کی معزولی و تنگ دستی کے زمانے میں ایک دن اچانک
جا پڑے تو کیا دیکھتے ہیں کہ شیخ زین الدین کے سامنے بہت سے کاغذات
رکھے ہیں۔ جن کو وہ پھاڑ پھاڑ کے ڈالتے جاتے ہیں۔ جب سب کو چاک کر چکے
و خادم کو بلا کے حکم دیا کہ ایک کونڈے میں پانی بھر کے لاؤ۔ اور ان پھٹے ہوئے
کاغذوں کو اس طرح دھو ڈالو کہ ان میں کچھ لکھا ہوا نہ باقی رہے۔ نوکر اُن کو مل
مل کے دھونے لگا۔ اور شیخ سعداللہ نے پوچھا "یہ کون سے کاغذ ہیں۔ جن کے تلف
کرنے میں حضور کو اس قدر اہتمام ہے؟" کہا "جی اب اس کا ذکر کیا کروں۔ اپنے
عروج کے زمانے میں بہت سے شرفا و امرائے دولت کو میں نے وقتاً فوقتاً روپیہ
قرض کے نام سے دیا تھا جس کی مجموعی مقدار دو تین لاکھ تنگہ سے زیادہ ہی ہوگی
میں نے تو یہ ارادہ کر کے دیا تھا کہ ان کو پھر واپس نہ لوں گا مگر اُن لوگوں نے گھر
جا کے دستاویزیں لکھ کے اور مکمل کر کے بھیج دیں۔ یہ وہی دستاویزیں ہیں۔ ان
کو دیکھ کر خیال آیا کہ اب آج کل میں تنگدست ہو رہا ہوں اور بسر اوقات بھی
مشکل ہے۔ ایسا نہ ہو کہ اس مفلسی میں میرے دل میں یہ خیال پیدا ہو۔ کہ
ان دستاویزوں کی بنا پر اُس دو تین لاکھ رقم واپس لینے کا ارادہ کروں۔ اور

یہ بھی نہ ہو تو اندیشہ ہے کہ میرے بعد میری اولاد اُن کی بنا پر اس رقم کی واپسی کا دعوے کرے۔ انھیں اندیشوں کے دور کرنے کے لئے میں نے ان دستاویزوں کو تلف کر دیا۔ تاکہ کبھی میرے یا میری اولاد کے دل میں ایسا ناپاک خیال نہ پیدا ہو۔"

ان کی اِس دریادلی و نیک نفسی نے ایسے ہی خیالات اُن کے دوستوں اور ملازمین کے بھی کر دیے تھے۔ چنانچہ یہی شیخ سعد اللہ جن سے مذکورۂ بالا واقعہ مروی ہے اُن کا حال یہ ہے۔ کہ وہ ایک بڑا وسیع خاندان رکھتے تھے۔ جس کا بار انھیں کے سر تھا۔ جب اُن کے آقا میاں زین الدین کی جاہ و ثروت کا خاتمہ ہوا تو انھوں نے کمال شریف النفسی سے اپنے آقا کا ساتھ نہ چھوڑا جب بیکاری کو تین سال ہو گئے۔ تو کسی نے اُن سے کہا، "اب یہاں کیا رکھا ہے جو آپ خواہ مخواہ پڑے ہوئے ہیں۔ آپ سے بڑے بڑے چلے گئے مگر آپ کسی طرح میاں زین الدین کا دروازہ نہیں چھوڑتے۔" کہا، "یہ خدا کی مہربانی تھی کہ میں یہاں مقرر ہو گیا۔ دنیا کا بے شک یہ قاعدہ ہے کہ جب لوگوں کو تنخواہ نہیں ملتی تو وہ کام بھی چھوڑ دیتے ہیں مگر مجھ سے ایسی ناشکری نہیں ہو سکتی میری ضرورتیں اور خواہشیں محدود ہیں۔ میں نے ملازمت کے زمانے میں اتنا پیدا کر لیا تھا کہ میری اور میرے آقا میاں زین الدین کی مع دونوں کے خاندانوں کے تلخی و ترشی سے بسر ہو سکتی ہے۔ میرے احباب جانتے ہیں کہ میرے پاس جو کچھ ہے میرا نہیں ہے انھیں کا ہے جب نقد روپیہ نہ رہیگا اپنے مکانوں کو بیچوں گا اپنی کتابوں کو فروخت کروں گا۔ یہ نہ ہوگا کہ میرے آقا کو تکلیف ہو۔ چنانچہ بغیر کسی تنخواہ کے وہ تین سال تک اپنے آقا کے قدموں سے وابستہ رہے۔ اور اُن کی وفات کے بعد چار سال تک اُنکی اولاد کی رفاقت کی۔ یہانتک کہ پورے پچپن سال تک اسی خاندان کی خدمت میں رہ کے انتقال فرمایا۔

ایسا ہی شریف النفس اُن کا ایک ملازم ایک مغل تھا جس کا نام مرزا ماموں تھا وہ کسی اور کی نوکری چھوڑ کے میاں زین الدین کا ملازم ہوا تھا جب سلطان سکندر لودی کی وفات کے بعد اُن کا زمانہ ختم ہوا تو اُس

نے بھی جوش وفاداری میں اُن کا ساتھ نہ چھوڑا۔ اور اس قدر بے طمع اور صابر و قانع تھا کہ ایسے لوگ مشکل سے مل سکتے ہیں۔

ایک دن اُس کا بیٹا ایک مادیان گھوڑی کو پانی پلانے کیلئے دریا لیے جاتا تھا۔ کہ اُس کی ریتی میں کوئی سخت چیز پاؤں کے نیچے آئی۔ اُٹھا کے دیکھا تو ہمیانی تھی جس میں کچھ اشرفیاں تھیں۔ اُس نے فوراً ہمیانی لا کے باپ کے سامنے پیش کی۔ مرزا ماموں نے بیٹے اور ہمیانی دونوں کو اپنے آقا کے سامنے پیش کر دیا اور میاں زین الدین نے وہ ہمیانی لے کر محکمۂ وزارت بھیج دی کہ یہ رقم جس کی ہو اُس کے پاس پہونچا دی جائے۔

اُن دنوں معمول تھا کہ جو شخص کسی گری پڑی چیز کو پاتا فوراً اُس کو پولیس میں لا کے حاضر کر دیتا۔ پولیس والے اس کو شہر کے پھاٹک میں لٹکا دیتے کہ جس کسی کی ہو ثبوت دے کے لے جائے۔ چنانچہ یہ ہمیانی بھی لٹکا دی گئی اتفاقاً جگراج نام ایک ہندو پھاٹک میں سے گزرا۔ ہمیانی کو دیکھ کر کہا "یہ میری ہے"۔ پوچھا گیا "تمہاری ہے تو بتاؤ اس میں کتنے تولے سونا ہے۔ اس نے پندرہ تولہ سونا بتایا تولا گیا تو اُتنا ہی سونا نکلا۔ فوراً ہمیانی مع رقم کے اُس کے حوالے کر دی گئی۔ اب اُس نے کہا "یہ ہمیانی جس شخص نے پائی ہے۔ میں دو سو تنکہ اُس کو انعام میں دوں گا۔ لوگوں نے مرزا ماموں کو خبر کی۔ انہوں نے لینے سے قطعی انکار کیا۔ دوستوں نے کہا "کیا حماقت کرتے ہو۔ ایک شخص بہ خوشی خاطر دیتا ہے۔ تو اس کے لینے میں تمہیں کیا عذر ہے؟" کہا "میں اپنے کسی نیک کام کا معاوضہ سوا خدا کے اور کسی سے نہ لوں گا"۔

یہ تو میاں زین الدین کے نیک اور اُن کے نقش قدم پر چلنے والے ملازموں کا حال تھا خود اُن کی دینداری کی بہت سی باتیں ابھی باقی ہیں۔ ہر دوشنبہ کو وہ درود شریف کا ختم کرتے جس میں دو لاکھ بار درود شریف پڑھا جاتا۔ اور اُس کے بعد چار سو تنکہ قیمت کا خشکا حضور سرور عالم کی فاتحہ کے طریق پر تقسیم ہوتا۔ اسی طرح ہر جمعرات سورۂ اخلاص کا ختم

ہوتا جس میں مذکورہ سورۃ ایک لاکھ بار پڑھی جاتی۔ اور اتنا ہی خشکاش
روز بھی نبٹتا جس کا حضرت غوث الثقلین کو روح پر فتوح کی ایصال
ثواب کیا جاتا۔ یہ دونوں ختم ہفتہ میں دو بار نہایت پابندی سے ہوتے۔

بہرحال وہ کیا اچھا اور مبارک زمانہ تھا کہ بادشاہ ایسا نیک نفس
پاک طینت تھا اور اُس کے امرائے دربار ایسے لائق دین دار اور فرشتہ
خصلت تھے۔

اسی سلسلہ میں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہم میاں زین الدین کے بھائی
میاں ظہیر الدین کے مختصر حالات بھی بیان کر دیں۔ وہ بھی بڑے متقی و پرہیزگار
اور صاحب علم و فضل بزرگ تھے۔ اُن کا معمول تھا کہ سال میں آٹھ مہینے دلی
میں رہتے اور چار مہینے آگرے میں۔ زمانہ قیام دہلی میں اُن کے معمولات یہ تھے
کہ ہر دوشنبہ کو حوض شمسی پر ایک دعوت کیا کرتے۔ جس میں بڑے بڑے قابل و
فاضل علما زہاد و اتقیا صوفی و اہل دل۔ شعرا و ادیب اور قوال مع سازندوں
کے جمع ہوا کرتے۔ حال و قوالی کی صحبت ہوتی۔ اور دینی و علمی مسائل پر بحثیں
ہوا کرتیں۔ دوسری دعوت ہر چہارشنبہ کو ہوا کرتی۔ یہ جمنا کنارے حضرت
سلطان المشائخ کی درگاہ میں ہوا کرتی تھی۔ تیسری دعوت ہر جمعرات
کو قدم رسول میں ہوا کرتی۔ جو قصر فیروز آباد کی عمارتوں کے سلسلہ میں تھا
اور ان تینوں دعوتوں میں شہر کے تمام اتقیا و ابرار شریک ہوا کرتے۔ ہر جمعہ
کو وہ شہر دلی کی جامع مسجد میں شریک جماعت جمعہ ہوتے تھے

گزشتہ تین دعوتوں کے علاوہ ایک دعوت وہ موچہ نام ایک گاؤں
میں کیا کرتے جو دلی کے باہر ایک پُر فضا میدان اور مقررہ شکارگاہ میں
واقع تھا۔ وہاں انھوں نے ایک قصر تعمیر کرایا تھا۔ یہاں اُس صحبت
حال و قال کے علاوہ وہ شکار میں بھی مصروف رہا کرتے۔ اُس گاؤں
اور شکارگاہ میں ہمیشہ دو روز تک یہ صحبت قائم رہتی۔ یہاں خیمے نصب
ہو جاتے اور ایک عالیشان پڑاؤ کی صورت پیدا ہو جاتی۔ عالی
رتبہ بیگمیں اور حرمیں بھی یہاں آجاتیں۔ اور میاں ظہیر الدین جوش

دینداری کے ساتھ عیش و عشرت کا بھی لطف اٹھاتے۔ انھوں نے معمول کر لیا تھا کہ جہاں فقط ایک دن کے لئے جاتے وہاں بجز مردوں کے زنانہ نہ جاتا۔ لیکن جہاں ایک روز سے زیادہ قیام کرنا ہوتا وہاں محل کی خاتونیں بھی ہوتیں۔

ان دونوں نجابیوں کے جو حالات بیان کئے گئے اُن پر غور کرتے سے معلوم ہو سکتا ہے کہ اس قسم کے رئیسوں کا اب خاتمہ ہو گیا۔ تیرہویں صدی ہجری کے آخر عہد تک بعض روسا کے طرز عمل سے یہ شان کسی نہ کسی حد تک نمایاں ہو جاتی تھی مگر چودھویں صدی نے ایسے رئیسوں کا خاتمہ کر دیا اور قطعی طور پر کہا جا سکتا ہے کہ اب ہندوستان کو ایسے امرا نہ نصیب ہونگے۔

فی الحال دولت اور روپیہ کی قیمت اس قدر بڑھ گئی ہے کہ اب ہمارے امرا میں سے لائق و ذی ہوش لوگوں کے مذاق میں بجائے روپیہ کو اس طرح پھینکنے کے روپیہ جمع کرنا چاہیے۔ اُن دعوتوں کے عوض اب گارڈن پارٹیاں اور ٹی پارٹیاں ہوتی ہیں۔ اور روز افزوں ترقی کریں گی جن کا کمال خوبی یہ ہوگا کہ چند انگریز آکر شراب پئیں اور اُن کے صدقے میں بعض مسلمان رئیس زادوں کو بھی چھلکتے ہوئے جام مل جایا کریں۔

یہی وجہ ہے کہ مسٹر ایلیٹ نے اپنی تاریخ میں ان حالات کو نقل کر کے اُن بزرگان سلف کو مسرف ہونے اور روپیہ کی قدر نہ کرنے کا الزام دیا ہے۔

TITLE PRINTED AT THE NATIONAL ART PRESS, LAHORE.